उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

رام لعل

زرد پتوں کی بہار

(سفرنامہ پاکستان)

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

www.taemeernews.com

زرد پتّوں کی بہار

سفرنامہ پاکستان

[۸ فروری ۱۹۸۰ء سے ۵ مارچ ۱۹۸۰ء تک]

رام لعل

اُتر پردیش اُردو اکادمی قیصر باغ لکھنؤ

www.taemeernews.com

عزیز الجبار خاں سکریٹری اُتر پردیش اُردو اکادمی نے نشاط پریس، ٹانڈہ، ضلع فیض آباد میں چھپوا کر اکادمی کے دفتر ۲۱. آر ٹنڈن روڈ. قیصر باغ، لکھنؤ سے شایع کی۔

www.taemeernews.com

© اتر پردیش اردو اکادمی

ZARD PATTON KI BAHAR

BY: RAM LALL

PRICE RS. 13/=(HARD BOUND)

11/80(PAPER BACK)

ناشر	:	اتر پردیش اُردو اکادمی، قیصر باغ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱
سنہ اشاعت	:	۱۹۸۲ء
تعداد	:	ایک ہزار ایک سو
قیمت	:	مجلد۔/۱۳ روپے پیپر بیک ۸۰/۱۱ روپے
خوش نویس	:	ڈاکٹر شفیق احمد شفیق
مطبع	:	نشاط پریس ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپی)

—

www.taemeernews.com

ڈاکٹر آغا سہیل

اور

محمد علی صدیقی

کے نام

www.taemeernews.com

اِسی مصنف کی دوسری تصانیف

افسانے ـــــ	آئینے	۱۹۴۸ء	
	انقلاب آنے تک	۱۹۴۹ء	
	وہ مسکرائے گی	۱۹۵۲ء	
	نئی دھرتی پُرانے گیت	۱۹۵۸ء	انعام یافتہ اُتر پردیش سرکار
	گلی گلی	۱۹۶۰ء	〃 〃 〃 〃
	آواز تو پہچانو	۱۹۶۳ء	〃 〃 〃 〃
	کل کی باتیں	۱۹۶۶ء	
	چراغوں کا سفر	۱۹۶۶ء	
	انتظار کے قیدی	۱۹۶۶ء	
	اُکھڑے ہوئے لوگ	۱۹۷۲ء	انعام یافتہ اُتر پردیش اُردو اکادمی
	گزرتے لمحوں کی چاپ	۱۹۷۴ء	〃 〃 〃
	معصوم آنکھوں کا بھرم	۱۹۷۸ء	〃 〃 〃
ناول ـــــ	کُہرا اور مسکراہٹ	۱۹۷۲ء	
	مُٹھی بھر دھوپ	۱۹۷۳ء	
	نیل دھارا	۱۹۸۱ء	انعام یافتہ اُتر پردیش اُردو اکاد
سفرنامہ ـــــ	زرد پتوں کی بہار (پاکستان)	۱۹۸۲ء	
	خواب خواب سفر (یورپ)	۱۹۸۲ء	

www.taemeernews.com

فہرست

8 پیش لفظ — پروفیسر محمود الٰہی

10 نئے ہندوستان کا بڑھا ہوا ہاتھ — ڈاکٹر آغا سہیل

---

21 زرد پتّوں کی بہار

31 آنکھیں نہ ہوں تو حسرتِ دیدار بھی بہت

44 ماضی کا کرب شناخت کا مسئلہ

58 پنجابی عوام ۔ کھلی کتاب

69 ادب، کھلی اور علامت نگاری

82 باشعور نئی نسل ۔ انسانی رشتے

97 گواہ رہنا میں ایک بار لوٹ کر آیا تھا

114 میانوالی ۔ یادیں، خواب اور حقیقت

131 کرلیا حائل زمانہ رابطوں کے درمیاں

150 میں نابینا میں نابینا

167 ایک یادگار پنجابی مشاعرہ

179 میں تو ذہنی خندق سے نکل آیا ہوں

191 کراچی میں آمد

205 آدمی ناقابلِ تقسیم اکائی ہے

220 ذہنی ہجرت ۔ نظریاتی اساس

236 بستی نہ ملی پھر اپنی جیسی

www.taemeernews.com

پیش لفظ

اصناف ادب میں خود نوشت سوانح عمری، سفرنامہ اور خطوط اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ ہر خاص و عام کا دامن دل کھینچ لیتے ہیں اور ان کے مطالعے سے قارئین کے ذوقِ تجسس کو یک گونہ تسکین ملتی ہے۔ ہر چند یہ تینوں صنفیں اپنے عناصرِ ترکیبی کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی عنصر قدرِ مشترک کا درجہ ضرور رکھتا ہے اور اسی قدرِ مشترک کی بنیاد پر کبھی کبھی یہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیوں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں دراصل قاری کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بے حجابانہ فن کار کے دل و دماغ میں اتر جائے۔ اور اس خواہش کی تکمیل میں یہ اصناف بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی فن کار ان اصناف کی وجہ سے ادب میں اعلا مقام حاصل کرے لیکن یہ بہ ہر حال ہیں ثانوی اصناف۔ میرؔ، غالبؔ، شبلیؔ، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریاآبادی، رشید احمد صدیقی، جوشؔ اور احسانؔ دانش وغیرہ بنیادی طور پر شاعر ہیں یا ادیب و نقاد لیکن ان میں سے ہر ایک نے ان ثانوی اصناف میں سے کسی نہ کسی کو اس طرح اپنایا کہ اب اس کا شمار ان کے امتیازات میں ہوتا ہے۔ اگر اسے ایک کلیہ مان لیا جائے تو اس کا اطلاق رام لعل کے سفرنامہ "زرد پتوں کی بہار" پر زیادہ بہتر طور پر ہوتا ہے۔ رام لعل بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور افسانہ نگار بھی اتنے قدآور کہ انھوں نے

www.taemeernews.com

اس صنف کو نئی سمت و رفتار عطا کی اور افسانہ نگاروں کی اس نئی نسل کو حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری سے قریب تر کر دیا جو منزل کی تلاش میں بھٹک رہی تھی اور جسے "برگِ حشیش" کو "شاخِ نبات" بتانے والے حضرات بہکا رہے تھے۔

کوئی دو سال پہلے رام لعل نے ہندوستان سے پاکستان کا سفر کیا تھا "زرد پتوں کی بہار" اسی سفر کی یادگار ہے۔ لوگ اپنے ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتے رہتے ہیں لیکن رام لعل کے اس سفر کو اس طرح کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تو اُن کا وطن سے وطن کو سفر تھا۔ میانوالی (پاکستان) اُن کی جنم بھومی ہے لیکن اُنھوں نے تاریخ کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ جنم بھومی کی یاد کسے نہیں آتی، رام لعل بھی اس یاد کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور یادوں کے سایے میں اُنھوں نے زندگی کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا ـــــ اور جب اُن کی عمر تجربہ کرتے رہنے کے حصار سے نکل کر تجربات کو عبرت و بشارت کا درجہ عطا کرنے کے قلم رو میں داخل ہوئی تو جس انسانی فطرت کو اُنھوں نے اپنے سینے میں لوریاں دے دے کر سُلائے رکھا تھا، وہ بیدار ہو گئی اور اُس نے رام لعل کو ان کی جنم بھومی میں پہنچا کے دم لیا۔ "زرد پتوں کی بہار" رام لعل کا نہیں بلکہ انسانی فطرت و جبلت کا سفرنامہ ہے، یہ ایک فرد کا نہیں، نسل سے نسل کا سفرنامہ ہے۔ رام لعل کے اس سفرنامے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کا دل دھڑک رہا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہی ادبی تخلیق لازوال بھی ہوتی ہے اور آفاقی بھی جس میں انسانیت اپنے اصل خط و خال کے ساتھ نمایاں ہو جائے۔

اُتر پردیش اُردو اکادمی رام لعل کی اس ادبی تخلیق کو فخر کے ساتھ شایع کر رہی ہے۔

اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ
۲۸ اپریل سنہ ۱۹۸۳ء

محمود الٰہی
چیرمین مجلس انتظامیہ

www.taemeernews.com

نئے ہندوستان کا بڑھا ہوا ہاتھ

(ڈاکٹر آغا سہیل)

یادش بہ خیر ۱۹۷۹ء کی گرمی کی ایک خوش گوار شام کو لاہور کے ایک فائیو اسٹارز (FIVE-STARS) ہوٹل کے خوب صورت لاؤنج میں شہر کے دانش وروں کے مجمع میں جب میں نے ایک سفر نامے کی تقریب کے سلسلے میں ساحل و سمندر کا ذکر کیا تو بعض مقتدر و معتبر ادیبوں تک نے ساحل و سمندر کے مصنف کے بارے میں یہ استفسار کیا کہ وہ کون ہے؟ اور جب اسی سال، چند ماہ کے بعد مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا اور ضمناً یہی بات لکھنؤ کے دانش وروں کے ایک مجمع میں میں نے دُہرائی تو ایک قہقہہ پڑا کہ لوگوں کو احتشام حسین کے ساحل و سمندر جیسے اہم سفر نامے کا علم تک نہیں، لیکن حقیقتاً بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی اسی کو کہتے ہیں اور اس میں قصور نہ احتشام حسین اور اُن کے ساحل و سمندر کا ہے اور نہ اہل لاہور کی لاعلمی کا۔ اصل میں ساحل و سمندر عام قاری کے لئے ہے بھی نہیں اور جو گذشتہ چند سالوں سے سفر ناموں نے اُردو میں وبائی بیماری کی سی شکل اختیار کر لی ہے اور ہر دوسرا تیسرا شخص اپنی بغل سے سفر نامے کا ایک موٹا تازہ مسودہ نکال کر ناشر یا پبلشر کے سامنے پھینک دیتا ہے اور ہر سفر نامہ ہاٹ کیک کی طرح بک جاتا ہے۔ بوڑھے بچے جوان سب

www.taemeernews.com

سبھی چٹخارے لے لے کر ان سفرناموں کو پڑھ ڈالتے ہیں تو اس کی بنا پر بعض سفرنامہ نگاروں کو یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ اب وہ واقعی امر ہو گئے ہیں حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے انھوں نے محض وقت کی ضرورت اور لوگوں کی مانگ کو پورا کر دیا ہے۔ اور اس خلا کے پُر کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سفرنامے ادب میں جگہ پا گئے یا زندۂ جاوید ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ ان نام نہاد سفرنامہ نگاروں کو خود بھی اب اپنی ان طفلانہ غلطیوں کا احساس ہو چلا ہے اور وہ صحافیانہ عبوری تقاضوں اور ادبی دوامی اقدار میں تمیز کرنے لگے ہیں۔

سفرنامہ ایک معتبر اور وقیع صنفِ نثر ہے، جس کے لئے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ وسعتِ نظر اور وسیع القلبی کی ضرورت ہے ذہنی افق جس قدر وسیع ہوگا جزئیات تک معروضی رسائی اسی قدر ممکن ہوگی۔ تنگ دل، تنگ نظر، خود پسند اور نرگسی افراد اگر اس صنفِ نثر سے شغل فرمائیں گے تو اُن کی مثال ایک ایسے کریہہ الصوت گویّے کی سی ہو گی جو اپنے غسل خانے میں اپنی آواز کی خوش فعلیوں سے محظوظ ہو ہو کر چنگھاڑتا ہے مگر اُس کے اڑوسی پڑوسی اُسے فاتر العقل ہی سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے سفر کی جس کسی کو سعادت حاصل ہو جائے اُس پر کم از کم دو چار نہیں تو ایک آدھ سفرنامے کا لکھنا تو اخلاقاً فرض ہو ہی جاتا ہے اور اسی زعمِ باطل سے مغلوب ہو کر وہ ایسی ایسی آئیں بائیں شائیں ہانکتا ہے کہ سفرناموں کے نام پر اُس کے باطن کی بیماری غلاظت اور اُس کے نفسِ امّارہ کی تمام کیچڑ صفحات پر منتقل ہو جاتی ہے مگر پھر بھی ان سفرنامہ نگاروں کو روکنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یا تو یہ خود اپنی موت آپ مر

www.taemeernews.com

جائیں گے یا اگر زیادہ غیرت آئے گی تو سچ مچ کا ایک آدھ سفرنامہ تو لگے ہاتھوں لکھ کر دے ہی جائیں گے جس سے بہرحال اُردو ادب کو فائدہ پہنچے گا، رام لعل نے اتفاق سے اسی بھیڑ چال کے زمانے میں یکے بعد دیگرے اُردو ادب کو دو معتبر سفرنامے نذر کئے ہیں جن میں سے ایک یورپ کے ممالک سے متعلق ہے اور دوسرے کا دائرہ اسی برصغیر کے دو ممالک کے مابین قائم ہوا ہے جنھیں ہندوستان اور پاکستان کہا جاتا ہے۔

رام لعل اُردو افسانے کا ایک وقیع نام ہے جو کم و بیش اُردو میں چالیس بیالیس سال سے افسانے لکھ رہا ہے۔ میں رام لعل کی دل آویز شخصیت کو کم و بیش تینتیس سال سے جانتا ہوں وہ وقت کہ جب میں طالب علم تھا، رام لعل لکھ رہا تھا اور کچھ بن رہا تھا۔ وہ آلِ احمد سرور، احتشام حسین، مسعود حسن ادیب، سجاد ظہیر، نیاز فتح پوری، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، اختر علی تلہری، اثر لکھنوی، آنند نرائن ملّا، مجاز لکھنوی، شوکت صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، کی صحبتوں میں ہمارے سامنے آتا جاتا اور اُٹھتا بیٹھتا تھا اور بہ قدر آگہی ہر ایک سے فیض یاب بھی ہوتا تھا، ہم بھی کسی کونے کھترے میں سمٹے سمٹائے اپنے ہم عمروں میں حفظ مراتب کے لحاظ سے دور ہی دور سے ثقات ادب کی محفلوں کے جلوے لوٹتے تھے بحث و مباحثے سنتے اور دل و دماغ میں حسب توفیق مطلوبہ غذائیں سموتے جاتے تھے کہ ان فضاؤں اور ہواؤں میں ادب ہی ادب گھلا ہوا تھا۔ جس طرح برصغیر کے معاشرے میں کبھی فلم اور کبھی کرکٹ کا کریز نوجوانوں میں نظر آنے لگتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے زمانے میں ادب کا کریز تھا، اور ادیبوں اور شاعروں کے سپر اسٹارز کا دور دورہ تھا ہم شاعروں اور دانش وروں کی ہستیوں کو اپنی اس دنیا کی تخلیق کب

www.taemeernews.com

سمجھتے تھے بلکہ کسی سیارے سے آئی ہوئی یا آسمان سے زمین پر اُتری ہوئی مخلوق سمجھتے تھے طرّہ تو یہ ہے کہ اِن بیر اشار زمیں سے بعض نے اپنے رویے سے ہمیں یہی تاثر بھی دے رکھا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ایک رات ہم پر جب یہ کشف ہوا کہ ہمارا قلم خود بہ خود کاغذ پر چل نکلا ہے اور جو کچھ قلم سے نکلا ہے وہ عرفِ عام میں افسانہ ہے اور جب چھپنے ہی چھپنے یہ افسانہ چھپ چھپا گیا تو گویا ہم بھی آسمانوں میں اڑنے لگے اور کچھ ایسے اُڑے کہ زمین پر کسی طور آنے کے لئے تیار ہی نہ تھے کہ کسی نہ کسی طرح کسی ادبی نشست میں ایک آدھ افسانہ بھی سُنا ڈالا، واہ واہ تو بہت کم ہوئی نشتر زنی زیادہ ہوئی تو فوراً زمین پر تشریف لے آئے اور لگے اپنے آس پاس کی مخلوق کو دیکھنے اور سمجھنے بس یہیں کہیں پر افسانہ نگار رام لعل نظر آگیا جو چھپ چھپا بھی رہا تھا اور اپنے افسانے پابندی سے محفلوں میں سنانے بھی آجاتا تھا، عین اسی زمانے میں ہمارے ہم عمروں اور ساتھیوں میں بھی بعض ادبی نام معتبر بننا شروع ہو گئے، شوکت صدیقی، مجید پرویز، منظر سلیم، مسیح الحسن رضیہ سجاد ظہیر تو ہمارے بزرگوں میں تھے اور سچ پوچھیے تو رام لعل بھی اسی صف میں موجود تھا مگر رتن سنگھ، قیصر تمکین، عابد سہیل، اقبال مجید، احمد جمال پاشا، حسن عابد، سبط اختر، شور صہبائی، شارب لکھنوی شارب ردولوی، عثمان غنی، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، باقر مہدی، شوکت عمر، ہمارے ہم عمروں میں تھے کبھی کبھار رام لعل کا دستِ شفقت بھی ہمارے سروں پر ہوتا اور کبھی ہم ایک دوسرے کے گلے میں دوستانہ طور پر باہیں بھی حمائل کر دیتے، یہ رام لعل کی بڑائی ہے کہ وہ اپنے پیڈسٹل سے فوراً اتر کر ہماری سطح پر آجاتا اور ہم سے گھل مل جاتا ہم بے تکلف ایک دوسرے سے اختلاف رائے کرتے اور خوب خوب دھواں دھار مخالفیں کرتے ایسی ایسی انجمن

www.taemeernews.com

بجتا ہوتی کہ باید و شاید مگر انتہائی جمہوری اور باہمی تعظیمی فضا قائم رہتی ہم میں سے ہر ایک کا مزاج مختلف تھا۔ اقبال مجید افسانے کی صنف کا بڑا کٹر مفتی بنا ہوا تھا، جہاں اس کے مفروضہ میکانکی ڈھانچے سے کوئی افسانہ سرمو بھی اِدھر اُدھر کھسکا اور اُس نے کفر کا فتویٰ صادر کیا، باقر مہدی بھی آگ تھے، عابد سہیل پر فلسفے کا پیر تسمہ پا سواری گانٹھے تھا، جمال اپنے مزاحیہ فقروں پر صیقل رکھا کرتا، باقی لوگ نرم اور گرم حسب ضرورت بن جاتے تھے۔ بعض اوقات تو ہم کسی نہ کسی پر باجماعت حملہ آور ہوتے اور اُس کی تحریر کے پرخچے اُڑا دیتے اکثر حسن شہیر یا رام لعل بھی ہماری زد پر آئے اور بحمداللہ کہ ہم نے خوب جی بھر کر تنقیدی حربے آزمائے مگر، اس دراز نفسی کا لب لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ رام لعل نہایت نرمی سے ہم کو طرح دے دے گیا اور کبھی ہماری کسی بات کا مطلقاً بُرا نہیں مانا۔ جب بھی ملا جہاں ملا انتہائی پیار محبت اور شفقت سے پیش آیا۔ رام لعل کی شخصیت کے اسی پہلو نے ہمیں اپنے نقطۂ نظر میں ترمیم کرنے پر مجبور کیا کہ افسانہ نگار رام لعل کچھ بھی سہی، انسان رام لعل بہت شریف آدمی ہے۔

رام لعل کا یہی وہ زمانہ تھا جب وہ متعدد ذہنی آزمائشوں سے بھی گزر رہا تھا اور اس کی شخصیت کی تربیت و تہذیب بھی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر شکست و ریخت کا عمل جاری تھا وہ بے تکان پڑھ رہا تھا، اپنا ادب بھی اور غیر ملکی ادب بھی اور یہ کہ وہ بے تکان لکھ رہا تھا اور چھپ رہا تھا۔ اس بات سے بالکل بے نیاز ہو کر کہ کون کیا کہتا ہے اور کس کا رویّہ معاندانہ ہے کس کا دوستانہ، کون مربیانہ اور مشفقانہ برتاؤ روا رکھا ہے اور کون مخالفانہ یا منافقانہ۔ رام لعل نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ ہر چہ باداباد، اُسے ایک بڑا افسانہ نگار بننا ہے اور تمام جدجہد کو اسی سمت لے کر چلنا ہے خواہ کچھ بھی ہو، اس ریاضت اور مشق میں

www.taemeernews.com

رام لعل کی باطنی شخصیت میں بڑی سخت پیکار رہی، بڑے بڑے ایورسٹ اس کے سامنے نمودار ہوئے لیکن اس باہمت اور حوصلہ مند شخص نے ان چوٹیوں کو سر بھی کیا اور ضرورت پڑی تو کوہ کن بن کر ہمت کے تیشے سے انھیں شگافتہ کر کے جوئے شیر بھی نکالی۔ اندازاً یہ زمانہ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۵ء قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی اقرار ہے کہ ہماری ہی صفوں میں چند کم سواد، برخود غلط اور بہ جائے خود متعصب افراد بھی تھے جو عملاً رام لعل کے درپے تھے لیکن چند ایسے افراد بھی تھے جو رام لعل کو افسانہ نگاری کے میدان میں پروان چڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے ان کم سواد لوگوں میں میں بھی شامل تھا، زبان کے راستے سے ہم نے متحدہ محاذ بنا کر رام لعل پر متعدد حملے کیے کبھی آمنے سامنے رہ کر اور کبھی شب خون مارے مگر رام لعل نے ہمیشہ نرمی سے اپنی ہر غلطی کو تسلیم کر لیا اور غلطی نہ بھی ہوئی تو چپ سادھ لی اور ہماری بات کو بہ غور اصلاح کے مان لیا۔ اصل میں ہم بڑے منھ زور ہو گئے تھے، کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ البتہ بزرگوں میں احتشام حسین، آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی یا اختر علی تلہری کچھ تنبیہاً کہتے تو سر جھکا کر سن لیتے تھے کہ ان کی ناراضگی مول لینے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ رام لعل ہماری طفلانہ ہٹ دھرمیوں کو سمجھتا تھا اس کی چوڑی پیشانی کے نیچے شیشے کے تالوں کے اندر مسکراتی ہوئی آنکھوں میں سے یہ بات صاف جھلکتی کہ وہ ہمیں پا گیا ہے مگر تنہا ہونے کے باوجود حوصلہ ہارنے پر آمادہ نہیں۔

اسی زمانے میں جو رام لعل ہم نے دریافت کیا وہ وسیع القلب وسیع النظر، متحمل، حلیم، نرم طبع اور شریف النفس آدمی تھا۔ وہ کرہ ابوتراب خاں میں رہا یا عیش باغ میں ہم لوگوں میں گھلا ملا رہا، وہ نعمت اللہ روڈ پر سردار صاحب سے اور بارود خانے احتشام حسین صاحب سے ملنے پابندی سے پہنچتا وہ اولڈ انڈیا کافی ہاؤس بھی جاتا اور یونی ورسٹی

www.taemeernews.com

کے ادبی جلسوں میں بھی شریک ہوتا، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بھی شرکت کرتا اور رضیہ سجاد ظہیر کو بھی اپنے افسانے سُنانے پہنچ جاتا اس وقت ہم نے کبھی یہ غور نہیں کیا تھا کہ میانوالی کے دور اُفتادہ علاقے کا رہنے والا' عروس البلاد پنجاب یعنی لاہور کا پروردہ، لکھنؤ کے سوادِ رومۃ الکبریٰ میں لاہور کی دلّی کو کھوج رہا ہے، وہ مولانا صلاح الدین احمد، امتیاز علی تاج، احمد ندیم قاسمی کی محبت اور شفقت تلاش کر رہا ہے وہ لاہور کے باغات اور راوی کی نرم رو لہروں کا سکون ڈھونڈھ رہا ہے۔ یہ بات تو مجھ پر لاہور پہنچ کر کھلی کہ لکھنؤ اور لاہور میں کس قدر مماثلت ہے، باغوں میں، عمارتوں میں، سڑکوں اور محلوں میں، حتیٰ کہ موسموں تک میں حیرت انگیز مشابہت موجود ہے تاہم یہ کہ لوگوں کے مزاج اور مذاق میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے، یہ بات بھی جی کو لگی کہ لاہور سے اُکھڑنے والا لکھنؤ میں کیوں جا بسا، تاہم دل کا ایک کونا جو اُجڑا تو پھر نہ بسا، لکھنؤ لکھنؤ سہی، مگر وہ لاہور نہیں بن سکتا' درام لعل کے نقطۂ نظر سے سوچیے تو، اور میری بات کیجئے تو عین اس کے برعکس .....) قصہ یہ ہوا کہ مسیح الحسن نے جو غلام عباس کی طرح دھیمی رفتار اور آہستہ مزاج کے نرم رو افسانہ نگار ہیں اپنا معروف افسانہ مٹی کسی محفل میں سُنایا تو رتن سنگھ اُسے سُن کر زار و قطار رونے لگا رام لعل بھی وہیں موجود تھا، اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، شاید وہ بھی دل کے اندر ہی اندر خوب رویا مگر آنکھیں خشک رہیں، یہ رام لعل جو اپنے باطن میں اندر ہی اندر رو لیا، باہر سے بہت باوقار نظر آیا، یہ رام لعل وہی ہے جو اپنے گرد و پیش کے عوامل اور محرکات کا معروضی طور پر تجزیہ کرنے پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور حقایق سے خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں سمجھوتا کر لیتا ہے وہ الگ بات ہے کہ وہ اُن سے متفق نہ ہو یہی وجہ ہے کہ وہ رام لعل جو تینتیس سال

www.taemeernews.com

قبل لاہور سے اُکھڑ کر ہندوستان گیا تھا اور لکھنؤ میں جا بسا تھا، ساری دنیا میں گھوم گھام کر جب لکھنؤ لوٹا تو دل کا کونا بہ دستور اُجڑا اجڑا اور سونا سونا سا لگا۔ چناں چہ فروری ۱۹۸۰ء میں جب وہ ۳۳ سال کے بعد دوبارہ سرزمین لاہور پہ وارد ہوا۔ ملتان کی سرزمین پر قدم رکھا، میانوالی کی ہواؤں میں سانس لی، کراچی کے احباب کے درمیان وقت گزارا، اور لاہور کی خاک کو چوما تو دل کا وہ اُجڑا کونا آباد ہو گیا ــــ کیا سچ مچ وہ کونا آباد ہوا؟ اور کیا سچ مچ وہ سونا پن دور ہوا، اس عذاب سے میں بھی گزرا ہوں۔ مجھے اس کا جواب معلوم ہے، اس جواب کو آپ رام لعل کے اس سفرنامے کی سطر سطر میں ڈھونڈیں گے اور جو جوابات آپ کو سطروں میں نہیں ملیں گے بین السطور یقیناً مل جائیں گے ــــ

میں نے ساحل و سمندر کا ذکر یوں ہی نہیں کیا تھا، میں دراصل جدید سفرناموں کو بھی پڑھ چکا ہوں اور قدیم بھی۔ سفرناموں کی تکنیک کا مزاج مختلف النوع طبائع کا متحمل پذیر ہوتا ہے، ہر سفرنامہ نگار اپنے باطن کا پوسٹ مارٹم کر کے آپ کے سامنے بکھر جاتا ہے۔ آپ اس کی شخصیت کے جزئی سے جزئی جھوٹ اور سچ سے واقف ہو جاتے ہیں بلکہ لکھتے وقت تو اُسے خبر بھی نہیں ہوتی ہے کہ وہ کہاں کہاں قاری کی گرفت میں اس طرح آ گیا ہے کہ اب اپنا آپ چھپانا مشکل ہے۔ نثر کے دوسرے اصناف میں مصنف خود کو چھپا سکتا ہے مگر سفرنامہ وہ واحد صنف نثر ہے جس میں داخلیت سے سروکار رہتا ہے۔ اور ذات کے سمندر کو بلونا پڑتا ہے۔ ساحل سمندر کی مثال میں نے اسی لئے منتخب کی ہے کہ اول تو احتشام حسین کی سنجیدہ، فہمیدہ، متدین اور ثقہ شخصیت کے تقریباً تمام پہلو میرے پیش نظر ہیں یہ سچ ہے کہ احتشام حسین کا ایک متعین نقطۂ نظر تھا جو

www.taemeernews.com

برصغیر کے قارئین پر بہ خوبی روشن ہے اور یہ بھی درست ہے کہ امریکہ اُن نظریات کے لحاظ سے بہت مختلف ملک تھا جہاں تعلیمی و تدریسی اداروں تک میں سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے تحفظ کا انتہائی چالاکی سے جو انتظام کیا گیا ہے وہ احتشام حسین کی دقتِ نگاہ سے نہ بچ سکا ساحل و سمندر میں ہم اُس احتشام حسین کو دیکھتے ہیں جو امریکی معاشرے کے قوام میں تاریخی عوامل اور معاشرتی محرکات کی جزئیات کا تعمق نگاہ سے تجزیہ کر رہا ہے جس کی نگاہ میں فلسفیانہ تامل بھی ہے تفکر و تعقل کی بصیرت بھی اور جو معروضی رائے کے تعین میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا، نیز یہ کہ ساحل و سمندر کسی مجذوب کی بڑ نہیں۔ تاریخ کے مطالعے کا ایک وقیع نچوڑ ہے جو آج تقریباً ۲۸ سال بعد بھی فرسودہ اور کہنہ نہیں ہو سکا۔ احتشام حسین نے امریکہ کو پہلی اور آخری بار دیکھا اور جیسا پایا ویسا لکھ دیا۔ مگر مسئلہ ہے رام لعل کا جو پاکستان کے اِن خطوں میں برسوں رہا۔ گھوما پھرا، پلا بڑھا، پروان چڑھا۔ اور یہاں سے نکل گیا اور جب ایک بار پھر انھیں خطوں کو نئے مکینوں کے ساتھ تینتیس سال بعد آکر دیکھا، یہاں لاہور میں، میرے غریب خانے کے ایک گوشے میں رہ کر اُس نے نئے اور پرانے لوگوں سے مصافحہ کیا، ہمارے شہروں کے کوچوں میں گھوما پھرا، لوگوں کے ڈرائنگ روموں سے لے کر کھیتوں کھلیانوں تک کی سیر کرتا پھرا، ہماری خشکیوں اور ہمارے پانیوں کو دیکھتا رہا ہماری نبضوں کو ٹٹول کر رہا۔ سے دھڑکتے دلوں تک پہنچ پہنچ گیا۔ ہماری فکروں کے نت نئے اُفق ہماری شاعری، ہماری نثر، ہماری صحافت اور ہماری مصوری اور موسیقی میں دریافت کرتا پھرا۔ برصغیر کے لوگوں کے مشترک فکری اقدار کے مابین پُل بنانے کے منصوبے بناتا رہا ہماری صنعتوں کے باب میں ہمدردانہ رائیں دیتا رہا ـــــ یہ تو کوئی اور رام لعل تھا، سرزمین لاہور نے سوچا، سرزمین میانوالی نے غور کیا کہ کیا یہ میری ہی

www.taemeernews.com
خاک سے اُٹھنے والا فرزند ہے۔ اس کا ذہنی اُفق تو پھیل چکا ہے، یہ تو بڑا چتر ہو گیا ہے بڑا ہی وگیانی بن کر آیا ہے، یہ وہ رام لعل نہیں ہے جس نے اپنے مختصر سے حجرے میں قائدِ اعظم کی تصویر آویزاں کر رکھی تھی جو اپنی نئی نویلی دُلہن کو بیاہ کر اسی حُجرے میں لایا تھا اور جس کی پہلی بچی نے اسی سرزمین پر گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا، وہ رام لعل کہیں گُم ہو چکا ہے امتدادِ زمانہ نے اُس کی زندگی کے ماہ و سال کو ماضی کے نقش و نگار بنا کر طاقِ نسیاں پر ثبت کر دیا جس کے ہر ہر نقش میں وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا پھرتا ہے جس کی کاشی کاری اور بنت کاری میں ہر ہر جگہ پر ایک ایک دل دھڑک رہا ہے مگر یہ رام لعل سرد و گرم چشیدہ اور گرگِ باراں دیدہ بن چکا ہے۔ اس کی بیوی، جوان بچے اور اُن کے بچے نئے بھارت کے شہری ہیں، بھارت کی نئی نسل جو پاکستان سے واقف نہیں کیوں کہ پاکستان بننے کے بعد پیدا ہونے والی بھارتی نسل کو پاکستان سے وہ ذہنی علاقہ نہیں ہے جو اُن کے تارک الوطن بزرگوں کو ہے ـــــ رام لعل نے پاکستان کی نئی نسل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا یہ کہہ کر کہ اے نوجوان نسل کے پاکستانی بچو، یہ میرا ہاتھ، یعنی رام لعل کا ہاتھ نہیں ہے نئے ہندوستان کا ہاتھ ہے۔ میں نئے ہندوستانیوں اور نئے پاکستانیوں کے مابین مصافحہ کرانے کا خواہاں ہوں۔ اے دونوں ملکوں کے نوجوانوں میرا ہاتھ تھام لو، میں تم دونوں کا تعارف کرانا چاہتا ہوں، کیوں کہ میرے بعد تمہارا کوئی تعارف کنندہ بھی نہیں رہے گا۔ میں اے محسن اے خرم اے ساجد، مسعود اور مالک، تمہارا تعارف ونود، وکرم، عبداللہ اور مریک سنگھ سے کرانا چاہتا ہوں۔ اے لاہور، میانوالی، ملتان اور کراچی میں تمہارا تعارف لکھنؤ، سیتا پور، جون پور اور بمبئی سے کرانا چاہتا ہوں۔ میں جو ایک کمزور سا پل ہوں، چلتے چلتے اور تم سے رخصت ہوتے ہوتے چاہتا ہوں کہ تم ایک مضبوط اور مستحکم پل دونوں ملکوں

www.taemeernews.com

کے مابین قائم کر لو۔

اس خیر سگالی کے سفر میں پاک و ہند کے قارئین رام لعل کی پُر خلوص سطر سطر کے ساتھ ساتھ ہیں کہ دونوں جگہ یہ سفرنامہ یکساں مقبول ہوا ہے۔ رام لعل نے محبتیں سمیٹی ہیں اور محبتیں بانٹی ہیں، زرد پتوں کی بہار، بسنت بہار ہے پاکستان کی، بسنت بہار جب سرسوں پھولتی ہے کچنار مہکتی ہے گیندے کے پھولوں پر نکھار ہوتا ہے، گلِ اشرفی رد و ش رد و ش پر نثار ہوتا ہے آسمانوں پر پتنگیں اُڑتی ہیں فصل کٹتی ہے اور کسان کھلیانوں کے ڈھیر دیکھ دیکھ کر بھنگڑا ناچتے اور لڈی ڈالتے ہیں، اسی بسنت میں رام لعل کا یہ سفر بسنت رُت سے شروع ہو کر بسنت ہی پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یقیناً بسنت شناسوں کے لئے (دونوں ملکوں کے قارئین) اس میں سب کچھ ہے اور جنھیں بسنت کی خبر ہی نہیں وہ یقیناً اس میں کچھ نہیں پا سکیں گے۔

آغا سہیل

۲۲۔ ایف سی کالج۔ لاہور

المرقومہ ۲۳ر دسمبر ۸۰ء

www.taemeernews.com

زرد پتوں کی بہار

۱

تقسیم ہند کو تینتیس برسوں کی طویل مدت ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی سطح پر خاصا تناؤ بھی بنا رہا ہے۔ جس کا خاص سبب دونوں ملکوں کی الگ الگ خارجہ پالیسی ہے۔ اسی خارجہ پالیسی کے تکلیف دہ اختلاف نے دونوں ملکوں کے درمیان تین بار فوجی ٹکراؤ بھی کرایا جس کے نتیجے کے طور پر دونوں ملکوں کی اقتصادی حالت پر ہر بار گہرا اثر پڑا۔ دونوں ملکوں کے عوام غریبی اور بدحالی کی گہری دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

www.taemeernews.com

ادبی سطح پر دونوں ملکوں کے دانشوروں نے اپنی اقتصادی بربادی عوام کی برہمی اور ذہنی کرب کو کس کس طرح اپنی تخلیقی کاوشوں میں ڈھالا یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ اس کیفیت کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں دونوں ملکوں کی ہر زبان کے ادب کے صفحات پلٹنے پڑیں گے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی دانشوروں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اپنے لئے پہلی بار ایک قومی بیداری کی علامت قرار دیا جس کا نفسیاتی سبب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے یہ توقع کبھی نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے کبھی بین الاقوامی سرحد پار کرکے واہگہ کے راستے سے لاہور پر حملہ آور ہوں گے۔ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے یہ حملہ چھمب جوڑیاں پر پاکستانی فوجوں کے غیر معمولی دباؤ کو کم کرانا تھا جس میں ہمارے فوجی ایکسپرٹ واقعی کامیاب رہے۔ لیکن لاہور پر ہندوستانی فوجی دباؤ نے پاکستانی عوام کے دلوں میں پہلی مرتبہ یہ خوف پیدا کر دیا تھا کہ وہ بھی کبھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اسی المناک واقعے نے انہیں ایک قوم کے طور پر سوچنے کا ایک ایسا لمحہ بخش دیا جہاں سے ان کی مجموعی سوچ نے ابتدا ہوئی اور اس مجموعی سوچ کو وہاں کے شاعروں نے بڑی سنجیدگی سے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

ہنگامی حالات میں پیدا ہونے والے ادب کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں جوش و خروش زیادہ اور فکر کم ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے دوسری عالمی جنگ کے دوران مغربی محاذ کے ماس میڈیا سے روزانہ کئی کئی گھنٹے نشر ہونے والا سیکڑوں ٹن مواد ہے جس کی کوئی ادبی اہمیت متعین نہیں ہو سکی۔ پھر بھی دو ایک ناول، دو چار ڈرامے اور ایک آدھ درجن نظمیں ہمیشہ کے لئے زندہ رہ گئیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہندوپاک کی مختصر سی جنگ ہندوستان کی کسی زبان کے لئے کوئی ہمیشہ زندہ رہنے والا ادب پیدا کرنے کا موجب تو نہ بن سکی لیکن پاکستان میں متعدد نظمیں پاکستانی شعراء کے قلم سے ضرور نکل گئیں جن کی اہمیت نہ تو ہنگامی ہو سکتی ہے نہ ان کے صرف پاکستانی ہونے کی۔ بلکہ میرے نزدیک انھیں ایک آفاقی اہمیت حاصل ہو چکی ہے، چنانچہ جب

www.taemeernews.com

میں نے ۱۹۶۶ء میں اُردو زبان سرگودھا کے سالنامے میں "مجید امجد" کی نظم "سپاہی" پڑھی تو میں نے اس کے مدیر کو اتنی اچھی نظم چھاپنے کے لئے مبارکباد دیتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ سپاہی میرے ملک کا بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے ملک کا بھی جو اپنے حاکموں کے اشارے پر صدیوں سے توپوں کا ایندھن بنتا آیا ہے ۔

افسانوی ادب میں صرف احمد ندیم قاسمی کی کہانی "کپاس کے پھول" کو ہی اس ضمن میں قابل ذکر کہا جا سکتا ہے جنھوں نے جنگ کی ہولناک بمباری میں لوگوں کا تن ڈھانکنے والی روئی کے کھیتوں کو سلگتا ہوا دیکھا تھا ۔

دوسری لڑائی میں جو بنیادی طور پر بنگلہ دیش کے قیام کی لڑائی تھی اور اس میں بھارت کی انوالومنٹ اپنے اقتصادی سنکٹ سے ہی تعلق رکھتی تھی کیونکہ مشرقی پاکستان سے ایک کروڑ کے قریب مہاجر ہماری سرحدوں کے اندر ڈھکیل دیئے گئے تھے ۔ لیکن پاکستانی دانشوروں کے لئے سقوط مشرقی پاکستان کا تجربہ ایک نئی ذہنی تبدیلی کا سبب بنا ۔ اب ان کی تخلیقات میں کسی قسم کے جوش وخروش یا برہمی کے بجائے اور شکست کے احساس سے کہیں زیادہ خود اپنے آپ کو ٹٹولنے کا عمل زیادہ ملتا ہے ۔ مجھے ریڈیو پاکستان لاہور سے سنی ہوئی انتظار حسین اور امجد سلام امجد کی وہ بحث ابھی تک یاد ہے ۔ جس میں شکست کے احساس سے کہیں زیادہ خود اپنے آپ کو ٹٹولنے پھر ایک نیا اور مضبوط ملک تعمیر کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے پر زور دیا گیا تھا ۔ انتظار حسین ہی کی ایک کہانی "نیند" اکتھر کے بعد لاہور سے نشر ہوئی تھی جس میں چار دوست ہندوستان سے رہا ہو کر آئے ہوئے ایک جنگی قیدی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ انھیں ہندوستانی کیمپوں کی اذیتوں کی داستان سنائے گا ۔ لیکن جب وہ ایسی کوئی بات نہیں کہتا تو اس کے دوست مایوس ہو جاتے ہیں ۔

مسعود مفتی نے بھی درجنوں کہانیاں اور ڈرامے لکھے تھے لیکن اس کی بھی صرف ایک کہانی "بدماندن کا بل" تخلیقی احساس پر کھری اترتی ہے ۔ ہندوستانی ادب تو اکتھر میں کیا پیش کرتا ۔ وہ تو ۱۹۶۲ء میں چین کے ہاتھوں قومی ہزیمت کا

www.taemeernews.com

شکار ہونے کے باوجود ایک بھی فن پارہ نہ پیش کر سکا۔ ہندوستان کے لوگ دراصل اپنی جمہوری فضا میں ایک دوسری قسم کی کش مکش میں گرفتار تھے۔ انڈسٹری کی ترقی کے ساتھ ساتھ منافع خوروں کی جنگل بندی اور سیاسی جادوگروں کے ہاتھوں تعلیم، معیشت، عام آدمی کی باعزت زندہ رہنے کی جدوجہد غرض ہر میدان میں انھیں بے پایاں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کے ادب میں بیزاری اور بے قراری کا جذبہ عام ہے۔ وہ پڑوسی جنگوں سے اس حد ضرور متاثر ہوئے ہیں کہ جنگوں کے نام پر ہی انھیں ٹیکسوں اور مہنگائی کے بوجھ تلے اور زیادہ دب جانا پڑا ہے ۔۔۔

دونوں ممالک کے دانشوروں کے طرز فکر اور تخلیقی تحریک میں اسقدر بعد کے باوجود کچھ موضوعات ایسے ضرور رہے ہیں جنھیں انسانی سطح پر دردِ مشترک سمجھا جا سکتا ہے۔ ملک کی تقسیم کے وقت دونوں طرف کے سرحدی صوبوں میں لاکھوں لوگوں نے جن تکلیف دہ حالات میں نقل مکانی کی تھی اور اس وقت ہزاروں معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بے شمار عورتوں کا اغوا کر لیا گیا تھا، گھر جلائے گئے تھے، سامان لوٹا گیا تھا۔ ان سارے واقعات نے دونوں طرف کے ادب میں ایک مستقل جگہ بنالی ہے۔ تقسیم کا "ہینگ اوور" اتنا دیرپا ثابت ہوا ہے کہ ابھی تک دونوں ملکوں میں مہاجر اپنے آپ کو ذہنی طور پر آباد محسوس نہیں کر پائے ہیں۔ وہ خود کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق سمجھتے ہیں ہمارے دونوں اور کے تخلیق کاروں نے ان لوگوں کی اس ذہنی کیفیت کو تقسیم کے تینتیس ۳۳ کروڑ کوس چل لینے کے بعد بھی اپنی کہانیوں اور ناولوں کا موضوع بنائے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، سید انور، اشفاق احمد، شوکت صدیقی، امرتا پریتم، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، ستیش بترا، جوگندر پال، اور کئی دوسرے ادیبوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ انسانی نقطۂ نظر سے ان کی تخلیقات سے جو تاثر ابھرتا ہے اسے دونوں ملکوں کے

www.taemeernews.com

نے ایک درد مشترک ہی کہا جا سکتا ہے ہمارے دونوں ملکوں میں ادب کا نقطۂ نظر ابھی تک ایک مضبوط پل کا کام دیتا آیا ہے جس نے دونوں جگہوں کے پڑھے لکھے عوام کے درمیان ایک قسم کی فکری ہم آہنگی اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا کی ہے۔

میں جب واہگہ کے راستے آٹھ فروری ۱۹۸۰ء کو ریل کے ذریعے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے تھے۔ میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ ــــ وہاں تو اب میرا کوئی سگا سمبندھی بھی نہیں رہتا۔ پاکستان سرکار نے ۱۹۷۸ء میں ایک بار میری ویزا کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ اب دوسری بار درخواست دینے پر اچانک منیر احمد شیخ نے جو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر ہیں، مجھے یہ کہہ کر ویزا دلوا دیا کہ موجودہ حکومتِ پاکستان دونوں طرف کے عوام میں محبت اور دوستی کے جذبات کو بڑھانا چاہتی ہے۔ منیر احمد شیخ خود ایک ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات سے ہندوستان کے بیشتر قارئین واقف ہیں۔ امرتا پریتم نے اپنے ماہنامہ 'ناگ منی' کی حالیہ اشاعت میں ان کی پنجابی کی کئی غزلیں بڑے اچھے تعارف کے ساتھ شائع کی ہیں۔ منیر احمد شیخ آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور کئی ادیبوں سے مل چکے ہیں۔ وہ بطور اُردو ادیب جس طرح سفارتی فرائض سرانجام دے رہے ہیں، انھوں نے مجھ سے بھی یہی توقع وابستہ کر کے مجھے گلے سے لگا کر اپنے آفس میں الوداع کہی تھی اس خلوص کی گرمی ابھی تک میرے اندر موجود ہے۔ ان کی آنکھوں میں کسی قسم کا خدشہ موجود نہیں تھا۔ ان کی مسکراتی ہوئی آنکھیں ان کے اندر کے خلوص اور یقین کی غماز تھیں۔ ان کے آفس کے دوسرے اسٹاف نے بھی اسی خلوص کے ساتھ میرے سفر کی کامیابی کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ اب میں اپنے قلم کے رشتے داروں سے ہی ملنے کے لئے وہاں جا رہا ہوں جن میں سے بیشتر کی کتابیں مجھے ملتی رہی ہیں۔ جن کے رسالوں میں میں چھپتا رہا ہوں اور جن کے خدوخال میں ان کی تخلیقات سے پہچانتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک نے اکثر مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے، پچھلے سال ڈاکٹر وزیر آغا نے شکایت کرتے ہوئے خط لکھا تھا "آپ تو دنیا کے کئی ممالک میں

www.taemeernews.com

گھوم آئے ہیں کبھی پاکستان کیوں نہیں آتے ؟' میرے میانوالی کے بچپن کے دوست سلطان احمد کندی نے تو اپنی بیٹی کی شادی پر بھی مجھے مدعو کیا تھا۔ لیکن میں ویزا نہ ملنے کی وجہ سے اس مبارک تقریب میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے لکھا تھا 'جب کراچی آیئے میرے یہاں قیام کیجئے گا'۔ یہی پیش کش 'دوشیزہ' کی مدیرہ مسز رخسانہ سہام مرزا بھی کر چکی تھیں۔ لاہور میں اپنے یہاں ٹھہرانے کے لئے آغا سہیل اور احراز نقوی اور ان کی بیگم میمونہ انصاری نے کہہ رکھا تھا۔ جو پچھلے سال لکھنؤ آئے تھے نارو ے میں سید مجاہد علی کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی شادی میں شریک ہونے کا میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ ۹ مارچ کو اسی کی شادی کا ملتان میں ولیمہ ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ میں اس میں شریک ہو سکوں گا۔ پھر بھی میں ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ یہ کشمکش یقیناً اپنے سابق وطن کی طرف تینتیس سال بعد لوٹنے کی وجہ سے بھی ہے۔ تینتیس سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اس میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ حالات، خیالات، لوگ، راستے اور مکان بھی۔

میں میانوالی میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرے آبا و اجداد صدیوں پہلے راجستھان کے ریتلے میدانوں میں گھوڑوں پر عرب حملہ آوروں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے وہیں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس سے بھی بہت پہلے وہ کشمیر اور وزیرستان کے کسی درمیانی علاقے کی سلطنت اجڑ جانے پر جنوب کی طرف ایک قافلے کے ساتھ راجستھان کی طرف نکل گئے تھے۔ نقل مکانی مجھے وراثت میں ہی ملی ہے۔ اب میں عارضی طور پر اس جگہ کی طرف لوٹ رہا ہوں جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانسیں لی تھیں۔ جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اور جس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ کیونکہ تب میں صرف دو اڑھائی سال کا تھا۔ اسی مکان میں اسے پھر سے تلاش کروں گا۔ میں بھی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں جوان ہوا تھا۔ اور وہاں سے میں جوان ہی ہو کر آیا تھا۔ اب چھپن برس کی عمر میں وہاں لوٹ رہا ہوں۔ میرے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان عمر کا یہ فاصلہ کس قدر طویل ہو گیا تھا، جو اب ریل کی رفتار کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ سمٹتا جا رہا ہے۔ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی فاصلہ

www.taemeernews.com

کو میں بے شمار بازخوابوں کی مدد سے آنا فانا لانگھ گیا۔ خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے ماضی کے ساتھ اس لئے ابھی تک جڑا رہا ہوں کہ وہ میرے خوابوں میں اپنی اصلی حالت میں ابھی تک موجود رہا ہے۔ میں نے اتنا عرصہ خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کبھی کوشش کی تو یہ اچانک میری کسی نہ کسی کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ بالکل اجنبی بن جائے۔ کسی دوسری ہی دنیا کا انسان۔ جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں گے۔ ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے ہمیشہ گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔

میں اچانک ماضی کی بھول بھلیوں میں سے نکل کر لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے کھیتوں، اینٹوں کے بھٹوں، چھوٹے چھوٹے قصباتی مکانوں اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے میناروں کے درمیان پہنچ جاتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں میرے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آ رہی ہے وہ میری جانی پہچانی سی ہے۔ میں اس کی خوشبو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ میرے لاہور سے آ رہی ہے۔ پنجاب کے اس حصہ سے آ رہی ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں پایا۔ میں ریلوے ٹرین کی کھڑکی میں سے بڑی خاموشی سے تیزی سے گذرتے ہوئے واچ ٹاوروں اور اونچی اونچی اُگی ہوئی گھاس پھوس اور مٹی میں چھپے ہوئے پل باکسوں کی طرف دیکھتا ہوں جہاں سے سن پینسٹھ میں بڑی کامیابی سے ہندوستانی یلغار سے دفاع کیا گیا تھا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ہوا ہے اور دھوپ ہے اور خوشبو ہے، اور کھیتوں میں ہر طرف اُگے ہوئے سنہری گندم کے لہلہاتے ہوئے خوشے ہیں اور ریل کی پٹری کے متوازی دوڑتی ہوئی ایک سڑک ہے جس پر دو جاپانی کاریں آگے پیچھے دوڑ رہی ہیں اور ایک ٹوبھے (جوہڑ) کے سامنے کئی بھینسیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جن کی طرف ذرا فاصلے پر ایک چھکڑے کے پہیے کے ساتھ بندھا ہوا ایک اونٹ فلاسفروں کی سی گمبھیرتا سے ایک ٹک دیکھ رہا ہے اور ایک پیڑ کے نیچے ایک گبرو لیٹے لیٹے بانسری بجا رہا ہے اور ایک مکان کے آنگن کی دیوار پر کوئی دوشیزہ دھوپ میں سوکھتے ہوئے

www.taemeernews.com

رنگین گھبس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے اچانک گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

پھر میری نظروں کے سامنے مغل پورہ ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین ابھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطور اپرنٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا۔ ریل کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ اب گاڑی یارڈ میں داخل ہو گئی ہے۔ دونوں طرف مال گاڑیوں کا سلسلہ ہے جس میں سے نکلتے ہی اچانک مجھے لاہور کا سائن بورڈ دکھائی دے جاتا ہے، اور گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک جاتی ہے اس ڈبے میں میرا ہم سفر علی عباس حسینی مرحوم کا ایک دوست دار ہے جسے کراچی جانا ہے۔ وہ اور میں دونوں کتنی دیر سے خاموش ہیں۔ وہ مجھے بڑی خاموشی سے بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے۔

"رام لعل صاحب، قلی کو بلایا جائے؟"

میں اسے کوئی جواب دیئے بغیر پلیٹ فارم پر اتر جاتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر چل کر محسوس کر رہا ہوں۔ میں واقعی زمین پر ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ جو خواب تھا وہ اب پورا ہو چکا ہے۔ قلی سامان اٹھا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے سیکڑوں لوگ اُبل سے پڑے ہیں۔ بمبئی، حیدرآباد، مدھیہ پردیش اور بہار اور یوپی کے لوگ۔ مرد اور عورتیں اور بچے۔ سفر کی گرد سے اٹے ہوئے اور پریشان اور حواس باختہ۔ کچھ عورتیں جلدی جلدی اپنے بہنے بہن رہی ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں کرکٹ کا بلا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بیگ میں جلدی جلدی فلم فیر ٹھونس رہی ہے۔ اسے وہ کسٹم والوں کی نظر سے بچا کر اپنی ہندوستانی فلموں کی شوقین فرینڈز تک لے جانا چاہتی ہے۔ جہاں قلی نے لے جا کر میرا سامان ایک طرف رکھ دیا تھا وہاں پاسپورٹ چیک کرانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا جاتا ہوں۔ یہاں تو کئی گھنٹے اپنی باری آنے میں لگ جائیں گے۔ کسٹم کے پاکستانی عملے کی طرف میں بڑی خاموشی سے دیکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں۔ سب پنجابی ہی بولتے ہیں۔ قلی بھی پنجابی بولتے ہیں۔ لال لال وردیوں کے نیچے فیشنل ڈریس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ یک رنگی شلوار اور قمیص۔ شکل و صورت سے قلی نہیں لگتے۔ جس طرح امرتسر

www.taemeernews.com

اور جالندھر کے اسٹیشنوں پر جھاڑو لگانے والے بش شرٹوں اور بیل باٹم سے اتنے کمین نہیں نظر آتے۔ میں خود کو پنجابی بولنے کے لئے آمادہ کر کے ایک آدمی کو روک کر پوچھتا ہوں:۔

"اتھے ریسیو کرن آن والے لوگ تاں باہر ہی کھڑے رہندے نیں؟"

بھیڑ میں اچانک میرے سامنے ڈاکٹر احراز نقوی کا چہرہ ابھر آتا ہے، وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر کسٹم والوں کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ پر میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر میرے سامنے تین اور مسکراتے ہوئے چہرے آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، طاہر تونسوی اور ابصار عبدالعلی، کے۔ احراز کی طرح آغا سہیل اور ابصار بھی لکھنؤ کے ہیں۔ ان تینوں کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری ادبی محفلوں میں ہی جوان ہوئے ہیں اور اب لاہور کی محفلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ طاہر تونسوی پچھلے سال ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ریسرچ کرنے کے لئے لکھنؤ آیا تھا اور دو مہینے وہاں رہا تھا۔ ان کے ساتھ بشیر بھی تھے۔ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور۔ وہ سب میرے سامان کا ایک ایک نگ اٹھا کر بھیڑ میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ پر۔ وہ وہاں کسی نہ کسی کو ضرور جانتے ہیں۔ ان سے مجھے بھی متعارف کراتے جاتے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ نگار ہونا جیسے کوئی اہم بات ہو! سب لوگ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور مجھے آگے بڑھ جانے کے لئے کہتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکٹ کلکٹر مجھ سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ امرتسر سے لاہور تک کا۔ اور میں اچانک یاد کر کے بتاتا ہوں ٹکٹ تو میں نے لیا ہی نہیں تھا۔ میں تو ریلوے کا ملازم ہوں۔ آپ ہی کی طرح!"

وہ مسکرا کر مجھے جانے دیتے ہیں۔ اور پھر ہم سب اچانک کھلے میں پہنچ جاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ خوب بھینچ بھینچ کر اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ میں طاہر تونسوی کے گال پر بوسہ دیتا ہوں تو اس کا چہرہ نوخیز لڑکوں کی طرح شرم سے لال ہو اٹھتا ہے۔ یہ سب کرنا جیسے بھیڑ میں ممکن ہی نہیں تھا۔

www.taemeernews.com

"اب تم لاہور میں ہو! اپنے لاہور میں!" آغا سہیل مسکرا رہا ہے۔

"میں نے یہاں سے آخری بار تنخواہ لی تھی۔ چھ اگست ۱۹۴۷ء کو۔" میں اسے پلیٹ فارم پر بنے ہوئے کیش آفس کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہوں۔

"اور میں اسی پلیٹ فارم سے کالکا میل سے جالندھر کے لئے روانہ ہوا تھا۔"

www.taemeernews.com

آنکھیں نہ ہوں تو حسرتِ دیدار بھی بہت

(۲)

لاہور اسٹیشن کے باہر دو کاریں موجود تھیں۔ ایک تو ابصار عبدالعلی کی تھی۔ دوسری طاہر رضا بدی نے بھجوائی تھی۔ وہیں پر کراچی سے آئے ہوئے راحت سعید اور واہ سیمنٹ فیکٹری کے محمد حسن عسکری بھی موجود تھے۔ ان دونوں سے میرا پہلی بار تعارف ہوا۔ راحت سعید پی آئی اے میں ٹیکنیکل منیجر ہیں اور اکثر مختلف ملکوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ میری خاطر رک گئے تھے اور اسی شام کو کراچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ایک شام پہلے اُردو کے منفرد نقاد محمد علی صدیقی کو ایک

www.taemeernews.com

بہت ضروری کام سے واپس کراچی جانا پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ معذرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام چھوڑ گئے تھے کہ اب وہ میرا استقبال کراچی میں ہی کریں گے۔

میں جب لاہور اسٹیشن کی بیرونی عمارت کو دیکھ رہا تھا تو یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ۱۹۴۳ء میں ورکشاپ کی ٹیکنکل ملازمت کو خیرباد کہہ کر ۱۹۴۵ء میں اسی اسٹیشن کے پارسل آفس سے میں نے کمرشیل سروس کا آغاز کیا تھا۔ پارسل آفس دوسرے پر واقع تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں میرے سامنے دوسرے درجے کا مسافر خانہ تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکیوں کے سامنے مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لالہ موسیٰ، پنڈی اور پشاور کی طرف جانے والوں کی۔ لال وردیوں والے قلی قطار در قطار بیٹھے ٹیکسیوں اور ٹانگوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جو مسافروں اور اسباب کو لاد لاد کر لا رہے تھے۔ اسٹیشن کی بیرونی عمارت میں کچھ تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ احاطہ بھی خاصا کشادہ ہو چکا تھا۔ اسی جگہ ۱۹۴۰ء میں میں نے مشہور فلم اسٹار اشوک کمار اور ڈانسر لیلا ڈیسائی کا اور پھر ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کے جنرل شاہ نواز، کیپٹن ڈھلوں اور کیپٹن سہگل کا بے پناہ بھیڑ میں سواگت ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان موقعوں پر میں بھی یہیں کہیں موجود تھا۔ ماضی کے مناظر پلک جھپکتے ہی سامنے سے اوجھل ہو گئے جب میرے دوستوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے کس کے ساتھ ٹھہرنا چاہیئے۔ یہ کام تو میں نے انہی پر چھوڑ دیا تھا۔ میں خود کوئی فیصلہ کر کے کسی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دونوں کاریں ہمیں لے کر علامہ اقبال روڈ پر آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ اس سڑک کا پرانا نام میو روڈ ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان میں بھی انگریزوں سے وابستہ سڑکوں کے نام بدل دیئے گئے ہیں۔ انگریزوں نے ہم سے بہت کچھ چھینا تھا۔ ہم اُن سے اور تو کچھ نہیں چھین سکتے اُن کے نام تو مٹا ہی سکتے ہیں!——

اچانک آغا سہیل نے مجھ سے پوچھا۔

لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا—؟"

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو بلاشبہ ایک ذہین

www.taemeernews.com

کہانی کار کی آنکھیں تھیں۔ مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ کی گلیوں سے کٹ چکا تھا۔ چند ماہ پہلے آیا تھا تو وہ بھی تو وہاں اپنے کھوئے نشان تلاش کرتا پھرا تھا۔ کہاں بیٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ چائے پیا کرتا تھا۔ کس جگہ اس نے جمال پاشا کے ساتھ ایک خاص ایکٹو نگ کی تھی اور یونیورسٹی جانے کے لئے وہ کون کون سی گلیوں سے ہو کر نکلتا تھا کہ جہاں اُسے جان پہچان کی لڑکیوں کا بھی ساتھ نصیب ہو جائے! تب وہ لکھنؤ آزادی سے پہلے کا تھا اور اپنی ساری روایات اور پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا:۔

"بہت کچھ تو وہی ہے۔ بہت کچھ نیا نیا سا بھی ہے ۔"

چوڑی چوڑی سڑکوں کے بیچ میں ڈی وائیڈر بنا دیئے گئے تھے۔ جگہ جگہ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا۔ "اتحاد میں ہی برکت ہے"۔ "شر سے ہمیشہ بچو"۔ "ہر مہینے زکوٰۃ نکالنا مت بھولو"۔ مجھے یاد آیا اب میں ایک اسلامی ملک میں ہوں۔ یہاں قدم قدم پر شرعی پابندیوں پر زور دیا جاتا ہے۔ اس ملک نے اپنی قسمت اسلامی ملکوں کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔ اس لئے ان کی ہر سوچ اسلامی ہوگی۔ ہر قدم اسلام ہی کی حفاظت اور ترقی کے لئے اٹھتا ہوگا۔ میں نے دنیا کے ایک اسلامی ملک میں پہلی بار قدم رکھا ہے۔ اس لئے مجھے اس سفر کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کرنا چاہیئے۔ میں نے چند منٹ کے لئے آنکھیں بند کر لیں ـــــ

کہو وہ اللہ واحد ہے۔ اللہ صمد ہے۔
نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا گیا،
اور نہ اس کی وحدت کا کوئی شریک ہے۔
کہو میں آیا پناہ میں۔ صبح کے رب کی
اس کی تمام مخلوق کے شر سے۔
اور بے پناہ سیاہی کے شر سے کہ جب وہ راتج ہو،

www.taemeernews.com

اور گرہوں پر دم کرنے والیوں کے شر سے،
اور حاسد کے شر سے کہ جب اس کو ہو حسد۔
کہو، میں آیا پناہ میں، انسانوں کے رب کی،
انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے اللہ کی،
اس کے شر سے کہ جو وسوسے ڈالے اور دبک جائے،
وہ جو انسانوں کے سینے میں وسوسے ڈالتے ہیں،
جنوں اور انسانوں میں سے۔

جب آنکھیں کھولیں تو گاڑی ایلپرٹ روڈ سے گذر رہی تھی۔ میں نے قدرے حیرت سے اس موڑ کو تلاش کیا جہاں قریباً پینتیس سال پہلے ایک صبح میں نے سڑک کے کنارے ایک تنومند خوبصورت نوجوان کی رسیوں سے بندھی ہوئی عریاں لاش پڑی ہوئی دیکھی تھی۔ اُسے کوئی موٹر سے اُتار کر ڈال گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے اس کے پیچھے کسی عشق کا قصہ ہے، اور وہیں ایک انگریزی ہوٹل کے سامنے امریکی منکیز نے ایک لڑکی کو اسکول جاتے وقت پکڑ لیا تھا اور ایک اخبار فروش لڑکا اسے بچانے کے لئے فوجیوں کے ہاتھوں بری طرح پٹنا رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اسی واقعہ پر میری ایک کہانی 'اندھیری گلیاں' بیسویں صدی لاہور کے سالنامے میں شائع ہوئی تھی جس کی تعریف شوکت صدیقی نے بھی کی تھی۔

میرے دائیں طرف آغا سہیل اور راحت سعید بیٹھے تھے اور آگے محمد حسن عسکری تھے۔ بشیر گاڑی چلا رہا تھا۔ آغا سہیل نے مجھے ریلوے کا پرانا ہیڈ کوارٹرس آفس دکھایا جہاں میں برسوں پہلے سیلکشن کے لئے آیا تھا۔ اسی آفس کی پرائیویٹ روڈ سے ہو کر میں اپنی سائیکل پر میو روڈ، پھر گڑھی شاہی کے پل پر سے ہوتا ہوا ورکشاپ کو نکل جاتا تھا۔ اسی سڑک پر میں نے ایک روز فلم ایکٹریس منورما کو سائیکل پر آتے ہوئے دیکھا تھا، جو اس وقت بے حد دبلی پتلی تھی اور بے بی ڈینیل کے اصلی نام سے مشہور تھی۔ پرانی یادوں کے ساتھ کتنے چہرے بھی وابستہ تھے۔ اور کتنے واقعات بھی۔ شملہ پہاڑی کے پاس ایک دن صبح چار بجے، رات کی شفٹ سے لوٹتے ہوئے میں

www.taemeernews.com

گھپ اندھیرے میں زور زور سے گاتا ہوا چلا آرہا تھا کہ اچانک میری سائیکل ایک اور سائیکل سوار کے ساتھ ٹکرا گئی۔ ہم دونوں گر پڑے تھے۔ پھر ایک دوسرے سے کچھ کہے بنا ہی اپنے اپنے راستے پر ہو لئے تھے، میری ٹانگوں میں کچھ چوٹیں لگ گئی تھیں اور سائیکل کے اگلے پہیئے کی ساری اسپوکیں ٹوٹ گئی تھیں ــــ

آغا سہیل کی رہائش گاہ واقع ایف۔سی کالج میں دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ پہنچیں۔ اُن کے بیٹے محسن سے پہلی بار ملاقات ہوئی باپ سے کچھ زیادہ ہی اونچا اور صحت مند نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور میرا سامان بشیر کی مدد سے اتروا کر اندر لے گیا۔ ہم سب ایک کھلے کھلے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ انصار عبدالعلی، طاہر تونسوی، احراز نقوی، محمد حسن عسکری اور راحت سعید۔ آغا سہیل اندر چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا پھر اس کی آواز بھی سنائی دی وہ فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آیئے آپ کو اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاؤں ــــ

اُس طرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ جمعہ کی وجہ سے گھر پر تھے۔ ایک مدت کے بعد (۱۹۴۲ء کے بعد) میں نے ان کی آواز سنی۔ اتنے قریب سے۔ اس شہر میں مجھے سب سے پرانے جاننے والوں میں ایک وہ تھے، دوسرے میرزا ادیب۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی پہلی ملاقات دہلی میں ۱۹۷۱ء میں پہلی ہند و پاک ثقافتی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب نے پوچھا

"کب آئے؟"

میں نے بتایا "بس ابھی آکر بیٹھا ہوں۔"

"خوش آمدید۔ سب خیریت ہے نا۔ کب ملو گے؟"

"جی شکریہ۔ جس وقت آغا سہیل لے کر آئیں گے۔ حاضر ہو جاؤں گا۔"

"اچھا کیا پروگرام ہے؟"

میں آج ہی رات کو ملتان چلا جاؤں گا۔ وہاں کل میرے ایک دوست کی شادی کا ولیمہ ہے۔"

www.taemeernews.com

کچھ باتیں اور بھی ہوئیں۔ پھر میں جلدی جلدی گرم پانی سے نہا کر اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ سہیل صاحب کی بیگم اور ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سے پروگرام طے ہونے لگے۔ لیکن کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ میں آج رات سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور ملتان سے لوٹ کر ہی سب سے ملوں گا۔ سب لوگ چائے پی کر اور رخصت لے کر چلے گئے۔

سخت سردی سے جو کل رات کو مراد آباد سے ہی ملنے لگی تھی اور لاہور میں بھی موجود تھی۔ میرا گلا کچھ خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آواز اچانک بند سی ہونے لگی تھی۔ میں نے آغا سہیل سے ذکر کیا تو اس نے کہا "ڈاکٹر انور سجاد کو بلا لیتے ہیں وہ دوا ساتھ لے کر آ جائے گا۔"

اس نے انور سجاد کے ساتھ بھی فون پر ہی فوراً ملاقات کرا دی۔ اس نے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں میری لاہور میں آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور رات کو ساڑھے نو بجے دوا لے کر آنے کا وعدہ کیا۔

اس روز پتہ ہی نہ چلا کہ کب شام ہو گئی۔ آغا سہیل نے اپنے ایک پڑوسی پروفیسر اور اس کی بیگم اور ان کی دو بچیوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا جو کچھ دنوں کے بعد سعودی عرب جا رہے تھے۔ ابصار عبدالعلی بھی آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ میرے لئے اپنی کتابیں بھی لے آئے۔ ایک کتاب "کیسے کیسے لوگ" ٹی وی کے لئے تاریخی تمثیلی ڈراموں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب دیکھتے ہی بہت اہم لگی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ دو ہزار برس پہلے کی عالمی تاریخ کے مختلف واقعات پیش کئے گئے تھے، اور اس کے لئے ابصار عبدالعلی نے عمر خیام، اقلیدس، بوعلی سینا، گلیلیو، فلورنس نائٹ انگیل پر لکھی ہوئی بے شمار مغربی اور مشرقی مصنفین کی کتابوں کے اوراق کھنگالے تھے۔ اقلیدس ہی وہ پہلا ریاضی داں تھا جس نے کسی غیر معمولی اونچی چیز کو جیومیٹری کے اصول دریافت کر کے اس کی اونچائی کو ناپنا سکھایا تھا۔ اس کے لئے وہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک نہ صرف آس پاس کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم چیزوں کے سایوں کو ایک ٹک

www.taemeernews.com

دیکھتا رہا بلکہ خود بھی روزانہ گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر اپنے سائے کو پھیلتے اور سکڑتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ بالآخر اس نے یہ فارمولا دریافت کر ہی لیا کہ کسی خاص لمحے میں کسی بھی چیز کا سایہ اس کے قد کے ہی برابر لمبا ہوتا ہے۔ اس کتاب پر احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر سلیم اختر کی قابل قدر آرا چھپی ہوئی تھیں اور ہر شخص نے ابصار عبدالعلی کی لگن اور علمیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔ دس بجے کے قریب انور سجاد بھی اپنے کلینک سے واپس آگیا میرے لئے اپنے ساتھ کچھ دوائیں بھی لے آیا تھا۔ ہم دونوں بڑی گرمجوشی سے گلے ملے۔ ہند و پاک میں اُس کے علامتی افسانوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُس کا تعلق اُردو کے جدید افسانہ نگاروں کے تیسرے بڑے گروہ سے ہے۔ درمیانے قد کا بھرے بھرے جسم کا مالک اور بھاری، گمبھیر اور ڈرامائی لب و لہجہ۔ وہ اُردو اور پنجابی ایک سی روانی سے بولتا ہے، وہ اسٹیج اور ٹی وی پر اداکاری کے بھی جوہر دکھایا کرتا ہے۔ کئی بار جیل جا چکا ہے۔ وہ ایک اچھا آرٹسٹ اور نقاد بھی ہے جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

رات دس بجے کے بعد ابصار عبدالعلی مجھے اور ڈاکٹر آغا سہیل اور اُن کی بیگم کو اسٹیشن لے گئے۔ اُس وقت آخری گاڑی خانیوال تک ہی جاتی تھی، اور ایک بس سیدھی ملتان کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ بس کا پرانا اڈا بھی اسٹیشن کے سامنے واقع تھا۔ کار میں بیٹھے بیٹھے ایک فٹ پاتھ کے ٹی اسٹال سے چائے پی گئی۔ میں رات کی جگمگاتی ہوئی ٹیوب اور نیون لائیٹس میں سڑکوں پر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ بس اسٹینڈ کے تیل سے داغ داغ وسیع فرش پر چلتے ہوئے ہم لوگ بس میں جا بیٹھے۔ بس کے اندر ملتان، ساہیوال، چیچہ وطنی اوکاڑہ، میاں چنوں اور خانیوال جانے والے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے بھاری کوٹ اور کمبل اوڑھے ہوئے اور سگریٹ پھونکتے اور کھانستے ہوئے۔ ہر آدمی بڑے اعتماد سے السلام علیکم کہہ کر اندر آتا اور کسی نہ کسی سیٹ پر جم جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا ہمارے یہاں سکھوں میں بھی یہی رواج ہے کہ ایک

www.taemeernews.com

اجنبی دوسرے اجنبی کو ست سری اکال کر کے فوراً متاثر کر لیتا ہے۔ مسلمان بھی السلام علیکم کا جواب فوراً دیتا ہے اور دل یا بس دونوں میں سے ایک کے اندر جگہ ضرور دے دیتا ہے۔ عیسائی گڈ مارننگ یا ہیلو کہنے والے کو جواب تو ضرور دیتا ہے لیکن گھور کر بھی دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن ہندو نمستے کہنے والے کو صرف گھورتا ہے۔ اور اُسے جگہ دینے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

بس کنڈکٹر ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے۔ سواریوں کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر زیادہ سے زیادہ تعداد میں بس کے اندر ٹھونس لینے میں ماہر اور خاصا چرب زبان۔ کبھی تند و ترش اور کبھی انتہائی شیریں زباں۔ اور سگریٹ کے کش لگاتے لگاتے اچانک کسی سواری پر برس پڑنے والا اور ڈرائیور کو بس روک لینے یا چلا دینے کے جملہ اختیارات سے پوری طرح باخبر۔ ہماری بس کے اندر آکر بھی اُس نے موٹی اور پتلی سواریوں کو خاصی پیشہ ورانہ اور تاجرانہ نظروں سے تاکا۔ ٹکٹ دینے سے پہلے اپنی مرضی کے مطابق ہر ایک کو یہاں وہاں ایڈجسٹ کیا جیسے بس کے اُلار ہو جانے کا خطرہ ہو۔ وہ راستے میں سواریوں کو اُتارنے اور چڑھانے میں بھی بازو کا سہارا دے کر یا بازو سے کھینچ کر ایک برادرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتا گیا لیکن بس کے اسٹاپوں کے درمیان چونکہ کافی لمبا فاصلہ تھا اس لئے وہ ہر اسٹاپ پر سواریوں کو نیچے اُتر کر چائے پی لینے اور پیشاب بھی کر لینے کی یاد ضرور دلا دیتا تھا۔

راستے میں کچھ لوگ پولٹکس پر بھی بحث کرتے چلے گئے۔ مہنگائی اور سڑکوں کی خرابی کا رشتہ پولٹکس سے فوراً ملا لینے میں وہاں کے لوگ بھی خاصے ذہین معلوم ہوئے جو ہر جملے پر اللہ رحم کرے کہہ کر ظالم اور مظلوم دونوں کے لئے مغفرت کی دعا بھی کر دیتے تھے۔ ایسے ہی دو آدمی جو ہماری آگے کی سیٹوں پر کتنی دیر سے باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی سگریٹین سلگانے میں بھی مدد کر رہے تھے اچانک ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑے۔ ایک نے دوسرے پر اُس کی جیب سے روپے نکال لینے کا الزام لگا دیا اور مبینہ مجرم آناً فاناً بس کے سارے مسافروں کی توجہ

www.taemeernews.com

کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ وہ بار بار 'کمال ہے یار! حد ہو گئی یار!'، اور 'لوگل سنو جی'، کہہ کہہ کر اپنی ایمان داری کو بچانے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا۔ پھر خاصی تو تو مَیں مَیں کے بعد اُس آدمی کے روپے اپنی ہی کسی دوسری جیب میں مل گئے تو اُس نے معافی مانگنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی اور خاموش ہو کر پھر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ جس مسافر پر الزام لگایا گیا تھا وہ خاصی کمزور پرسنالٹی کا مالک معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے اندر اب بھی ذرا سی برہمی نہ پیدا ہو سکی۔ اُس کا لہجہ ابھی تک معذرت خواہانہ تھا اور وہ بار بار پہلے کی طرح کمال ہے یار! حد ہو گئی یار اور لوگل سنو جی کہتا جا رہا تھا۔

صبح چار بجے ہم لوگ ملتان پہنچ گئے۔ قریب ہی کسی مسجد سے اذان سنائی دے رہی تھی۔ رات کے وقت شاید دنیا کا ہر بس اسٹینڈ ایک ہی طرح کی پُراسرار فضا میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم لوگ صبح کی روشنی کے نمودار ہونے کے انتظار میں کبھی مختلف بنچوں پر جا جا کر بیٹھے کبھی دوسرے مسافروں کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹولا۔ اور جب کچھ نہ بن پڑا تو چائے کی تلاش میں دُور تک پیدل ہی نکل گئے۔ برصغیر میں بس اڈوں کے آس پاس ساری دکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ لیکن اللہ کی شان زیادہ تر دوکانیں حجاموں کی ہی تھیں جن کے آئینے ٹیوب کی روشنیوں میں آنکھیں مار مار کر بلا رہے تھے۔ ہر دوکان پر صبح کے اوّلین لمحوں میں لوگ بڑے مزے سے سر کی مالش کرا رہے تھے یا اصلاحِ گیسو کی تمنا پوری کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک چائے کی دوکان ملی تو وہاں جا کر خاصی پریشانی سی محسوس ہوئی کیونکہ جہاں بیٹھنے کی سیٹیں خالی تھیں، دو خونخوار کتے اور ایک بکرا بندھا ہوا تھا جنھیں چائے خانے کے مالک کا ہٹا دینے کا حکم سن کر بھی اس کے نوکر نے ایسا نہ کیا۔ شاید اس ہوٹل میں بیگم آغا سہیل ہی چائے کے لئے آنے والی پہلی خاتون تھیں۔ کیونکہ ہر شخص اس واقعہ کو غیر معمولی سمجھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوبا نظر آیا۔ بیگم آغا سہیل پریشان ہرگز نظر نہ آئیں کیونکہ وہ لکھنؤ اور لاہور کی فضاؤں سے پوری طرح مانوس تھیں پھر بھی وہ اس قصباتی

www.taemeernews.com

فضا کو سمجھ کر بار بار اپنی بیٹی اور داماد کے پاس چلنے پر اصرار کرتی رہیں جن سے ان کی شادی کے بعد پہلی بار ملنے کے لئے انھوں نے میرے ساتھ یہ سفر اختیار کیا تھا لیکن انھوں نے یہ ذمّہ داری بھی قبول کر رکھی تھی کہ مجھے میرے دوست سیّد مجاہد علی کے مکان نمبر ۵۱۷/9 واقع نواں شہر محلہ ملتان خاص میں پہنچا کر ہی کہیں اور جائیں گے اور یہیں اس بات کی یاد انھیں بار بار دلا دیتا تھا۔ میرے اندر غریب شہر ہونے کا احساس انہی کی ہمراہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اور میرے ذہن میں بار بار بابا فرید کا یہ ڈوہڑا بھی گونجتا رہا ؎

فریدا چار گوائیاں ہنڈ کے چار گوائیاں سم
لیکھا رب منگیسا، توں آیوں کیہڑے کم

اُس نے اسی شہر کی ملتانی زبان میں تصوّف کی شاعری کی تھی۔

صبح چھ بجے کئی حجاموں سے ہی پوچھتے ہوئے جن کی دوکانیں ہر سڑک اور ہر گلی میں کھلی ہوئی ملیں، ہم پیدل چلتے چلتے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ مجاہد علی اور اس کے بھائیوں کو سوتے میں جا کر جگایا۔ وہ لوگ ایک روز پہلے فیصل آباد سے مجاہد صاحب کی دُلہن لے کر لوٹے تھے، اور اُسی روز اُن کے منجھلے بھائی کی بھی شادی ہوئی تھی۔ پانچ روز کے بعد وہ سب سے چھوٹے شاہد علی کی بارات لے کر کراچی جانے والے تھے۔ مجھے اور میرے ساتھ آغا سہیل اور اُن کی بیگم کو دیکھ کر سب خوش ہو گئے لیکن میرا گلا بدستور خراب تھا۔ اب تو بولنے میں بھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ بس خاموش رہ کر ہی مسکراتا رہا اور بار بار یہی یاد آتا رہا:۔

گنگی گئی پیکے گئی نہ گئی بکے لیکھے

(گونگی کا مائکے جانا بے سود ہی ثابت ہوا)

دس بجے مجاہد کے دوست منوّر صاحب کے ساتھ کچہری گیا۔ وہاں اُن کے ماموں میاں رشید احمد ایڈوکیٹ سے ملاقات ہوئی۔ خاصے معروف وکیل ہیں۔ اُن کے اِرد گرد موکلوں کا مجمع سا لگا ہوا تھا۔ وہ ہماری وجہ سے اُن کے کام جلدی جلدی نپٹاتے رہے اور اپنے جونیئر کو ضروری ہدایات بھی دیتے رہے۔

www.taemeernews.com

موکل، وکیل اور کچہریاں ہر کہیں ایک سی ہوتی ہیں۔ کم سے کم برصغیر میں تو ایک سی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ زن، زر اور زمین کے جھگڑے۔ میں موجودہ ملازمت میں ہندوستان کے کئی شہروں کی کچہریوں میں گھوم چکا ہوں۔ میاں رشید احمد ہمیں ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس لے گئے۔ وہاں ویزا پر آمد کی مہر لگوائی گئی۔ پھر اُن کی گاڑی میں صدر کے تھانے میں جاکر رپورٹ درج کرائی۔ وہاں کے ڈی۔ ایس۔ پی نے چائے پلا کر سواگت کیا۔ واپسی پر وہاں رشید احمد مجھے ایک ڈاکٹر ملک محمود اسلم کے پاس لے گئے جنھوں نے میرے گلے کا معائنہ کرکے بہت سی دوائیں لکھ دیں۔ ساری دوائیں میاں رشید صاحب نے ہی ایک کیمسٹ سے خریدیں اور ہم کار میں ہندو پاک کے حالیہ کرکٹ میچوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کچہری لوٹ آئے۔ میاں رشید احمد پچاس پچپن سال کے خاصے تجربہ کار، سوشل اور دلچسپ انسان لگے۔ دوپہر کا ایک بجنے والا تھا، ہم جلدی جلدی مجاہد علی کے گھر واپس آگئے۔ وہاں مہمان جمع ہو چکے تھے۔ آغا سہیل اور اُن کی بیگم اپنی بیٹی مسرت اور داماد کلب عابد کو بھی لے آئے تھے دونوں ملتان یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ مجاہد اور شاہد نے کئی دوستوں سے متعارف کرایا۔ رشید احمد اور فیض احمد جو دونوں وہاں ٹیچر تھے، اسرار حسین جو اُن کے پڑوسی تھے اور جبل پور کے غلام وارث شیخ صاحب۔ کھانا کھانے کے دوران اُردو اور ہندوستان پر باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے بار بار اس بات سے خوشی کا احساس ہوتا رہا کہ یہاں بھی میرے قارئین موجود ہیں۔

شام کو اسرار حسین کے مکان پر عرش صدیقی جو اُردو کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ہیں اور ملتان یونیورسٹی میں رجسٹرار ہیں۔ اپنی نئی کتاب باہر کفن سے پاؤں لے کر آگئے، اس کتاب پر انھیں آدم جی پرائز مل چکا ہے۔ کتاب کے ڈسٹ کور پر اُردو و پنجابی کے مشہور نقاد و شاعر عارف عبدالمتین نے لکھا ہے۔ عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کے سحر کا تجزیہ ہم پر اس امتیازی حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے فن کو معاشرہ و ماحول کے سائنسی شعور اور کرداروں کے نفسیات کے معروضی مطالعے پر استوار کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے انھوں نے جدیدیت کے اُس

www.taemeernews.com

صحت مند اور متوازن تصور کو ہمہ وقت ملحوظ رکھا ہے جو ایک طرف افسانے کو روایتی اور متحجر قسم کی سماجی حقیقت نگاری سے محفوظ کرتا ہے تو دوسری طرف اُسے دور از کار اور آزاد ذہنی تلازموں پر مبنی بے گرفت تجریدیت سے بچاتا ہے۔ مشہور نقاد اور افسانہ نگار سلیم اختر نے بھی اُس کی حقیقت نگاری کا اعتراف کیا ہے۔ وہیں اُردو کے بزرگ شاعر فرخ درانی اور مہر گل کے علاوہ کئی اور حضرات بھی تشریف لے آئے فرخ صاحب نے بھی مجھے اپنی شاعری کا نیا مجموعہ 'نیلے پانیوں کی نیند' اِن سطور کے ساتھ عنایت کیا۔ "اُردو کے ۔ افسانہ نگار ۔ کی خدمت میں جو تجریدیت، علامیت لغویت اور بے معنویت کے اس گمراہ کن دور میں بھی اچھی اور زندگی سے دھڑکتی ہوئی کہانی کہنے کا فن نہیں بھولے"۔ میں دیکھتا ہوں کہ اُردو ادب میں تجریدیت بے معنویت اور علامیت کا چرچہ ہر جگہ ہے۔ موافقت اور مخالفت دونوں میں۔ ترقی پسندی کے آغاز میں بھی قریب قریب اِسی قسم کی فضا بن گئی تھی۔ میں نے فرخ صاحب کے مجموعۂ کلام کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور ان اشعار پر نظریں ٹھہر ٹھہر گئیں ؎

کچھ گھٹ گیا ہے حُسن کا معیار بھی بہت　　کچھ بڑھ گئے ہیں شہر میں بازار بھی بہت
آنکھیں ملیں تو عین عبادت ہے دیکھنا　　آنکھیں نہ ہوں تو حسرتِ دیدار بھی بہت

رات کو جانے کیسے چین سے سوتا ہے　　جس کا اِک اِک انگ تھرکتا رہتا ہے

ایک عالم سے ہو گیا ناراض　　دل تری بزم سے اُٹھا کیا ہے

قائم رہا ہزار طرح ٹوٹنے کے بعد　　وعدہ ترا معاہدۂ تاشقند تھا

پچھلے سال کی دُھلی ہوئی شلوار نکال　　پھر گرمی کا موسم لوٹ کے آیا ہے
میرے قد سے یہ کھڑکی کچھ اونچی ہے　　جھانک کے دیکھو کتنی دور سویرا ہے

www.taemeernews.com

اظہار، زبان کے بدلتے ہوئے رجحانات، جدیدیت کی صحیح پہچان وغیرہ ایسے موضوعات پر ہماری لمبی بحث چھڑ گئی۔ امجد اسلام امجد کے ٹی وی ڈراما "وارث" کی بھی ایک قسط دیکھنے کو مل گئی۔ اور اس کے سب سے بڑے آرٹسٹ محبوب عالم کی اداکاری دیکھنے کا موقع ملا۔ جی خوش ہو گیا۔ وہ واقعی اعلیٰ درجہ کا اداکار ہے۔ کھانے کی میز پر بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہم پنجابی الفاظ کی جڑیں سنسکرت، فارسی اور عربی میں تلاش کرتے رہے جب کہ ہم میں سے کوئی بھی ماہر لسانیات نہیں تھا لیکن اس موضوع سے دلچسپی ہر ایک کو تھی۔ ان لوگوں نے چاہا کہ میں کل یا پرسوں ملتان یونیورسٹی میں اُردو افسانے پر ایک تقریر کروں۔ لیکن مجھے تو اگلے روز صبح سویرے پہلی گاڑی سے لاہور لوٹ جانا تھا۔ وہاں شام کو انتظار حسین کے نئے ناول 'بستی' کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا وہاں ایک ہی جگہ بہت سے ادیبوں سے مل لوں۔ اس لئے ملتان کے ساتھیوں سے پھر ایک دن آنے کا وعدہ کر لیا ــــ ہماری گفتگو دلچسپ لطیفوں اور فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ ختم ہو گئی ــــ

www.taemeernews.com

ماضی کا کرب، شناخت کا مسئلہ

(۳)

۱۰ فروری کی رات کو سرگودھا فون ملایا گیا۔ امید تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا گھر پر مل جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا وہ اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں مقیم ہیں جہاں فون نہیں ہے۔ پیغام چھوڑ دیا گیا کہ میں صبح لاہور جا رہا ہوں، وہاں میرا قیام ڈاکٹر آغا سہیل کے ہی پاس رہے گا۔ اُسی وقت انور سدید کا ذکر آیا تو معلوم ہوا وہ ملتان سے چالیس میل دور کوٹ ادّو میں تعینات ہیں۔ اور ان کے پاس صبح میرا پیغام لے جایا جا سکتا ہے۔ کوٹ ادّو ایک فرحت بخش پکنک اسپاٹ بھی ہے۔

www.taemeernews.com

لیکن اب وہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ ویزا کی پابندی ضروری تھی۔ لہٰذا ایک خط لکھ کر منوّر صاحب کو دے دیا کہ انور سدید تک بھجوا دیں گے۔ اُن کے ساتھ برسوں سے خط و کتابت ہے۔ یہ اُمید قائم رہی کہ وہ کسی بھی وقت لاہور پہنچ جائیں گے۔

صبح پانچ بجے مجاہد علی اور اُن کے بھائی جاگ گئے۔ منوّر صاحب اور اسرار حسین بھی آ گئے۔ صبح کے دھندلکے میں گاڑی لے کر ہم سب پہلے صدر کے پولیس اسٹیشن گئے۔ گلا بدستور خراب تھا۔ دوا بھی لے رہا تھا۔ اُمید تھی دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس اسٹیشن کی ڈیوٹی پر جو انسپکٹر تعینات تھا وہ اپنے آفس کی ہی میز پر کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے میرے ویزا میں ملتان سے روانگی کا اندراج کیا اور ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر اُردو کے دو اخبار خریدے۔ نوائے وقت اور مشرق۔ تیز گام گاڑی لیٹ تھی، لیکن کوئٹہ سے آنے والی چلتن ایکسپریس صبح وقت پر پہنچنے والی تھی۔ میں کچھ منٹ تک پلیٹ فارم پر ٹہلتا پھرا۔ مسافروں کی آگاہی کے لئے پاکستان ریلوے نے جگہ جگہ بورڈ لگا رکھے تھے۔ "تین سال سے زیادہ عمر کے بچوں کا ٹکٹ ضرور خریدیئے"۔ "دورانِ سفر ریلوے کے خانساماں کے سوا کسی اجنبی شخص سے کھانے پینے کی اشیاء لے کر نہ کھائیں، کیونکہ فریب کار لوگ کھانے یا مٹھائی وغیرہ میں دھتورہ یا کوئی اور نشہ آور چیز ملا کر مسافروں کو کھلا دیتے ہیں اور اس طرح ان کی نقدی اور سامان وغیرہ لوٹ لیتے ہیں"۔ "خدا کے پیارے ہیں وہ دولتمند جن میں غریبوں کی عاجزی اور انکسار ہے اور وہ نادار جن میں امیروں کی سی بلند ہمتی اور اولوالعزمی ہے"۔

اُردو میں چھپے ہوئے ٹائم ٹیبل میں ریلوے بورڈ اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹس کی طویل فہرست میں ایک خاتون کا بھی نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مسز ثریا حفیظ فنانشل ایڈوائزر اینڈ چیف اکاؤنٹس آفیسر کے عہدے پر فائز ہے۔ یہ عہدہ وہاں کے محکمۂ اکاؤنٹس میں سب سے بڑا ہے۔ ہندوستانی ریلویز میں ابھی اتنے بڑے عہدے پر کوئی خاتون نہیں پہنچی ہے۔ ڈویژنل سطح پر مجھے ایک سینیر اکاؤنٹس آفیسر مسز چوپڑہ

www.taemeernews.com

کی یاد آئی، جس کے پاس جاتے ہوئے اس کے جونیر افسروں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔

ٹرین آتے ہی آغا سہیل اور بیگم سہیل بھی دکھائی دیئے۔ وہ رات کو اپنی بیٹی اور داماد کے پاس رہ گئے تھے۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے اترنے اور چڑھنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ جسے دیکھنے کا میں عرصہ پچاس سال سے ہندوستان کے ہر اسٹیشن پر عادی ہو چکا ہوں۔ سامان سے لدے پھندے قلی اور مسافر جن میں مرد، عورتیں اور چیختے ہوئے بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ گاڑی لاہور جیسے بڑے شہر کی طرف جا رہی تھی اس لئے اس میں عورتیں اور لڑکیاں نسبتاً زیادہ نفیس برقعوں میں تھیں۔ جو بنا برقعوں کے تھیں وہ بھی زیادہ خوبصورت تھیں۔ لکھنؤ اسٹیشن پر دہلی اور پنجاب جانے والی گاڑیوں میں بھی ایسی ہی کلاس کی عورتیں زیادہ کثرت سے نظر آتی ہیں۔ جون پور اور گورکھپور جانے والی گاڑیوں پر معمولی شکل و صورت کی ہی عورتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں تماش بین لڑکوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔

دوستوں سے گلے مل مل کر رخصت ہوا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تو آغا سہیل نے نوائے وقت میں چھپا ہوا ایک کالم دکھایا، جس کی سرخی تھی "رام لعل نے اپنے کمرے میں قائداعظم کی تصویر آویزاں کر دی"۔ میں نے اس کے تحت جلدی جلدی وہ پیراگراف پڑھا۔ رام لعل اور تحریک پاکستان۔ بھارتی ادیب رام لعل نے افکار کراچی میں اپنی یادداشتیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس میں سے ایک اقتباس "قائداعظم محمد علی جناح کی قدم قدم کامیابی کو میں بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا اور اُن کے پاکستان کے حصول کو ایک کارنامہ سمجھنے لگا تھا۔ کمیونسٹ تحریک بھی پاکستان کی ہم نوائی کر رہی تھی۔ ہمارے کئی بزرگ ادیبوں نے جن میں شاہد احمد دہلوی، احمد ندیم قاسمی اور محمد حسن عسکری شامل تھے اپنے رسالوں میں قیام پاکستان کے حق میں مضامین لکھے تھے۔ متحدہ ہندوستان سے جذباتی لگاؤ اور کانگریس کے بڑے سیاسی لیڈروں سے والہانہ رغبت کے باوجود جنھوں نے قید و بند کی بے اندازہ صعوبتیں برداشت کی تھیں اور انگریز حکمراں کے ساتھ ایک تاریخی و پرامن لڑائی لڑی تھی میں نے محمد علی جناح کو بھی

www.taemeernews.com

اب ذہنی طور پر اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا اور ان کی ایک بہت بڑی تصویر بازار سے خرید کر اپنے گھر میں لگا لی تھی۔ اس میں ایک قسم کی شکست کا احساس بھی تھا اور نئے حالات کو حقیقت پسندی سے قبول کرنے کا جرأت آمیز رویہ بھی۔"

اس کالم کو دیکھ کر مجھے یک بہ یک احساس ہوا کہ مجھے اب اس ملک میں میرے گزشتہ بیانات اور پرانی تحریروں کی روشنی میں ہی دیکھا جائے گا۔ میں یہاں بہ یک وقت ایک ہندوستانی نمائندے اور ایک ادیب کی حیثیت سے موجود ہوں اور اس حیثیت کو کسی بھی لمحہ فراموش نہیں کرنا ہوگا۔ میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد واقعی اس نئی مملکت کا شہری بن کر رہنا چاہتا تھا۔ لیکن پنجاب کے دونوں حصّوں کے خوں ریز واقعات کے بعد جو دونوں ملکوں کے لئے قابو سے باہر ہوتے چلے گئے تھے، ایسا کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔ گزشتہ تینتیس برسوں میں اس دُکھ کو میں کسی بھی لمحہ بھلا نہیں سکا تھا کہ میں اپنے وطن سے زبردستی سرحد کے پار ڈھکیل دیا گیا تھا، اور برصغیر کے اس حصّے کو میں کبھی اپنے خوابوں سے جھٹک نہیں پایا ہوں۔

گاڑی کا ہر ڈبہ، اندر ہی اندر سے دوسرے ڈبوں کے ساتھ جُڑا ہوا تھا۔ اس لئے سرمہ، دال موٹھ، چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے نسخے، مونگ پھلی وغیرہ بیچنے والے بڑی آزادی سے آتے رہے اور چیخ چیخ کر اپنا سامان بیچنے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنی چیزوں کا ذائقہ چکھ لینے کے لئے وہ بڑے اصرار کے ساتھ ہر مسافر کے ہاتھ میں تھوڑا تھوڑا بانٹتے ہوئے، "لو جی بسم اللہ کرو" بھی کہتے جاتے تھے۔ خود مسافر بھی اوپر نیچے بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے کافی اونچی آواز میں اپنی اپنی بحثیں چلا رہے تھے۔

"دیکھو جی قائداعظم صاحب نے تو صاف صاف فرمایا سی اپنے ملک دی خدمت ہم اپنے کردار سے ہی کر سکتے ہیں لیکن ہمارا وہی کردار ابھی تک نہیں بن پا رہا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں برادر، اللہ رحم کرے وہ دراصل تینوں بھائی جو تھے

www.taemeernews.com

دو کو تو مار ہی ڈالا گیا اب تیسرا باقی ہے۔ اللہ رحم کرے۔ لیکن ہمیں پالٹکس پر گفتگو نہیں کرنا چاہیئے آپ جانتے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔"

راستے میں گاڑی خانیوال اسٹیشن پر رُکی تو میں اور آغا پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ اِدھر اُدھر ٹہلتے پھرے۔ میرے قدم بے اختیار سگریٹ پان بیچنے والوں کے سامنے رُک جاتے تھے۔ لیکن آغا سہیل نے مجھے گلے کی سخت خرابی کے پیش نظر سگریٹ پینے سے باز رکھا اور خود کو بھی باز رکھا۔ لیکن وہ پان بہ کثرت کھاتا رہا، اور اپنی بیگم کو بھی کھلاتا رہا۔ پان اب حیدر آباد سندھ میں بھی پیدا ہونے لگا ہے لیکن زیادہ تر سری لنکا سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ میں نے اٹاری کسٹم پر ایک شخص کے سامان میں پان کی ٹوکری بھی دیکھی تھی جسے وہ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔

ساہیوال اسٹیشن کو دیکھ کر مجید امجد اور ناصر شہزاد کی یاد بے اختیار آگئی۔ اکھتر کے زمانے میں اُردو دنیا اپنے تین اچھے شاعروں سے محروم ہو گئی تھی۔ یوسف ظفر، ناصر کاظمی اور مجید امجد۔ ڈاک تار کے سلسلے بند ہونے کی وجہ سے ہم اُن کی رحلت کی خبریں ریڈیو سے ہی سُن پائے تھے۔ ناصر شہزاد کو ہم نے پہلے سے اطلاع دے دی ہوتی تو وہ ہمیں ملنے کے لئے اسٹیشن پر ضرور آجاتا اس کے خلوص کی پوری شخصیت اس کی شاعری میں سے جھانکتی ہوئی بلکہ آنکھیں مارتی ہوئی مل جاتی ہے ؎

چھنکے رے تو گجر سے
آئیں جو سیّاں سجرے
نیم پہ بیٹھا طوطا
چھیڑے شور مچائے
ان کھل بھید بتائے
جھانکے پڑوسن چھت سے

www.taemeernews.com

ہمٹوں میں لاج اور پت سے
ہٹ اس رٹ کو تج رے

گاڑی کے اندر مسافروں کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحثوں کے درمیان میرے اندر اجنبیت کا احساس بڑھ جاتا تھا کیونکہ میں ان میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ کوئی مسافر مجھے مخاطب کرکے اپنی بات کہتا تو میں خاموش نظروں سے ہی تاکتا رہ جاتا تھا اور آغا سہیل اور بیگم سہیل کو مسکراتا ہوا ہی پاتا تھا۔ جیسے وہ میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ جب ایک مسافر نے پالٹکس پر نہ بولنے کی توبہ کرتے ہوئے بھی پالٹکس پر ہی بولنا جاری رکھا اور کسی بات پر مجھ سے تائید بھی چاہی تو مجبوراً آغا سہیل نے میرا اس سے تعارف کرا دیا اور وہ میرے ہندوستانی ہونے کے انکشاف سے اچانک چپ ہو گیا۔ میرے پاس بیٹھا ہوا ایک اور نوجوان جو کتنی دیر سے مجھ سے عرش صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ 'پاؤں کفن سے باہر' مانگ کر پڑھ رہا تھا، چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یک بہ یک ایسا محسوس ہوا جیسے کوروؤں کی بھری سبھا میں دوشاشن نے دروپدی کی دھوتی کا پلو کھینچ لیا ہو۔ لیکن اس نوجوان کے چہرے پر حیرت کی جگہ فوراً مسرت نے لے لی اور وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر بولا۔ "مجھے ایوب شاذب کہتے ہیں۔ میں آپ کا فین ہوں، آپ کب آئے۔؟ کہاں ٹھہرے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔

ہم دیر تک ادب، فلم اور کرکٹ کے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ یہ سارے موضوعات اُسی نے یکے بعد دیگرے چھیڑ دیئے تھے۔ ہندوستان کی امپائرنگ کی بھی اُس نے شکایت کی۔ ہماری گاڑی اتفاق سے والٹن ٹریننگ اسکول کے سامنے کافی دیر تک رُکی رہی جہاں سے اسکول کی بارکیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ۱۹۴۴ء۔ ۱۹۴۵ء میں پانچ ماہ تک میں نے اسی اسکول میں ریلوے کی کمرشیل ٹریننگ حاصل کی تھی اور ایک بار ایک لڑکے کو ننگا کر دینے کے جرم میں ہم سولہ لڑکوں کو پکی بارکوں سے راتوں رات نکال کر اُن کچی بارکوں رہنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا جو اسکول کی عمارت سے کافی دور ہیں۔ ہمیں اپنی من من بھر کتابوں

www.taemeernews.com

کا بوجھ اور ٹرنک اور بستر خود ہی سر پر لاد کر آنا پڑا تھا۔ لیکن شرارتوں کا سلسلہ جو یہاں بھی جاری رہتا تھا۔ اسی بارک میں رہتے ہوئے مجھے کرشن چندر کا پونا سے میرے پہلے خط کا جواب موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا "زندگی کی جد و جہد سے گھبرا جانا غیر افادی ہے"۔ اُن کے اس خط کا اقتباس میں نے اپنے دوسرے مجموعے "انقلاب آنے تک" میں ۱۹۴۹ء میں چھاپا تھا۔ میں نے آغا سہیل کو بتایا کہ میں ہر سنیچر کی سہ پہر کو والٹن سے کافی پیدل چل کر شاہ راہ پر پہنچ جاتا تھا اور وہاں سے ادمنی بس پکڑ کر لاہور چلا جایا کرتا تھا۔ ایوب صاحب نے کہا آپ چاہیں تو ہم اب بھی گاڑی چھوڑ کر پیدل چل سکتے ہیں۔ اب بھی وہیں سے بس مل جائے گی اور ہم گاڑی سے بہت پہلے لاہور پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم نے گاڑی لاہور چھاؤنی جا کر چھوڑی، جب اس نے آگے چلنے کا خاصی دیر تک نام نہ لیا۔ سڑک پر جا کر ہم نے دو آٹو رکشا پکڑے اور ایوب شاذب مجھے آغا سہیل کے گھر پر چھوڑ کر واپس گیا۔ رکشا کا کرایہ بھی اُس نے مجھے نہیں دینے دیا۔

چار بج چکے تھے۔ ہم لوگ جلدی جلدی تیار ہو کر الفلاح جانے کے لئے پھر باہر آ گئے۔ آغا سہیل اور میں۔ راستے میں اُردو اور پنجابی کے شاعر اور اسلامیہ کالج کے لیکچرار گلزار دفا چوہدری مل گئے۔ وہ بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ جس نہر کے کنارے پرائیف سی کالج اور دوسری نئی کالونیاں آباد ہیں وہاں نہانے کے لئے میں اپنے دوستوں کے ساتھ قلعہ گوجر سنگھ سے آیا کرتا تھا۔ چالیس سال پہلے۔ وہاں تیرنا سیکھتے ہوئے ایک بار میں ڈوبتے ڈوبتے بچا تھا۔ میں اِردگرد کی عمارتیں اور سڑکیں ایک عجیب سی حیرت اور جذباتی تعلق سے دیکھتا جا رہا تھا۔ چیفس کالج، لارنس گارڈن (اب جناح گارڈن) چڑیا گھر اور چیرنگ کراس۔ پلازا سینما کی عمارت اب بہت معمولی اور چھوٹی نظر آئی۔ شاید اس لئے کہ اب میں جدید طرز کے بڑے بڑے سینما ہاؤس دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ یہاں میں نے آخری فلم دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں باڈی سنیچرز دیکھی تھی جس میں ایک شخص ایک سائنس داں کے لئے قبرستان سے تازہ دفن کی ہوئی لاشیں نکال نکال کر لے آتا تھا۔ سینما گھر میں انگریز اور امریکی فوجیوں کی بڑی بھیڑ رہا کرتی تھی۔ سامنے وہی اسمبلی ہاؤس تھا

جس کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماسٹر تارا سنگھ نے تلوار نکال کر کہا تھا۔ پاکستان ہماری لاشوں پر بنے گا۔ ایک بڑے لیڈر کی بڑی غلطی سے ہزاروں زندہ اور خوبصورت انسان لاشوں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اگر اس نے ایسا نہ کہا ہوتا تو شاید دو مملکتیں بڑے پرسکون حالات میں وجود میں آئی ہوتیں اور شاید آبادی کا تبادلہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوا ہوتا۔ اور شاید میں ماسٹر تارا سنگھ کی ہی وجہ سے لاہور میں رہنے سے محروم ہو گیا تھا۔ تاریخ چھوٹے چھوٹے چہرے ہمیشہ بھول جاتی ہے، وہ بڑے چہروں کو ہی یاد رکھتی ہے۔

نیشنل سنٹر میں انتظار حسین کے ناول "بستی" پر ہونے والی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسعود اشعر اپنا مقالہ پڑھنے میں مصروف تھے، میری آمد کی وجہ سے ایک آدھ منٹ کے لئے انھیں رُک جانا پڑا۔ کشور ناہید نے میرے پاس آکر میرا سواگت کیا اور مجھے آگے دوسری قطار کی ایک خالی کرسی پر بٹھا کر ڈائس پر لوٹ گئی۔ مسعود اشعر نے اپنے ہم عصر افسانہ نگار پر پھر سے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ میں نے ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ انتظار حسین کو تو میں نے فوراً پہچان لیا۔ ہم دونوں نے ہاتھ اٹھا کر ایک دوسرے کے ساتھ علیک سلیک بھی کر لی۔ آغا سہیل کو بھی میرے برابر کرسی مل گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا جلسے کی صدارت ڈاکٹر آفتاب احمد کر رہے ہیں اور ان کے پاس تیسرے شخص سویرا کے مدیر صلاح الدین محمود بطور پبلشر براجمان ہیں۔ میں لاہور کے اہلِ قلم حضرات کے اتنے بڑے اجتماع میں آزادی کے بعد پہلی بار شریک ہوا تھا۔ اس لئے میں مسرت اور جذبات کی ملی جلی کیفیت میں مسعود اشعر کے خیالات سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ تاریخ ان لوگوں کے لئے اپنے آپ کو دہراتی ہے جو اُسے فراموش کر دیتے ہیں۔ اور ناسٹیلجیا انتقام کی ایک شکل ہے اور انتقام ناسٹیلجیا کی۔ دونوں صورتوں میں ہم کسی ایسی شے کے متلاشی ہوتے ہیں جو ہمیں پسپائی سے بچا لے۔ جس وقت ہم وہ زمانے اور وہ مقام یاد کرتے ہیں جہاں ہم محفوظ تھے اور کہتے ہیں ع

www.taemeernews.com

پہلے جو زیرِ قدم تھیں اب وہ گلیاں دل میں ہیں

تو دراصل ہم اپنے بے رحم اور ظالم حال سے انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔"

کشور ناہید نے میرے پاس آکر پوچھا: "آپ بھی کچھ کہیں گے؟" میں نے جواب دیا: "ناول تو میں نے نہیں پڑھا انتظار حسین کی افسانہ نگاری کے بارے میں چند جملے ضرور کہہ دوں گا۔ لیکن ابھی کچھ اور لوگوں کو بھی سننا چاہتا ہوں۔"

انور سجاد کی اسٹیج پر آمد بھی لاہور کے بعض لوگوں کو پریشان کر سکتی ہے، اس کا احساس مجھے ان کے یکایک پہلو بدل لینے سے ہوا۔ بقول شخصے وہ فقرے مارنے اور جملے پھینکنے میں بڑا ماہر ہے۔ اس نے اپنے مقالے کے آغاز میں ہی نقادوں کے آئندہ استفادے کے لئے کچھ ضروری نوٹس مہیا کر دیئے، اور پھر انتظار حسین کی ماضی پرستی پر یوں تبصرہ کیا: "انتظار کی طبیعت میں جو گریہ ہے وہ ناول میں پوری طرح کارفرما ہے۔ اس میں وسطی ہند کی تہذیب کو وادیٔ سندھ کی تہذیب میں پیوست کرنے کی کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا خواب خالی خولی تذکرہ اور یادِ ماضی سے پورا نہ ہوگا اور نہ ہی ماتم کرنے مایوسی پھیلانے یا بے عمل ہونے کا کوئی فائدہ ہے۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے فن صرف حقیقت کا عکاس بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ نئی حقیقت کو جنم بھی دیتا ہے' یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ ہم تینتیس سال بعد بھی اپنے تشخص کی تلاش میں ہیں۔ لیکن یہ تلاش انہی لوگوں کو ہے جو ذمہ داریوں سے فرار کا بہانہ چاہتے ہیں' لیکن اس فراریا بزدلانہ انداز کی بجائے معاشرتی اور معاشی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتظار بہت کایاں ہے وہ اپنی خوف زدگی کو سکوت میں بدل دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی بے زبانی کو زبان سمجھ لیا جائے۔'

جیلانی کامران نے ناول کے ہر کردار کو قوتِ ارادی سے محروم بتایا۔ اور اُردو کی امریکی ادیبہ فرانسس پریچٹ نے امریکہ میں انتظار حسین پر ہونے والے کام کا مژدہ سنایا۔ کشور ناہید نے جب مجھے بلانے سے پہلے یہ کہا۔

www.taemeernews.com

'آج ہمارے درمیان ایک ایسا افسانہ نگار آیا ہے جسے ہم تیس تینتیس سال سے پڑھتے آرہے ہیں، تو میں قدرے جذباتی ہو گیا۔ جب میں ڈائس پر گیا تو لاہور کے اہلِ قلم واقعی زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ اور یہ گڑگڑاہٹ جو اپنے سابق وطن میں لوٹتے ہی میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی میرے اندر عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ میرے ایک طرف انتظار حسین تھے جس کی تمام تر افسانہ نگاری میری ہم سفر بنی رہی تھی اور اس کے وہ سارے تجربات بھی میرے سامنے تھے جو اس نے افسانے کے فارم، اسلوب اور فکر کو بدلنے کے لئے کئے تھے۔ میں اس بات سے بھی باخبر تھا کہ وہاں اس کے ایسے نقاد موجود تھے جو اس کی ماضی پرستی کو ہندوستان کی محبت سے جوڑ دیتے تھے جس سے دو قومی نظریہ کو ضعف پہنچتا تھا۔ میں نے پہلے تو اس بات کے لئے معافی مانگی کہ میں گلا خراب ہونے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے بول نہیں پا رہا تھا۔ اور اس سلسلے میں اس خدشہ کا بھی اظہار کر دیا کہ شاید بلراج مینرا نے انور سجاد کو میری پاکستان یاترا کے بارے میں پہلے سے لکھ دیا تھا کہ میں وہاں بولنے نہ پاؤں۔ اسی لئے انور سجاد نے مجھے جو دعوتی تھی اس سے مجھے ابھی تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ انور سجاد نے پیچھے کی ایک صف میں اٹھ کر کہا۔ "میں نے آپ کو ملتان کی دعوتیں اڑانے سے بھی منع کیا تھا!" حاضرین کے قہقہے رُکے تو میں نے انتظار حسین کے دفاع میں کہا۔ "میں ماضی کے اس کرب سے واقف ہوں جسے انتظار حسین اپنے شعور کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ میں تینتیس برس کے بعد لاہور لوٹا ہوں اور میرے اندر یہ شہر یکایک بیدار ہو گیا ہے جو درحقیقت کبھی سویا ہی نہیں تھا۔ میں اُردو افسانے میں انتظار کے اس کنٹری بیوشن سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسی نے ہمیں سکھایا ہے کہ ماضی کو فن کی سطح پر کس طرح پیش کیا جائے۔ اس ضمن میں وہ ہمارے آگے آگے چل رہا ہے۔ لیکن میں اس کا قبول راجندر سنگھ بیدی اُردو افسانے کا چودھری بننا پسند نہیں کروں گا کیونکہ چوہدری کو ادب میں یا تو طاق پر جگہ دی جاتی ہے، یا پھر اسے خود اپنے وجود کے لئے لڑتے رہنا پڑتا ہے۔ حیرت ہے کہ انتظار اپنی اس حیثیت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی کسی کے

www.taemeernews.com

ساتھ لڑتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ اُس کے نقادوں نے اس کے گرد ایک قلعہ سا تعمیر کر لیا ہے اور خود اپنی شناخت کے لئے اس کی حفاظت پر معمور ہو گئے ہیں ــــ انتظار حسین کو چاہیئے کہ وہ خود قلعہ کو توڑ کر ایسے نقادوں کے حصار میں سے باہر نکل آئے جن کی تنقیدیں اس کے ذہن کو چھو نہیں پائی ہیں۔ تعریف کا تجزیہ کرنا بھی خود ادیبوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ورنہ نئے لوگ انتظار حسین اور اُس کے نقادوں سے لڑیں گے ــــ"

جلسہ ختم ہونے کے بعد میں کتنے ادیبوں سے ملا اِس کی صحیح تعداد مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ تینتیس ۳۳ سال پہلے جب میں نے اِس شہر کو چھوڑا تھا تو میں قریب قریب نیا اور اجنبی تھا۔ اب وہاں سب لوگ مجھے جانتے تھے۔ عبادت بریلوی نے تو مجھے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ اور ابھی اُن سے بات بھی نہ کر پایا تھا کہ بے شمار لوگ آگے بڑھ آئے۔ طاہر تونسوی، صلاح الدین محمود، انتظار حسین، جیلانی کامران، امجد اسلام امجد، صفدر میر، مسعود اشعر، مظہر الاسلام، یوسف کامران، شہرت بخاری، امجد حسین، عبداللہ ملک، مستنصر حسین تارڑ، منو بھائی، ذوالفقار احمد تابش، سہیل احمد خاں، خدیجہ مستور، خلیر بابر، سائرہ ہاشمی، سجاد رضوی، قائم نقوی، سلیم اختر، اظہر جاوید، محمود احمد قاضی، سید قاسم محمود، عطاء الحق قاسمی، گلزار وفا، احمد مشتاق، غالب احمد، حسن رضوی، نکہت حسن اور کشور ناہید تو ہر کہیں تھی، اِدھر سے اُدھر بڑی بے تابی سے آجا رہی تھی۔ سب کو چائے پلاتی پھر رہی تھی۔ اور پھر اُس نے مجھے سب سے الگ کر کے اپنے دفتر میں پہنچا دیا جو اُسی فلور کے ایک کونے میں بنا ہوا ہے۔ وہاں کچھ اور بھی ادیب بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ فیض احمد فیض کی بیٹی منیزہ، خدیجہ مستور، بیگم انتظار حسین اور صلاح الدین محمود۔ ایم آر کانجو نے وہیں آکر مجھ سے پوچھا کہ میں میاں والی کب پہنچ رہا ہوں تاکہ وہ وہاں شہر کے لوگوں کو میری آمد کی خبر دے سکیں۔ اُس نے کہا کہ پورا شہر میرے استقبال کے لئے اسٹیشن پر اُمڈ پڑے گا۔ میں بڑی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ میرے شہر کا ہی ایک نوجوان تھا جسے اخبارات اور دوستوں کے نام بھجوائے ہوئے میرے خطوط سے میری لاہور میں آمد کی اطلاع

www.taemeernews.com

ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "میں آج رات میاں والی جا رہا ہوں"۔ میں نے اُسے اُٹھ کر گلے سے لگایا، دوکان میں کہا میں چند روز میں اس کا فیصلہ کر لوں گا۔ اور تار کے ذریعے اطلاع دے دوں گا۔

وہ شکریہ ادا کر کے مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر آغا سہیل مجھے کچھ اور لوگوں سے ملانے کے لئے باہر لے گئے اور پھر وہاں سے طاہر تونسوی اپنے دوستوں سے ملانے کے لئے کھینچ لے گئے۔ جن چہروں کو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا یا کبھی کبھار اُن کی تصاویر ہی کتابوں یا رسالوں میں دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ اب انھیں اپنی آنکھوں سے اپنے بہت قریب کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اور خوش ہو رہا تھا۔ وہ بھی ویسی ہی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن میری آنکھیں احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، محمد طفیل اور احراز نقوی اور ابصار عبدالعلی کو اور کئی دوسرے لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں میں نے کس سے پوچھا اور کس نے مجھے جواب دے دیا۔ قاسمی صاحب آئے تھے۔ آپ ہی سے ملنے کے لئے۔ لیکن ہال بھرا ہوا دیکھ کر چپکے سے لوٹ گئے۔"

آغا سہیل پھر میرے قریب آئے تو میں نے ابصار کے بارے میں پوچھا۔ بولے "اِس وقت وہ ٹی وی پر نیوز سنا رہے ہوں گے۔"

کشور ناہید مجھے بھیڑ میں سے نکال کر باہر لے گئی، اور اپنے میاں یوسف کامران کی موٹر میں دھانس دیا۔ اسی میں صلاح الدین محمود اور مسعود اشعر پہلے سے موجود تھے۔ وہ آغا سہیل کو بھی ڈھونڈھ کر لے آئی اور موٹر گلبرگ کی طرف دوڑنے لگی۔ رات پوری طرح جگمگا رہی تھی۔ لاہور کی اس جگمگاہٹ سے میں پہلے ہی واقف تھا لیکن اب یہ کچھ زیادہ ہی دل نشیں اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ سڑکیں اور زیادہ فراخ اور سایہ دار ہو گئی تھیں۔ لاہور شہر دلّی کی طرح ہر طرف پھیل گیا تھا جدھر جدھر اس کے سینگ سمائے تھے۔ خدا جانے اس نے کتنے کھیت اور گاؤں نگل لئے تھے۔ شہروں کا اژدہا اسی طرح آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

صلاح الدین محمود کو اپنے گھر سے پاؤڑوں کا تسلہ اٹھانا تھا۔ جو اُن کی بیگم نے خاص طور سے کشور ناہید کے ہاں ہونے والی دعوت کے لئے تیار کر رکھے تھے

www.taemeernews.com

راستے میں صلاح الدین صاحب سہگل اور نیو تھیٹرز کی اُن فلموں کا ذکر کرتے گئے جنھیں وہ اور میں اپنی نوجوانی کے زمانے میں دیکھ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے تو کئی فلمیں لاہور ہی میں رہتے ہوئے دیکھی تھیں۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان لیکن انھوں نے علی گڑھ اور دہلی میں دیکھی تھیں۔ کچھ ایک کے صرف نام سُن رکھے تھے۔ انھیں سہگل اور پنکج ملک کی آواز اور آر سی بورال اور تمرین کا میوزک بہت پسند تھا۔ انھوں نے بتایا لاہور میں ایک شخص ہے جو ہر سال ۱۸ر جنوری کو سہگل کی برسی مناتا ہے۔ اور کئی دوستوں کو بلاتا ہے۔ اس کے پاس سہگل کا ہر ایک گراموفون ریکارڈ اور چھپی ہوئی ہر ایک خبر موجود ہے۔ کوئی شخص اگر اُسے سہگل کی بارے میں نئی کتاب یا اخبار کا پرانا تراشا ہی دے جائے تو وہ منہ مانگے داموں خرید لیتا ہے۔

تھوڑی سی دیر کے لئے ہم لوگ صلاح الدین محمود صاحب کے گھر رُکے تو وہ ہمیں اپنے اسٹڈی روم میں لے گئے جو ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا تھا ہندو ازم کے علاوہ دنیا بھر کے مذاہب پر اُن کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا نیرد چودھری کی تازہ ترین کتابیں اُن کی ٹیبل پر رکھی تھیں۔ انھوں نے اپنی بیگم سے بھی ملایا اور پھر ہم اقبال ٹاؤن کی طرف چل پڑے۔

اقبال ٹاؤن میں کشور ناہید اور یوسف کامران رہتے ہیں۔ اپنے ایک خوبصورت اور اسٹائلش مکان میں۔ وہاں چالیس کے قریب وہی ادیب اور شاعر جمع تھے جن سے میں نیشنل سنٹر میں تھوڑی دیر پہلے مل چکا تھا۔ اُن سب سے پھر سے ملانے میں نہ کشور ناہید نے کوئی قباحت سمجھی نہ میں نے۔ کشور نے اپنے دو جوان سال بیٹوں سے بھی ملایا جو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگوتے پھرتے تھے جہاں چالیس کے قریب اہلِ قلم جمع ہوں وہاں کسی ایک موضوع پر کیوں کر بات ہو سکتی تھی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے ہر شخص سے مل لیتا تھا۔ انتظار کی بیوی نے بتایا وہ بنارس کی رہنے والی ہیں۔ میں نے ان دونوں سے کہا جب وہ دہلی آرہے ہیں تو لکھنو اور بنارس بھی ہو لیں۔ انتظار کی خواہش تو ایلورا اور

www.taemeernews.com

اجنتا بلکہ پورا ہندوستان گھومنے کی تھی۔ فرانسس پریچٹ امریکہ سے آنے والی ایولین اور لنڈا سے واقف تھیں۔ عبداللہ ملک احتساب کے مدیر ہیں اور مشہور کمیونسٹ دانشور۔ ایسا لگا وہ ایسے اجتماعات میں صرف زور زور سے قہقہے ہی لگاتے ہیں۔ فیض صاحب کی بیٹی منیزہ کسی تعلیم گاہ میں پڑھاتی ہیں۔ پہلے تو منّو بھائی کی مزاحیہ شاعری سے لوگ محظوظ ہوتے رہے پھر جب خواتین نے فیض کی نظمیں مل کر گائیں تو محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ انور سجّاد بھی اس وقت تک پہنچے تھے۔

اُس محفل میں میں نے کشور ناہید کو بڑے فرّاٹے سے پنجابی بولتے ہوئے سنا۔ یہی یقین ہوا کہ وہ جنم سے پنجابی ہیں۔ لیکن انھوں نے بتایا وہ دراصل بلند شہر کی ہیں۔ پنجابی کو انھوں نے مادری زبان کی طرح قبول کر لیا ہے۔

رات ایک بجے آغا سہیل اور میں واپس آ گئے۔ انور سجّاد کی گاڑی میں۔ اب یہ ناممکن تھا کہ کچھ دیر انور سجّاد کے ساتھ بیٹھتے اور افسانوں پر بات کرتے۔ اس بات کو پھر کسی شب کے لئے اٹھا رکھا گیا۔

www.taemeernews.com

پنجابی عوام ـ کھُلی کِتاب

۴

گیارہ فروری ۱۹۸۰ء کی صبح سات بجے آغا سہیل نے جگایا۔ تینتیس سال کے بعد پہلی بار مجھے کسی نے لاہور میں جگایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں میں ہر نئے دن کو ماضی کے ساتھ جوڑ کر یاد کرتا ہوں۔ ! جلدی سے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ جس بستر پر میں رات کو سویا تھا اُسی پر بیٹھا اب چائے پی رہا تھا۔ میرے پاس ہی آغا سہیل بیٹھے چائے پی رہے تھے اور اخبارات کے صفحے اُلٹ رہے تھے۔ پاکستان ٹائمز اور مشرق کے۔ اُن کا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ تو یہاں بھی میں

www.taemeernews.com

رات بھر کتابوں کی خوشبو ہی سے بسے ہوئے کمرے میں سویا رہا ہوں۔ آغا سہیل نے پوچھا: نیند آئی، میں نے جواب دیا۔ خوب۔۔!

بولے۔ "کل انور سجاد کا مقالہ کیسا لگا تھا؟۔۔"

جواب دیا۔ "دلچسپ۔ بہت ہی دلچسپ۔ انتظار حسین، اور انور سجاد دونوں اچھے جملے باز ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انتظار صرف ادبی کالموں میں اس قسم کی زبان لکھتا ہے جب کہ انور سجاد اپنی تنقید کو اس سے سجانا پسند کرتا ہے۔ مثلاً کل جب اُس نے کہا کہ میں نے یہ نوٹ 'بستی' پڑھ کر 'اَن ٹچ' لکھے ہیں تاکہ یہ بے ربط نوٹ کسی سکّہ بند نقّاد کے ہاتھ لگ جائیں تو اُسے ایک اچھا مضمون لکھنے کا موقع مل جائے۔ تو مجھے بہت ہنسی آئی۔"

"لیکن آپ اُس وقت ہنس تو نہیں رہے تھے۔؟"

"ہاں لیکن میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔۔"

"آپ بھی انور سجاد کی طرح نقادوں سے خفا معلوم ہوتے ہیں۔۔"

"کیا ہمیں اس کا حق نہیں ہے اگر وہ اُلٹی سیدھی تحریریں لکھیں تو ہم بھی کچھ کہہ سکیں! وہ بھی ہمارے کمزور افسانوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔۔!"

اُسی وقت سیّد قاسم محمود کا فون آگیا۔ میں نے اُس سے کہا فوراً آجاؤ۔ آغا سہیل کے بیٹے محسن آغا نے آکر بتایا کہ مجھے پولیس آفس بھی جانا ہوگا۔ اپنی آمد کی رپورٹ درج کرانے۔ اس کام کے لئے اُس نے اپنے دوست اُسامہ عباسی کو بلا رکھا تھا جو اسی وقت کالج سے کر آبھی گیا۔ طے یہی پایا کہ باقی ہر کام سے پہلے پولیس سے ضرور نپٹ لیا جائے ورنہ دھڑکا لگا رہے گا۔ لاہور میں غیر قانونی طور پر موجود ہونے کا۔ جلدی جلدی شیو بنا کر اور بھابھی کے ہاتھوں سے بنا یا ہوا لکھنوی ذائقے کا ناشتہ کر کے محسن اور عباسی کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اس طرح راستے میں کئی پرانی سڑکیں اور باغات اور عمارتیں بھی دیکھ لیں۔ مال روڈ، جی پی او، مسجد شہدا ۔۔ یہ نئی تھی جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہید ہونے والے فوجیوں کی یاد میں مال روڈ پر بنائی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ہزاروں فوجی یاد آگئے جنھوں نے سرحد کے دونوں اور

www.taemeernews.com

اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ آگے پرانی انارکلی، گول باغ تھا جس کا پہلے نام ماہر ناصر باغ رکھا گیا تھا۔ جب مصر کے جمال عبدالناصر سے تعلقات بگڑ گئے تو اس کا نام بدل کر الفیصل باغ رکھ دیا گیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے کی بھنگیوں کی مثل کی تاریخی توپ جوں کی توں ایک چوراہے پر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن نئی نسل کے بچوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عجائب گھر کے پاس سرگنگا رام اسپتال بھی اپنے اصلی نام کے ساتھ موجود تھا۔ اگرچہ اس کی قدآور مورتی وہاں موجود نہیں تھی، جس کے بارے میں منٹو نے 'سیاہ حاشیے' میں ایک لطیفہ بھی بیان کیا تھا کہ اس بت کو توڑنے کی کوشش میں اونچائی سے گر کر زخمی ہونے والا شخص علاج کے لئے اسی سرگنگا رام اسپتال میں لے جایا گیا تھا۔ شاید اسی واقعہ کے بعد پاکستان کا ضمیر اس اسپتال کا نام بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔

پولیس میں آمد کی رپورٹ لکھوا کر میں نے دونوں لڑکوں سے کہا کہ وہ واپسی کے لئے ذرا قلعہ گوجر سنگھ کا راستہ اختیار کر لیں۔ تاکہ میں اس مکان کی ایک جھلک دیکھ لوں جہاں میں آخری بار رہا تھا۔ جہاں میں قائداعظم محمد علی جناح کی ایک بہت بڑی تصویر دیوار پر لٹکتی ہوئی چھوڑ آیا تھا۔ جہاں میرا چھوٹا سا کمرہ اردو کے رسالوں ساقی، ادبی دنیا، ادب لطیف۔ نیرنگ خیال، شاہکار، خیام، ہمایوں کے علاوہ نئے زاویے، طلسم خیال، صحرا نورد کے خطوط، منٹو کے افسانے، ضدی، کلیاں اور کئی کتابوں سے بھرا تھا۔ اسی مکان کے نیم اندھیرے کمرے میں میں نے اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منایا تھا اور ہماری پہلی بیٹی شیل نے اسی مکان کے اندر بولنا اور گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ اسی مکان کے اندر میں نے ایک روز اچانک فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پاکستان کا شہری بنوں گا۔ لیکن دن بہ دن بڑھتے ہوئے فسادات کی وجہ سے اپنی بیوی اور بچی کو نواں شہر دوآبہ جا کر چھوڑ آنے کے لئے ۲۰ اگست کو اچانک چل دیا تھا اور پھر واپس نہیں آ سکا تھا۔ جب کہ میں نے اب تک واپسی کا ریلوے پاس اپنے پاس سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔

لڑکوں نے میری خواہش کے مطابق گاڑی نیلا گنبد سے نکال کر میکلوڈ روڈ پر

www.taemeernews.com

ڈال دی۔ دیواروں پر جابجا کالے پینٹ سے نعرے لکھے ہوئے نظر آئے۔ "افغانستان افغانستان ــ روس کا نیا قبرستان" میں ایسے وقت میں پاکستان پہنچا تھا۔ جہاں ہر شخص افغانستان کے مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت نے ایران کے روزمرہ کے واقعات پر پردہ سا ڈال دیا تھا اور لوگ ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھے

میکلوڈ روڈ سے گزرتے ہوئے مجھے ریجنٹ سینما کی عمارت نہیں دکھائی دی جہاں سہراب مودی کی تاریخی فلم پکار جب وہاں ریلیز ہوئی تھی تو وہاں پلائی وڈ سے جہانگیر کا پورا محل بنا دیا گیا تھا۔ اس عمارت کو گرا کر وہاں نیا سینما گھر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح وہاں پیلس سینما کی عمارت بھی موجود نہیں تھی جہاں جیلر، آدمی، زمیندار اور چترلیکھا جیسی فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ کرشن چندر کی فلم سرائے کے باہر بھی اسی سینما گھر میں دکھائی گئی تھی۔ میکلوڈ روڈ کے چوراہے سے عبدالکریم روڈ کی طرف گھومتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے یہ سڑک کچھ سکڑ سی گئی ہے۔ آس پاس کے دونوں طرف کے مکان بھی جیسے ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہوں۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ پہلے جیسی تھی۔ لیکن مجھے وہ دوکان نہیں ملی جہاں سے میں شیونگ کریم، بلیڈ، صابن اور کبھی کبھی نئے ڈیزائن کی ٹائی بھی خرید لیا کرتا تھا۔ وہاں اب خراد کی دو بڑی بڑی مشینیں چل رہی تھیں اور تیل کے دھبوں سے داغ دار کپڑے پہنے ہوئے کچھ مستری اور مُنڈے کام کر رہے تھے۔ اور جس دوکان سے پہلی بار ادب لطیف خرید کر میں احمد ندیم قاسمی کے نام سے آشنا ہوا تھا اور وہاں سے میں اکثر ادبی رسالے خریدنے لگا تھا۔ وہ بھی نہیں ملی۔ سائن بورڈ بدل چکا تھا اور اس کے ٹھیک سامنے سردار حکم سنگھ کے مرحوم بھائی کے مکان کے بیرونی کمرے پر اب ڈاکٹر عبدالرشید کا بورڈ آویزاں تھا کبھی یہی کمرہ میرے قبضے میں ہوا کرتا تھا جس کا میں دس روپے مہینہ کرایہ ادا کیا کرتا تھا اس کے ساتھ اندر جانے والا ڈیوڑھی کا راستہ کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح اندھیرا اور ڈراؤنا لگا۔ میرا دل اچانک دھک سا رہ گیا۔ کار وہیں رُکوا لی تھی لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ باہر آ کر اس کے اندر جانے کی اجازت مانگوں۔ لڑکوں نے پوچھا بھی "چچا اندر نہیں چلیں گے؟" لیکن میں نے کہا۔ "نہیں گاڑی آگے بڑھاؤ۔ میں پھر کسی وقت آؤں گا۔ اکیلے"

www.taemeernews.com

لڑکے کچھ نہ سمجھ سکے۔ گاڑی آگے بڑھ گئی اور پھر امرت پارک، ایبٹ روڈ، اور شملہ پہاڑی کے پاس سے ہو کر ایف سی کالج کو لوٹ گئی۔

میں نہیں بتا سکتا اُس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے اس مکان کے اندر جانے کی خواہش کیوں پوری نہیں کی جو آزادی کے بعد سے میری یادوں کا حصہ بنا رہا ہے۔! اسے دیکھ کر مجھے یک بیک ایک دھنسی ہوئی قبر کا دھیان کیوں آیا تھا؟ شاید ماضی میرے لئے ایک قبرستان ہی بن چکا ہے۔ اس میں میری یادوں کے مرکز اب قبروں کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور میں کسی دھنسی ہوئی قبر کو دیکھتے ہی دل گرفتہ ہو جاتا ہوں۔

قیام گاہ پر پہنچا تو سید قاسم محمود آ چکے تھے۔ ایک دوسرے سے خوب گلے ملے۔ بھینچ بھینچ کر ملے۔ معلوم ہوا ڈاکٹر وزیر آغا اور انتظار حسین کے فون آئے تھے۔ وزیر آغا صاحب سرگودھا سے لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اور دو بجے تک مجھ سے ملنے آجائیں گے۔ انتظار حسین نے تین بجے آنے کا پیغام دیا تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر کے لئے گلبرگ میں چھوٹی موٹی شاپنگ کے لئے نکل گئے۔ میں لکھنؤ اور امرت سر کے درمیان اپنی بیانوں اور جانگیوں کا پیکٹ گرا آیا تھا۔ ایک دوکان پر جا کر یہ ضروری چیزیں خریدیں اور دو اُردو کے رسالے کرکٹ سے متعلق بھی خریدے۔ اخبار وطن کے جن میں بھارت پاک کے حالیہ کرکٹ ٹسٹ میچوں پر مضامین چھاپے گئے تھے۔ ایک لڑکے عمران رزاقی کی نظم کے یہ شعر پاکستان کی نئی نسل کے ترجمان لگے ؎

دِل دِل چھین کے لے جائیں گے اہلِ ہندُستان سے
آئے ہیں مہمان تمہارے دیکھو پاکستان سے
مانا کہ تم کھیل چکے ہو آندھی اور طوفان سے
لیکن بچّو، بچ کے رہنا تم میرے عمران سے

جب تک محسن مارکیٹ سے گوشت خریدتے رہے۔ سید قاسم محمود اور میں سگریٹ تلاش کرتے پھرے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پاکستان کی کونسی سگریٹ میرے گلے کے لئے ٹھیک ہو گی۔ سید قاسم محمود کو میں چھٹی دہائی سے جانتا تھا

www.taemeernews.com

ان کی افسانہ نگاری کی وساطت سے۔ جب ان کا ایک شاہکار افسانہ "قاسم کی مہندی" ادب لطیف میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد تو وہ ادبی منظر سے بطور افسانہ نگار قریب قریب غائب ہی ہوگیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ اشاعتی میدان میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ کئی کتابوں چھاپ چکے ہیں۔ اُردو میں مذہبی اور تاریخی اور سائنسی انسائیکلو پیڈیا اور ناول اور کئی دوسری طرح کی سیریز۔ آج وہ میرے لئے منٹو نمبر، کرشن چندر نمبر اور عصمت چغتائی نمبر لے کر آئے تھے۔ اپنے مکتبہ شاہکار کے۔ انھوں نے ٹھیک ہی کہا اگر میں نے افسانہ نگاری چھوڑ نہ دی ہوتی تو یہ سب کام کوئی دوسرا ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ یہ سب بھی میرے ہی تخلیقی ذہن کی اُپج تھی۔ لیکن قاسم اس بات کے لئے بھی تیار نظر آیا کہ وہ اب پھر سے افسانے لکھا کرے گا۔ اس کے اندر کا افسانہ نگار آج زندہ ہوگیا ہے۔

سید قاسم محمود کے جانے کے بعد الیف سی کالج کے کچھ لڑکے آگئے۔ خرم اقبال، اقتدار حیدر، شہزاد اقبال، محمد اکبر، ملک مجید وغیرہ۔ وہ سب محسن کے دوست تھے، مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ملے تو دیر تک ہندوستان، ہندوستانی فلموں، کرکٹ میچوں اور ہندو پاک دوستی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ فروری کی گنگنی دھوپ میں نہائے ہوئے لان پر۔ آغا سہیل وقفے وقفے سے کالج میں پریڈ لے کر لوٹ آتے تھے۔ لیکن یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کالج میں پڑھانے چل دیتے تھے یا گھر کے اندر ہی ٹہل کر لوٹ آتے تھے۔

لڑکے ہندوستانی فلموں کے بڑے مداح تھے۔ ہندوستانی کرکٹ کھلاڑیوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات حیرت ناک حد تک صحیح تھیں۔ لیکن وہ ہندوستانی امپائرنگ کے بارے میں مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا یہ ہندوستان کی شاندار بیٹنگ اور باؤلنگ کی صلاحیتوں پر داغ تھا۔ وہ سب آزادی کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بارے میں ان کے ذہنوں میں بہت سی غلط فہمیاں موجود تھیں۔ جو اب فلموں اور ہندوستان سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے دور ہو رہی تھیں۔ مجھے اپنی ہی طرح پنجابی اور اُردو بولتا ہوا اور پاکستانی کرکٹ کھلاڑیوں کی تعریف

www.taemeernews.com

کرتا ہوا دیکھ کر وہ بہت خوش نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے وہ خود ہندوستان جاکر وہاں کے شہروں کو دیکھیں اور نئی نسل کے لوگوں سے یونیورسٹیوں اور لائبریریوں، اور کافی ہاؤسوں اور سینما ہالوں اور کھیل کے میدانوں میں ملیں۔ اس کے لئے میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور مشورہ دیا کہ وہ چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر آئیں اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کا دروازہ بھی کھٹکھٹائیں۔

ڈھائی بجے کے قریب ڈاکٹر وزیر آغا آگئے۔ اُن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اگرچہ قلمی رشتے سے بیس برس سے شناسائی تھی۔ جب سے وہ ادبی دنیا کے پانچویں دور میں مولانا صلاح الدین (مرحوم) کے ساتھ بطور مدیر شریک ہوئے تھے۔ ادبی دنیا تو بند ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنا ذاتی رسالہ اوراق نکالتے ہیں۔ میں ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کے علاوہ اُن کی شاعری، انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری کا بھی قائل ہوں۔ اُن کی تحریروں کے آئینے میں جو ایک شریف، متین، اور پروقار شخصیت کی جھلک ملتی تھی، وہ اب اسی شخصیت کے مالک بہ نفس نفیس گاڑی میں سے نکل کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ قریباً چھ فٹ لمبا قد، تپلا جسم، سر پر ہائٹ کیپ، سوٹ بوٹ میں۔ ایک ہاتھ میں چمڑے کا بریف بیگ اور دوسرا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ۔۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ جو وہ انشائیوں سے پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ بے اختیار بغل گیر ہو گئے۔ اور وہیں دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گذشتہ بیس برسوں پر پھیلی ہوئی باتیں۔ ادب اور ادبی شخصیات سے متعلق۔ جس طرح کوئی ایک طویل مدت کے بعد ملنے پر اپنے خاندان اور مکان اور عزیزوں کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ کون اب کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ کون کس کلاس میں پڑھتا ہے۔ ان کی شرارتیں اور تعلیمی معیار اور شوق اور اس قسم کی ہزار ہا باتیں۔ ہماری باتیں۔ ہندوستان و پاکستان کی نئی ادبی نسل کے متعلق تھیں۔ اور ان لوگوں کے بارے میں بھی جو اب زندہ نہیں تھے۔

تھوڑی دیر بعد انتظار حسین بھی آ گئے۔ ہم لوگ دھوپ کو ڈھلتا دیکھ کر اندر جا بیٹھے۔ آغا سہیل چائے کے انتظام میں لگ گئے۔ اب ہمارے درمیان جدید افسانے

www.taemeernews.com

پر باتیں ہونے لگیں۔ جدیدیت کی پہچان یہ ٹھہری کہ کون فارم کے نئے تجربوں کے علاوہ سادہ پیرایۂ بیان میں بھی جدید حسیت کا بیدار کر سکتا ہے۔ انتظار حسین جس قدر شوخ اور شریر اپنے کالموں میں جملے بازی کی وجہ سے نظر آتا ہے ویسا وہ حقیقی زندگی میں ہرگز نہیں ہے۔ اپنی افسانہ نگاری میں بھی نہیں۔ اس کی افسانہ نگاری اور شخصیت یکساں گمبھیر اور پر کشش ہیں۔ لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی آواز اُس آواز سے بہت مختلف یعنی کمزور ہے جو افسانے کی دنیا میں گونج رہی ہے۔ جیسے وہ دو الگ الگ شخصیتیں ہوں۔ باتوں باتوں میں سات بج گئے اور ہم سب ڈاکٹر وزیر آغا کی کار میں لاہور کی سیر کرنے کے لئے نکل پڑے۔ انتظار حسین دراصل میرا انٹرویو لینے کو آئے تھے 'مشرق' کے لئے۔ لیکن اُسے اگلے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ انٹرویو کے لئے دو آدمیوں کا تنہا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لاہور پہنچ کر تنہائی ہی میسر نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن میں خوش تھا کہ ہر وقت دوستوں اور جاننے والوں کے ہجوم میں گھرا رہتا تھا۔ میں خود ہی دراصل ہر شخص سے ملنے کا متمنی تھا۔ میں تنہائی پسند ضرور ہوں، لیکن ہمیشہ تنہائی میں رہ بھی نہیں پاتا۔ تنہائی جس حد تک سوچنے کی خوراک دے سکتی ہے اسے ہضم کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد پھر لوگوں سے ملنے کے لئے بے قرار ہو اٹھتا ہوں۔ لوگ صرف بولتے ہی نہیں اپنے چہروں کے پیچھے چھپے ہوئے رویے بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی بہت ہی سنجیدہ آدمی کے اندر سے اچانک بہت ہی ہنسوڑ اور بے تکلف انسان باہر آجاتا ہے۔ لاہور میں مجھے ابھی تک ڈاکٹر وزیر آغا ہی بے حد سنجیدہ معلوم ہو رہے تھے۔ جب کہ پنجابی مزاج بے تکلفی اور خوش مزاجی سے ہی عبارت ہے۔ میں تو پنجابی عوام کو کھلی کتاب کا نام دیتا ہوں۔ جو اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہے۔ ایک ایک ورق بنا چھوئے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

گاڑی ایف سی کالج کے احاطے سے نکل کر جیل روڈ کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ساری سڑکیں روشنیوں کے سیلاب میں نہائی ہوئی تھیں اور دو رویہ لگے ہوئے یوکلپٹس اور املتاس کے پیڑوں کی خوشبو اڑتی پھرتی تھی۔ میں نے اپنے پاکستانی دوستوں کو بتایا۔ ہمارے یہاں خصوصاً اتر پردیش میں بہت کم ادیب کھل کر قہقہہ لگاتے ہیں

www.taemeernews.com

بزرگ ادیبوں کو تو مسکراتا ہوا دیکھنے کے لئے برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً میں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی یا پنڈت آنند نرائن ملا کو کبھی قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے مسکراتے ہوئے کہا: "یہ دونوں بزرگ اپنے قہقہوں کا خزانہ جوانی میں لٹا چکے ہوں گے۔"

انتظار حسین جیسے جملہ پھینکنے کی گھات لگائے بیٹھے تھے فوراً بول اٹھے۔ "مجھے تو یقین نہیں آتا ان بزرگوں پر کبھی جوانی آئی بھی ہوگی۔!"

پل بھر میں گاڑی کی فضا قہقہوں سے بھر گئی۔ چونکہ کھڑکیاں کھلی تھیں اس لئے یقین ہے کہ ہمارے قہقہے باہر بھی ضرور پہنچے ہوں گے۔ کیونکہ بجلی کے تاروں پر بیٹھی ہوئی کئی چڑیاں پھر سے اڑ گئی تھیں اور سڑک کراس کرتے کرتے لڑکیوں کے ایک جھنڈ نے پلٹ پلٹ کر ہماری طرف دیکھا تھا۔!

آغا سہیل نے کہا:۔

"مجھے اب یاد کرنا پڑے گا، میرے استادوں میں کون کون ہنسنے کے فن سے واقف تھا۔ سید احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور یا ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔!"

میں نے جواب دیا:۔

"نقاد اگر ہنسنے کا فن سیکھ جائے تو پھر تنقید کرنا بھول جاتا ہے اس لئے وہ کبھی نہیں ہنستا ہے۔"

ہم سب پھر ہنس پڑے۔ "تو صاحبو! ثابت ہوا کہ تنقید ادب کی صحت کے لئے تو ضروری ہے لیکن یہ زندگی سے دور دور رہتی ہے۔"

"بزرگ افسانہ نگاروں میں میں نے صرف راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کو ہی زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے سنا ہے۔"

"وہ اس لئے کہ افسانہ نگاری بذاتِ خود کوئی سنجیدہ فعل نہیں ہے۔"

"لیکن حیات اللہ انصاری اور علی عباس حسینی نے قہقہگی کو چھوڑ کر سنجیدگی سے افسانے لکھے تو وہ دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جنت ملی نہ وصالِ صنم۔"

کار داتا گنج بخش کے دربار کے قریب پہنچی تو قہقہوں کے قمقمے اچانک بجھ گئے۔

www.taemeernews.com

ہم سب نے احتراماً سر جھکا کر باہر دیکھا اور پھر کار کا رُخ مینارِ پاکستان کی طرف گھما دیا گیا۔ وہاں اس روز بجلی کی روشنی نہیں تھی۔ لیکن چاند کی دھیمی دھیمی روشنی میں جدید طرز کا سفید مینار چمک رہا تھا۔ ہم لوگ کار سے اُتر کر دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مینار کے قریب پہنچے۔ ہر نئی قوم کی تاریخ میں کوئی نہ کوئی بڑا نشان ضرور ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اس مینار پر پاکستان کے قیام کی پوری تاریخ کندہ تھی۔ سیاہ حروف میں۔ پاکستان کے معماروں اور مخالفوں کے کہے ہوئے جملوں میں۔ روشنی زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے میں سب تحریریں تو نہیں پڑھ سکا۔ لیکن میں نے محسوس کیا وہاں مذہبی منافرت کے خلاف جان دیدینے کے لئے مہاتما گاندھی کے بارے میں اور پاکستان کے قیام کے حق میں راج گوپال آچاریہ کے بیان کا کوئی بھی جملہ کندہ نہیں ہے ــــ مذہبی اور سیاسی منافرت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ ہر سیاسی تاریخ اب تک مذہبی اختلافات کے بطن سے ہی جنم لیتی آئی ہے۔ امرتسر میں سکھوں کی آرٹ گیلری میں ایسی بے شمار پینٹنگز لگی ہوئی ہیں جو مسلم حکمرانوں کے مظالم کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ اور ہندوؤں کی بھی بے شمار کتابوں میں مسلم دشمنی کے جذبات جابجا ملتے ہیں۔ شاید انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ صدیوں کی تاریخ کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادے لادے ہی جیئے؟ جب کہ وہ اپنے مقدر کا خود بھی مالک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ــــ

ہم سب گہری خاموشی کا بوجھ اٹھائے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ ہم سب باشعور تھے۔ تاریخ اور زندگی کے عمل سے واقف تھے۔ اسی لئے ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر پھر سے گاڑی میں جا بیٹھے اور جب ڈرائیور نے پوچھا، کہاں چلیں۔؟ تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جہاں پہنچ کر ہم پھر سے یاد کر سکیں کہ ہم ہنسنے کا آرٹ بھی جانتے تھے۔"! اور ہم سب پھر ہنس پڑے ــــ

تھوڑی دیر کے لئے ہم اُردو کے مشہور افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کے یہاں رُکے جن کے گھر میں اس روز پُتائی ہونے کی وجہ سے بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس

www.taemeernews.com

کے لئے انھوں نے ویران کمرے میں دو چار کرسیاں ڈالتے ہوئے معذرت کی تو میں نے کہا :۔

"اس بے سروسامانی کے باوجود ہم آپ کو اُردو کا عظیم افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا :۔

"اس سے تو اُردو کی ہی کس مپرسی ثابت ہوتی ہے۔"

انتظار حسین نے کہا :۔

"اگر نقوی صاحب اس وقت جائے پلوا دیں تو ہم اُردو کی اور اُن کی بھی کس مپرسی کو بھول جائیں گے۔!"

جب ہم سب زور زور سے ہنس رہے تھے تو اس ویران لیکن تازہ تازہ پُتے ہوئے کمرے میں غلام الثقلین نقوی کے قہقہے ہی ساری آوازوں میں نمایاں تھے اور میں سوچ رہا تھا اگر دنیا میں صرف مذہب اور سیاست کی ہی علم داری ہوتی اور ادب کا نام و نشان نہ ہوتا تو اس دنیا کی شکل کیا ہوتی ؟ — ہوتی بھی یا بالکل نہ ہوتی کون کیا کہہ سکتا ہے — ؟

وہم

www.taemeernews.com

ادب، ٹھگی اور علامت نگاری

۵

بارہ فروری کی صبح بہت ہی سہانی تھی۔ رات پھر بارش ہونے کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ اگرچہ سرد ہوا ابھی تک چل رہی تھی لیکن صبح کی گنگنی دھوپ بہت مزہ دے رہی تھی۔ چائے وغیرہ پیتے پیتے حسب معمول اخبارات کی ورق گردانی کی۔ پاکستان کے اخبارات اب خالص ویجی ٹیرین معلوم ہوتے ہیں اس لیے اخبار کو ذرا سا الٹ پلٹ کر رکھ دیتا تھا۔ اس روز دو چار ٹیلی فون کال سنے۔ ایک تو کراچی سے صہبا لکھنوی نے کیا تھا۔ دوسرا زاہدہ سے ۔ دہلی

www.taemeernews.com

نے مجھ سے کراچی پہنچنے کا پروگرام پوچھا۔ میں نے انھیں بتایا مجھے صرف تین ہی شہروں کا ویزا دیا گیا ہے۔ لاہور، ملتان اور میانوالی کا۔ کراچی کا ویزا کس طرح ملے گا، ابھی تک اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کیا گیا۔ مل جائے گا تو میں ضرور آؤں گا۔ دونوں نے خدشہ ظاہر کیا۔ کراچی آئے بغیر پاکستان کا دورہ کیسے مکمل سمجھا جائے گا۔ اُن دونوں کے لہجے میں شکایت اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ دونوں سے کراچی کے متعدد دوستوں سے سلام کہہ دینے کے لئے درخواست کر دی۔ پھر میں نے خود دو تین دوستوں کو جو لاہور میں رہتے تھے 'سلام مالیکم' کہی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملنے کے لئے آغا سہیل نے خود ہی وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ہم دونوں لان پر ٹہلنے کے لئے باہر نکل آئے۔ آغا سہیل کے دونوں چھوٹے بیٹے اس وقت اسکول جا رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ بھئی میرے ساتھ کرکٹ کب کھیلو گے، تو انھوں نے جواب دیا۔ "شام کو لوٹ کر ایک ٹسٹ میچ کھیلیں گے اور وہ ٹسٹ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوگا۔ میں نے ان کے چیلنج کو قبول کر لیا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب محسن سہیل کے ایک دوست نے ہمیں مجلسِ ترقی ادب کے آفس تک پہنچانے کے لئے لفٹ دے دی۔ جو کلب روڈ پر واقع ہے۔ صبح کے وقت سڑکوں پر کالج جانے والی لڑکیوں کی بہت بھیڑ تھی۔ خوبصورت چہروں اور دلکش لباسوں والی۔ سڑکوں پر خوب صورت لڑکیاں گھوم رہی ہوں تو موسم اپنے آپ دل فریب بن جاتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں لڑکوں کے ہجوم بھی ضرور ہوتے ہیں۔ لڑکے جان بوجھ کر ان کے پیچھے پیچھے یا اُن کے اندر گھس کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے وہاں بھی لڑکے دکھائی تو دیتے مگر دور دور اور سہمے سہمے سے۔ جیسے مارشل لا کی سختیوں سے ڈرتے ہوں۔ اگرچہ یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہی لڑکیوں کے پیچھے پیچھے کچے دھاگوں سے بندھے چلے جا رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب مجلس ترقی ادب کے چیرمین ہیں۔ اس کرسی پر کبھی عابد علی عابد متمکن تھے۔ قاسمی صاحب سے چھتیس برسوں کے بعد ملاقات ہوئی سنہ ۱۹۴۳ء

www.taemeernews.com

میں وہ دارالاشاعت میں پھول اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اُن سے میرا تعارف قمر جلال آبادی صاحب نے کرایا تھا۔ اور انھوں نے میری تین کہانیوں پر اصلاح بھی دی تھی۔ اور پھر میری کہانیوں کو خود ہی ادبی دنیا اور سب رس کو بھجوا دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ دو بار ایوان ادب کی میٹنگوں میں بھی لے گئے تھے جہاں میں نے دو کہانیاں سنائی تھیں اور تنقید اور بحث کے لطف سے پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ یہ وہی قاسمی صاحب تھے جن کی اس زمانے کی پڑھی ہوئی کہانیاں 'آویزے' 'طلوع و غروب' اور 'ہیروشیما سے پہلے' 'ہیروشیما کے بعد' میں ابھی تک نہیں بھول پایا تھا۔ اُن کے مزاج کی نرمی، اُن کی شرافت اور ادب دوستی نے میرے ذہن میں جو امیج برسوں پہلے بنا دیا تھا وہ ابھی تک قائم ہے۔ انھوں نے میرے پہلے افسانوی مجموعہ 'آئینے' کا جو تعارف لکھا تھا اُسے بھی میں نہیں بھول پایا تھا۔ ان کی یادوں کے یہ نقوش میرے ادبی سفر کے شروع شروع کے ہی تھے۔ میں خوش نصیب تھا کہ مجھے آغاز سفر میں ہی احمد ندیم قاسمی جیسا رہبر مل گیا تھا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد میں نے قاسمی صاحب کو پھر دیکھا تو میری آنکھیں اُن پر ٹکی رہ گئیں۔ میں اپنے ایک بہت ہی عزیز اور قابلِ احترام بزرگ ادیب کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ پینسٹھ سال سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا دم خم چال ڈھال، انداز گفتگو اور طرز لباس جوانوں کا سا تھا۔ بالکل ویسا جو میں نے ۱۹۴۳ء میں دیکھا تھا۔ مجھ سے بغل گیر ہو کر ملے۔ خیریت پوچھی۔ چائے منگائی اور میز کے سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے اصحاب متعارف کرایا۔ عبداللہ قریشی، افسانہ نگار یونس جاوید اور فلموں کے موسیقار خلیل احمد سے۔ انھیں بڑے فخر کے اظہار سے بتایا "جن لوگوں نے ہمارے فوراً بعد لکھنا شروع کیا۔ ان میں ایک رام لعل بھی ہیں جو ابھی تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔"

مجھے یاد ہے کئی برس پہلے قاسمی صاحب نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ علم و ادب کے مرکز لکھنؤ میں ہیں۔ میں آپ کے افسانے برابر پڑھتا رہتا ہوں۔" ان کے ذہن میں لکھنؤ کے بارے میں جو امیج بنا ہوا ہے وہ قریب قریب ہر اُس آدمی کا بھی ہے جس نے لکھنؤ کبھی نہیں دیکھا۔ قاسمی صاحب نے لکھنؤ کے کئی پرانے ادیبوں کے نام لئے جن میں سے کئی تو خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔ علی عباس حسینی، سجاد ظہیر، سید

www.taemeernews.com

احتشام حسین، مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ۔ حیات اللہ انصاری کے ترقی اردو بورڈ کی چیرمین شپ سے ریٹائر ہوکر لکھنؤ لوٹ آنے کی خبر سے وہ خوش نظر آئے، میں نے انھیں اپنی نئی کتاب "معصوم آنکھوں کا بھرم" پیش کی تو بولے، میں بھی آپ کو اپنی کچھ کتابیں پیش کروں گا۔ گھر پر رکھی ہیں۔ میں نے لفظ پیش پر اختلاف کرتے کرتے کہا آپ کی تو یہ میرے لئے عنایت ہوگی۔ بولے یہ آپ کی سعادت ہے کہ میرے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں۔ مجھے اُن کی زبان سے اپنے لئے لفظ آپ بھی بہت کھٹک رہا تھا۔ لیکن مجھے یاد آیا انھوں نے اُس زمانے میں بھی مجھے کبھی تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ جب میں اُنیس بیس برس کی عمر میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

کچھ دیر اور وہاں بیٹھ کر آغا سہیل اور میں نے اُن سے رخصت چاہی۔ ہمارے ساتھ ساتھ خلیل احمد بھی اُٹھ آئے۔ انھوں نے ہمیں الفلاح تک پہنچنے میں لفٹ دیدی، گاڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ اپنی فلموں کی باتیں سناتے رہے۔ جن کی وہ موسیقی ترتیب دے دے چکے تھے۔ وہ جنم سے تو نیپالی نژاد ہیں لیکن انھوں نے پنجابی، ہندوستانی اور پاکستانی دھنیں بنانے میں بہت مہارت حاصل کر رکھی ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی ایک شام کو مجھے اپنے یہاں مدعو کرکے اپنی موسیقی سنوائیں گے اور پنجابی لوک گیتوں کے کیسٹ بھی بھر کر دے دیں گے۔

الفلاح میں پاکستان کے نیشنل سنٹر میں ایک چھوٹی سی بہت ہی خوب صورت لائبریری ہے جس طرح ہمارے یہاں لکھنؤ میں موجا کیندر قائم ہے۔ اس کے ایک ہال کو ہفتے میں دو تین بار کسی نہ کسی ادبی تقریب کے لئے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ سنٹر کے پاس تین سو سے زائد کرسیاں ہیں۔ اُس وقت مجھے لائبریری کے ہال اور گیلری میں درجنوں لڑکے اور لڑکیاں مطالعے میں غرق نظر آئے۔ نیشنل سنٹر کی ڈائرکٹر اُردو کی مشہور شاعرہ کشور ناہید ہے۔ لمبی پتلی، ترشے ہوئے بالوں والی ایک دلکش خاتون، جو اُردو اور پنجابی ایک سی روانی سے بولتی ہے۔ لاہور کے ادیب اور شاعر ایک ہی سانس میں کبھی اُردو بولتے ہوئے ملتے ہیں کبھی پنجابی۔ پنجابی اُن کی مادری زبان ہے اور اُردو تہذیبی اظہار کا وسیلہ۔ پنجابی زبان بھی چونکہ ادبی اظہار کے لئے ایک مکمل زبان کا درجہ رکھتی

www.taemeernews.com

ہے۔ اس لئے پنجاب کے لوگوں کو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اُن کے اسی رویّہ کی وجہ سے دونوں زبانوں کے بے شمار الفاظ، محاورے اور تشبیہات کو قبول کر لیا گیا ہے۔ کشور ناہید ہندوستان میں بھی بہت مقبول ہے۔ اس کی غزلیں اور نظمیں اور تصاویر کئی رسالوں میں برابر چھپتی رہتی ہیں۔

اُس وقت وہاں کچھ ادیب اور شاعر موجود تھے۔ جتنی دیر میں وہاں رہا ادیبوں اور شاعروں کا آنا جانا لگا رہا۔ اور کشور ناہید ہر ایک سے مجھے ملاتی رہی محمد خالد اختر، محمد کاظم، رشید ملک، فیض صاحب کی بیٹی سلیمہ ہاشمی اور اُس کا شوہر شعیب ہاشمی، مسعود اشعر، اقبال ساجد وغیرہ۔ محمد خالد اختر اُردو کے مشہور طنز نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی افسانے، طنزیے اور خاکے اور سفرنامے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے کچھ فینٹسیاں بھی لکھی ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے انجینیر تھے اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے بہت قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔

رسالہ معاصر لاہور کی حالیہ اشاعت میں انھوں نے مکاتیب خضر کے عنوان سے ایک طنزیہ لکھا ہے ۔۔۔ "ہمارے زمانے میں الف آم، ب بلی، پ پنکھا۔ نہ زرافہ وغیرہ سے قاعدے کی ابتدا ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ان چیزوں جانوروں کی تصویریں بھی ہوتی تھیں جن سے بچے کا تخیل متحرک ہوتا تھا۔ نئے نصاب بنانے والوں نے سوچا کہ یہ سب لغو، پوچ اور بے معنی ہے۔ ابجد سکھلاتے ہوئے بھی لازم ہے کہ ایک بچے کے ننھے سے ذہن میں مذہب و ملت اور عقائد و شعائر کی باتیں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ سنا ہے اب نئے نصاب کے قاعدے میں الف سے ایمان یا اللہ ہوگا۔ ب سے بلی یا بکری نہیں ہوگا بلکہ بنی اسرائیل ہوگا۔ پ سے پاکیزگی اور ت سے تبلیغ بنیں گے۔ اس طرح گویا پہلی جماعت سے ہی بچے واضح العقیدہ مسلمان اور پکے با اخلاق بن کر آگے چلیں گے۔ میاں لڑکے! بچوں کی اصلاح کرنے، ان کو راہِ ہدایت پر ڈالنے کے لئے ان نصاب بنانے والوں کا ذوق و شوق اپنی جگہ پر

www.taemeernews.com

مگر بچوں کے قاعدوں اور درسوں میں کچھ لطف طبع اور سادہ مائی دل کا سامان بھی بھی لازم ہے!“

محمد کاظم بڑے اچھے عربی کے اُردو میں مترجم اور مبصر ہیں۔ انھوں نے بھی کچھ سفرنامے لکھے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ بھی انجینئر ہیں۔ عربی ادب کا مترجم ہونے کی وجہ سے انھیں عربی داں بھی بجا طور پر کہا جاتا ہے۔ رشید ملک نے دس بارہ سال پہلے فنون میں موسیقی کے عنوان سے مسلسل مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ آج کل وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی شہرۂ آفاق تنقیدی کتاب ’اُردو شاعری کا مزاج‘ پر سخت تنقید کر رہے ہیں۔ اُن کا ایک مضمون معاصر کے تازہ شمارے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس مضمون سے ڈاکٹر آغا کی کتاب کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جو پندرہ سال پہلے شائع ہوئی تھی اور جو ہندوستان میں بھی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان میں اس کا دوسرا اڈیشن شایع ہوا ہے۔ نظریۂ تکوین کائنات، نظریۂ وقت وادیٔ سندھ کی تہذیب، اُس میں دراوڑی عناصر اور آریاؤں کے معاشرے اور مذہب پر اُن کے اثرات اور بُدھ ازم، دراوڑی عناصر کے خلاف بطور ایک آریائی ردّعمل وغیرہ ایسے صدیوں پرانے تحقیقی مسائل ہیں جن پر رادھا کرشنن، داس گپتا، نہرو، جگجیت سنگھ، برٹرینڈرسل، بارنٹ، سیلے ڈمین وغیرہ محققین کئی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ رشید ملک میرے ساتھ دیر تک ہندوستان کی تحقیقی کتابوں اور بعض محققین کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ لکھنؤ اسکول کا ذکر آنے پر میں نے انھیں علی جواد زیدی کی ایک تازہ طبع شدہ کتاب کے بارے میں بتایا جس میں زیدی صاحب نے لکھنؤ اسکول کے وجود سے ہی انکار کیا ہے۔ اس کے لئے اُن کی دلیل یہ ہے کہ لکھنؤ میں بیشتر اہلِ قلم میر، ناسخ، نیاز فتح پوری، یگانہ وغیرہ سے لے کر عہدِ حاضر کے نئے لکھنے والوں تک باہر سے ہی آکر لکھنؤ میں آباد ہوئے ہیں جن کے لہجے اور رویے لکھنؤ سے بالکل مختلف رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ سے بہت کچھ فیض بھی حاصل کیا اور اسے بھی شہرت بخشی، اور وہ لکھنؤ کے ہی نام سے مشہور ہو گئے

www.taemeernews.com

لیکن لکھنؤ کا ایک مجموعی لہجہ کبھی نہ بن سکا۔

راشیدہ ملک کو اچانک ایک کتاب کی یاد آگئی۔ لہجات سکندر شاہی جس کا مخطوطہ از میاں بھوہ یا بھوہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے انھوں نے اس کی مائیکرو فلم یا فوٹو اسٹیٹ کاپی بھجوانے کی خواہش ظاہر کی۔

مسعود اشعر ہند و پاک میں جدید افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں اور ان کے علامتی افسانوں کی شمس الرحمان فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بڑی تعریف کی ہے پاکستان میں علامت کا بھرپور اور بالالتزام استعمال ۱۹۵۸ء سے شروع ہو گیا تھا جس کا سبب اظہار کی آزادی پر سخت قیود تھیں۔ لیکن انھیں قیود کو ہندوستان کے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے فیشن کے طور پر اختیار کر لیا اور ایک حد تک یہ رجحان اب بدعت کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔ معاصر لاہور کی ہی اشاعت میں مسعود اشعر کا ایک افسانہ بچھڑے کا گیت خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ اس میں ایک سایہ دار درخت کے کاٹے جانے کے خلاف ایک بڑے شہر کی میونسپلٹی کے کارپردازوں کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا ہے۔ لیکن اس عمل کے خلاف شکایت سننے کے لئے میونسپل کارپوریشن کی بلند و بالا عمارت کی آخری منزل تک بھی نہیں پہنچائی جا سکی، کیونکہ وہاں شکایت سننے والا کوئی افسر نہیں بلکہ نیرو کی طرح ایک شخص بیٹھا بنسری بجاتا اور ہنستا ہوا ملتا ہے۔ یہ افسانہ جس علامتی اور احتجاجی انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ مسعود اشعر روزنامہ امروز کے نائب مدیر بھی ہیں۔

اقبال ساجد اردو کے جدید شاعر ہیں۔ ایک ماہ پہلے وہ امبالہ کے مشاعرے میں آئے تھے جس میں فہمیدہ ریاض بھی آئی تھی۔ ایک بج گیا تو ہم لوگ ابصار عبدالعلی کے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں ابصار نے مجھے لنچ پر بلا رکھا تھا۔ نیشنل سنٹر کی سیڑھیوں سے اتر کر میں پھر مال روڈ پر جا کھڑا ہوا۔ میری نظروں کے سامنے وہی جگہ تھی جہاں ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے لئے میں نے ایک جلوس دیکھا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ کھڑے ہو کر، جہاں اس وقت کھڑا تھا

www.taemeernews.com

برقع پوش عورتیں اور لڑکیاں ہاتھ بلند کر کر کے "لے کے رہیں گے پاکستان" کے بڑے جوش سے نعرے لگا رہی تھیں اور جلوس کو پنجاب اسمبلی ہال کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لئے انگریز فوجیوں نے سڑک کے آر پار صف باندھ رکھی تھی۔ پھر ایک دستے نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر ہوائی فائر کئے تھے۔ جس سے ساری بھیڑ تتر بتر ہو گئی تھی۔ اس بھگدڑ میں اپنی سائیکل پر سوار ہو کر ایک گلی میں سے ہو کر میں میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ وہی مال روڈ تھی جسے پنجابی ٹھنڈی سڑک بھی کہا کرتے تھے۔ اور اس پر پنجابی شاعروں نے گیت بھی لکھے تھے۔ "ٹھنڈی سڑک تے پھردیاں جٹیاں" (ٹھنڈی سڑک پر جاٹ عورتیں گھوم پھر رہی ہیں) دیہاتیوں کا لاہور آ کر اس سڑک پر گھومنا بھی ایک خاص مشغلہ سمجھا جاتا تھا، اور شاعری میں اس کا ذکر محض مذاق اڑانے کے لئے ہوتا تھا۔ اسی سڑک پر انگریز مردوں اور عورتوں کی بھی خاصی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ ہم نوعمر لڑکے گوری گوری میموں کے حسن سے مسحور ہونے کے لئے اکثر شام کو جھنڈ بنا کر گھوما کرتے تھے۔ یہ بھی ایک طرح سے ن۔م۔ راشد کے ایک اجنبی عورت سے انتقام کی ایک مبہم سی شکل تھی ــــــ

کشور ناہید مجھے اور آغا سہیل کو اپنی کار میں ٹمپل روڈ پر لے گئیں جہاں انصار عبدالعلی رہتے ہیں۔ وہاں احمد ندیم قاسمی۔ انور جاوید اور پروفیسر سلیم اختر پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد انتظار حسین بھی آ گئے۔ انصار عبدالعلی نے اپنی بیگم نصرت اور بچوں سے تعارف کرایا۔ جب ہم کھانے پر بیٹھے تو لاہور ٹی وی اسٹیشن کی ایک مکھی کا ذکر چھڑ گیا۔ اس مکھی کی ایک بہن لکھنؤ کے ٹی وی اسٹوڈیو میں بھی سر پروگرام میں براجمان ہوتی ہے جو اکثر و بیشتر خبریں سنانے والوں نرملا دیوی، نور بخش اور نرنش سر یواستو کے منہ پر آ کر بیٹھ جاتی ہے اور وہ اسے کبھی تو بڑی بے نیازی سے اڑا دیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے خاصی پریشانی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ٹی وی دیکھنے والے مسکرایا کرتے ہیں۔ انصار عبدالعلی نے جو لاہور ٹی وی پر خبریں پیش کرتے ہیں اپنا ایک دلچسپ تجربہ اس طرح سنایا کہ ایک بار خبریں پڑھنے کے دوران ایک مکھی ان کی نتھنوں میں گھس

www.taemeernews.com

پیٹھ تک پہنچ گئی اور لگی اِدھر اُدھر گھومنے۔ ابصار بیچارے اپنی کمر کو کبھی اِدھر ٹھمکا دیتے کبھی اُدھر۔ اُن کی خبریں پڑھنے کی روانی میں خاصا خلل پڑ رہا تھا۔ آخر انھوں نے خبریں روک کر لاکھوں ٹی وی دیکھنے والوں کے سامنے قمیص اٹھا کر اُس مکھی سے نجات حاصل کی اور اس کے بعد پھر بڑے اطمینان سے خبریں پڑھنے لگے۔

اظہر جاوید اُردو کے مشہور شاعر، صحافی اور کالم نگار ہیں۔ اُن کی ایک اور خصوصیت پرلے درجے کا ہنسوڑ ہونا بھی ہے وہ اچانک کسی بات پر بڑی بے تکلفی سے قہقہہ لگا کر پورے ماحول کو خوش گوار بنا دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی ہی بات پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ انھوں نے ابصار سے مکھی کا واقعہ سُن کر فوراً کہا۔ "یہ مکھی دراصل ہماری قوم کے ضمیر کی علامت ہے جو غلط خبریں سنانے سے باز رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔"

انتظار حسین نے قہقہوں کی گونج کے درمیان کہا "نہیں۔ میرے خیال میں یہ مکھی ہمارے ماضی کی علامت ہے جس کی تفہیم و تشریح میں ہمارے سارے نقاد ابھی تک ناکام رہے ہیں۔"

آغا سہیل نے کہا۔ "مکھی بذات خود ایک نقاد کی حیثیت سے ہمارے ادبی معاشرے میں موجود ہے۔"

پروفیسر سلیم اختر نے ماہرین نفسیات کی سی پوری سنجیدگی سے سوچتے ہوئے یہ موشگافی کی۔ "اگرچہ فرائڈ نے مکھی اور انسان کی جبلّی خواہشات کے نفسیاتی تعلق کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے مکھی جب ہمارے جسم پر بیٹھتی ہے تو اُس کی سرسراہٹ ہمارے اندر اچانک سوئی ہوئی جنسی خواہش کو بیدار کر دیتی ہے۔"

جناب احمد ندیم قاسمی نے مکھی کو چوپال کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ "اگر مکھی نہ ہوتی تو ہمارے دیہاتی معاشرے میں چوپال کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اب چونکہ صفائی وغیرہ پر زور دے کر مکھی کو ختم کیا جا رہا ہے: اس لئے چوپال بھی اپنے وجود سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔"

www.taemeernews.com

پھر قہقہوں کے درمیان کشور ناہید نے مجھ سے پوچھا۔ "بھارت میں مکھی کی کیا اہمیت ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہم تو ابھی تک اس کی شناخت گاندھی جی کے عدم تشدد کے حوالے سے قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک مکھی اچانک کہیں سے اڑتی اڑتی کشور ناہید کی ٹھوڑی پر آکر بیٹھ گئی اور ہماری ہنسی اور گفتگو کا رخ بے اختیار شاعری کی طرف مڑ گیا۔

کھانا خاصا لذیذ تھا۔ اس کے بعد چائے کا بھی دور چلا اور پھر ہندوستان کی اردو اکاڈمیوں کے قیام اور ان پر سیاسی افراد کے جبر و اختیار کا بھی ذکر چلا۔ جس کا سلسلہ پاکستان کی صورت حال سے بھی فوراً آملایا گیا۔ اس کے بعد جب کشور ناہید، احمد ندیم قاسمی، اظہر جاوید اور سلیم اختر چلے گئے تو انتظار حسین نے اپنے مشرق اخبار کے کالم کے لئے مجھ سے انٹرویو کر لینے کے لئے یہی موقع غنیمت سمجھ لیا۔ ہم لوگ ابصار اور آغا سہیل کو آپس کی باتیں کرنے کے لئے چھوڑ کر ایک الگ کونے میں جا بیٹھے ...... انتظار حسین باتیں کریدنے اور الفاظ کی کڑیاں ملانے میں بہت ماہر ہیں اس لئے میں بہت ہی محتاط ہو کر ان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ میری شروع کی ادبی اور معاشرتی زندگی، لاہور کی ادبی فضا میرے عقائد و نظریات، میری افسانہ نگاری پر میرے پیش رو افسانہ نگاروں اور ادبی تحریکوں کے اثرات اور میرے جدید تر ادبی رجحانات کو قبول کرنے کے اسباب وغیرہ وغیرہ۔ جب انٹرویو ختم ہو گیا اسی وقت ڈاکٹر وزیر آغا کا فون آگیا۔ انھوں نے ڈاکٹر آغا سہیل کے گھر سے ہمارا سراغ لگایا تھا۔ ابصار صاحب نے انھیں فوراً اپنے یہاں بلا لیا۔ انتظار حسین اپنا کام ختم کر کے چلے گئے۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا آگئے تو چائے کا ایک اور دور چلا۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ ابصار اور ان کی بیگم سے رخصت لے کر ڈاکٹر آغا، آغا سہیل اور میں گھومنے کے لئے نکل پڑے۔

یہ طے نہیں تھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔ لیکن یہ خواہش شدت سے موجود تھی کہ ہم ساتھ رہیں۔ گاڑی جیل سڑک پر آگئی تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اچانک تجویز کیا آپ کو ڈاکٹر سید عبداللہ سے ملاؤں۔ میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو

www.taemeernews.com

کے چند بزرگ ادیبوں میں سے ہیں جو اس عمر میں بھی تنقید و تحقیق کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چند ماہ پہلے ان کا ایک مضمون افکار کراچی میں پڑھا تھا جس میں انھوں نے پاکستانی فضا میں اُردو زبان کے بدلتے ہوئے رجحانات کو قبول کرنے کے لئے مدلّل بحث کی تھی۔ انھوں نے اس بات کی بھی وکالت کی تھی کہ پاکستان کے دانشور اور شعرا تلفظ وغیرہ کی سند کے لئے دہلی یا لکھنؤ کا منہ دیکھنے کے بجائے پاکستان کے اُردو شعرا کی طرف بھی رجوع کیا کریں۔

جب ہم اُن کے گھر پہنچے تو وہ اپنے اسٹینو کو کچھ لکھوا رہے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے اُن سے میرا اور آغا سہیل کا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ اور ہندوستان میں اُردو زبان کی ترقی کے سلسلے کی کوششوں کی تعریف کرنے لگے۔ انھیں ہماری ۱۹۷۳ء کی کُل ہند غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس کا بھی حال معلوم تھا جس کا ذکر انھوں نے بڑی ستائش سے کیا۔ وہ خود بھی ایک اُردو کانفرنس کرنے کا پروگرام مرتب کئے ہوئے تھے جس کا ایک خاکہ انھوں نے سامنے رکھا تو میں نے کہا اس کانفرنس کو وہ اگر بین الاقوامی کانفرنس میں تبدیل کر دیں تو بہت اچھا ہوگا۔ اس سلسلے میں میں نے اُن کے سامنے چند سال پہلے کا وہ خاکہ رکھ دیا جس کے لئے مجھے اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو کنوینر مقرر کیا گیا تھا۔ ہمارا پلان یہ تھا کہ اُس کانفرنس میں کم سے کم ایک ہزار مندوبین ضرور شرکت کریں۔ جن میں پاکستان کے ڈھائی سو نمایندے ضرور ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ روس، امریکہ، انگلینڈ اور دوسرے ممالک سے بھی نمایندوں کی شرکت ہونی چاہئے اور اس کانفرنس کے نتائج سے ایک انٹرنیشنل اُردو سنٹر کا قیام ضرور برآمد ہونا چاہیئے جہاں کمپیوٹر کے ذریعے پوری اُردو تاریخ کے اہلِ قلم کے بایو ڈیٹا اور اُردو کے تمام موضوعات پر کی ہوئی ریسرچ وغیرہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے صوبائی حکومت کی سطح پر جتنی پیش رفت کی تھی وہ آگے چل کر وزارت امورِ خارجہ تک پہنچ کر رُک گئی تھی۔ شاید جن لوگوں نے اس وقت کی وزیر اعظم مسز گاندھی سے

www.taemeernews.com

منظوری لینے کی ذمہ داری قبول کی تھی اسے انھوں نے خود ہی پورا نہیں کیا تھا۔
ڈاکٹر عبداللہ میری بات سُن کر کئی لمحوں تک خاموش رہے۔ پھر اپنے خول سے باہر نکل کر بولے۔ "ایسے کاموں کے لئے بہت زیادہ روپوں کی ضرورت ہوگی اور میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکوں گا اس کے لئے میں اپنی حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے بھی خود کو قابل نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ خود نہ چاہے۔ اب تو مسز گاندھی واپس آگئی ہیں۔ یہ کام صرف ہندوستان جیسے ملک میں ہی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ کی عمر اس سے اوپر ہو چکی ہے۔ وہ کچھ اونچا بھی سننے لگے ہیں۔ ہم اٹھے تو وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود دروازے تک چھوڑنے کے لئے باہر چلے آئے۔ باہر ابھی شام باقی تھی۔ رات کی آمد آمد تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا ہمیں اُردو کے ایک بزرگ شاعر قیوم نظر سے بھی ملانے کے لئے لے گئے۔ وہ کبھی امرتسر میں رہا کرتے تھے۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ وہ ۱۹۴۲ء میں وائی ایم سی ہال میں منعقد ہونے والی ہماری ایوانِ ادب کی دو میٹنگوں میں شریک ہونے کے لئے امرتسر سے ہی تشریف لے آئے تھے۔ میری قوت یادداشت کی انھوں نے داد دی اور کچھ دیر تک اُردو کے پرانے ساتھیوں اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، فکر تونسوی وغیرہ کو یاد کر کر کے پوچھتے رہے۔ اُن کا بیٹا سلمان بٹ جو ہماری گفتگو کے دوران موجود تھا اور چائے سے ہماری خاطر تواضع کر رہا تھا ہفت روزہ چٹان سے وابستہ ہے۔

وہاں سے نکل کر کچھ دیر ماہنامہ تخلیق کے دفتر میں رُکے اور وہاں سے اظہر جاوید کو ساتھ لے کر مال روڈ کے ایک شاندار ہوٹل سلوز میں جا بیٹھے، جہاں ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت عمدہ کھانا کھلایا۔ کھانے کی میز پر حسب معمول اظہر جاوید کے قہقہے گونجتے رہے۔ یورپ کی لڑکیوں کا ذکر چل نکلا جن سے میں ۱۹۷۸ء کے سفر کے دوران کئی ملکوں میں ملتا رہا تھا تو اُردو ادیبوں کے معاشقے بھی زیر بحث آگئے، علامہ اقبال سے لے کر ظاہر تونسوی تک کی معلوم اور نامعلوم محبوباؤں کی پوری رامائن کھل گئی جس میں کئی راونوں اور بالیوں کے بھی چہرے سامنے آگئے، اور

www.taemeernews.com

پیشتر اس کے کہ مہابھارت کی پوتھی بھی کھول لی جاتی باتوں کا رُخ یک بیک زمین کے رشتوں کی طرف مُڑ گیا۔ اُسی دوران ریسٹوران میں کچھ ایسے چہرے بھی دوسری میزوں پر دکھائی دے گئے کہ موضوع کے تسلسل کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ اور میں نے اظہر جاوید کو اُنھیں کا ایک شعر یاد دلا کر وہاں سے اُٹھنے کی تحریک دے دی ؎

وہ نظر کیا تھی کہ جس کے کھو گئے سارے اُفق
یہ زمیں کیسی ہے جس کو آسماں ملتا نہیں

باہر رات پوری طرح جوان ہو چکی تھی۔ لاہور کی راتوں کے حسن کے جادو سے میں پوری طرح باخبر تھا۔ اِن ہی سڑکوں پر میں کئی برسوں تک بھٹکتا پھرا تھا۔ کبھی اکیلا کبھی دوستوں کے ہجوم میں۔ پھر گھومتے گھومتے میں قلعہ گوجر سنگھ کے ایک کرائے کے کمرے میں واپس بھی پہنچ جایا کرتا تھا۔ اب تو میں وہاں ایک مہمان تھا۔ صرف مہمان۔ مجھے اظہر جاوید کا ہی ایک اور شعر بے اختیار یاد آگیا۔ جو میں نے اورق کی ڈمی میں پڑھا تھا جو ڈاکٹر آغا نے مجھے دکھائی تھی ؎

بھٹکوں اگر تو منزلِ شب کی خبر بھی ہو
اس شہرِ غم میں کاش کوئی میرا گھر بھی ہو

ڈاکٹر وزیر آغا مجھے اور آغا سہیل کو ایف سی کالج میں اُتار کر ماڈل ٹاؤن چلے گئے۔ کراچی سے محمد علی صدیقی کا فون بھی آگیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ میرے کراچی کے ویزا کے لئے اسلام آباد سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے کراچی آئے بغیر واپس نہیں جانے دیں گے۔ اُس کے اصرار میں محبت کی جو خوشبو رچی ہوئی تھی وہ ٹیلیفون کے تاروں پر بھی پوری طرح منتقل ہو گئی تھی۔ چونکہ رات کا وہ حصہ ابھی باقی تھا جب انور سجاد اپنے کلینک سے لوٹ کر اپنے گھر پر ہمارا انتظار کیا کرتا تھا۔ آغا سہیل اور میں ہلکی ہلکی بارش

www.taemeernews.com

باشعور نئی نسل ــ انسانی رشتے

(۶)

۱۴ر فروری کی صبح کئی لوگ ملنے کے لئے آئے۔ زیادہ تر کالج کے ہی لڑکے تھے۔ انھوں نے بارہ بجے ایف۔ سی کالج میں کچھ سوالات پوچھنے کا پروگرام رکھ دیا۔ شعبۂ اردو میں چونکہ جگہ کم تھی اس لئے کالج کینٹین کے باہر کھلی دھوپ میں کرسیاں ڈال دی گئیں۔۔ اردو کے مشہور نقاد پروفیسر جیلانی کامران میرے میزبان اور اردو کے منفرد افسانہ نگار ڈاکٹر آغا سہیل اور کالج کے دو اور استادوں اشفاق سرور و آغا ضیاء الرحمان کے علاوہ طالب علموں

www.taemeernews.com

میں مس مارگریٹ شراف، رائے نظر حیات، نادر اعجاز، اشفاق حسین خاں، طاہر رحیم خاں، مس گل زیب، طارق حبیب خاں، وسیم اختر، سبحان الحق مسعود ناصر بٹ، مس رخسانہ یٰسین وغیرہ تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے میری ابتدائی زندگی لاہور کی چوتھی دہائی کی ادبی سرگرمیاں، افسانے میں بیانیہ اور علامت کا استعمال، ہندوستانی لڑکیوں کی ادب، آرٹ میں اظہار کی آزادی، ہندوستانی فلموں وغیرہ سے متعلق کئی سوالات کئے جن کے میں نے بڑی تفصیل سے جوابات دیئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان کی نئی نسل کی تربیت صحت مند خطوط پر ہو رہی ہے اور میرا یہ خدشہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا کہ وہاں کی نئی نسل ہندوستان اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں بالکل غیر جذباتی ثابت ہوگی۔ اور جذباتی رشتے صرف ہماری ہی نسل تک محدود ہوں گے۔ نئے بچوں میں ہندوستان کے بارے میں جاننے کی زیادہ خواہش موجود ہے، دونوں ملکوں کی سیاست اور پروپیگنڈے نے اُن کے ذہنوں کو بہت زیادہ متاثر نہیں کیا ہے۔ اُن کے شکوک رفع کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں سے ملیں۔ اُنھیں ہندوستان کا لٹریچر بھی پڑھنے کو ملے۔ مستقبل کے پاکستان کے یہی لوگ معمار بنیں گے۔

شام کو چار بجے ڈاکٹر وزیر آغا نے شیراز میں اُردو کے ادیبوں سے مجھے ہونے کے لئے ایک عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ خود مجھے اور ڈاکٹر آغا سہیل کو لے جانے کے لئے پونے چار بجے آ گئے۔ راستے میں بسیں، کاریں، تانگے اور چھکڑے ہر جگہ بھاگتے ہوئے ملے۔ لاہور کی زندگی میں یہ نئی حرکت پہلے کی نسبت یقیناً کچھ تیز ہے۔ بس اسٹاپوں پر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے شیڈ بنا دیئے گئے ہیں۔ کسی کسی بس اسٹاپ پر مستورات کے بیٹھنے کے لئے الگ شیڈ ہیں، جس سے اندازہ ہو کہ بسیں دیر سے بھی آتی ہیں۔ بس اسٹاپوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر بھی انتظار کی کیفیت تھی۔ اس کے بارے

www.taemeernews.com

میں کئی لکھنے والوں کے افسانے ملتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کا نیا افسانہ 'تیرھواں آدمی' اِسی بھیڑ کو پیش کرتا ہے۔ بس سروس کے ذمّے دار افسروں نے بس اسٹاپوں پر بھیڑ کو کم کرنے کے لئے پہلے تو آٹھ مسافروں کو بسوں کے اندر کھڑے ہونے کی اجازت دی، پھر اُس کے بعد یہ تعداد بڑھا کر بارہ کر دی۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ تیرھواں آدمی کون سا ہے جسے بس میں سوار ہونے سے روک دیا جائے۔ ہر مسافر خود کو بارھواں آدمی بتانے پر مُصر ہو جاتا تھا آخر میں تیرھواں آدمی خود بس کنڈکٹر ہی بن گیا جو بس میں سوار نہیں ہو پایا تھا۔

شیزان میں کئی لوگوں سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ فرخندہ لودھی، صابر لودھی، عذرا اصغر، عبدالعزیز خالد، عارف عبدالمتین، ڈاکٹر وحید قریشی، عصمت اللہ، بیدار سرمدی وغیرہ۔ جن سے پہلے مل چکا تھا، اُن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، سائرہ ہاشمی، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، جن کا انگلینڈ کا سفرنامہ قسط وار اوراق میں شایع ہو رہا ہے، اظہر جاوید، سلمان بٹ، ابصار عبدالعلی، ذوالفقار احمد تابش، شہزاد احمد، اصغر مہدی، غلام الثقلین نقوی وغیرہ شامل تھے، لوگ وقفے وقفے سے آتے رہے اور ڈاکٹر آغا اُن کے ساتھ میرا تعارف کراتے رہے، پہلے تو میں ہر ایک سے ملنے کے لئے اُس کے ساتھ جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اچانک میں سائرہ ہاشمی اور عذرا اصغر کے درمیان سینڈوچ ہو کر رہ گیا تو سب کی نظریں شرارت سے چمکنے لگیں۔ میں نے انتظار حسین کو اپنی جگہ آفر کی تو اُس نے دور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ آپ اسی جگہ اچھے لگ رہے ہیں؛ فرخندہ لودھی ہمارے سامنے بیٹھی تھیں۔ تینوں خواتین افسانہ نگار ہندوستان کے افسانوی ادب اور میرے بیوی بچّوں سے متعلق کرید کرید کر پوچھ رہی تھیں۔ خواتین کے اندر یہ خواہش بڑی فطری ہوتی ہے کہ وہ اپنے جان پہچان کے لوگوں کے بارے میں ہر بات فوراً جان لینا چاہتی ہیں۔ عبدالعزیز خالد ہمارے بہت قریب بیٹھے تھے وہ بار بار میری افسانہ نگاری کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن اُن کی بات ہر بار

www.taemeernews.com

کوئی نہ کوئی خاتون کاٹ دیتی۔ میں نے کسی نئے مہمان کا آمد پر اُٹھنے کا بہانہ بنا کر وہ سیٹ چھوڑ دی اور وہاں اپنے بجائے انتظار حسین کو بٹھا دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے گلے ملنے لگا تو اظہر جاوید نے دور سے جملہ پھینکا۔ ڈاکٹر صاحب سے دو قسطوں میں ملنا پڑے گا۔ سب لوگ زور سے ہنس پڑے۔ ڈاکٹر قریشی کافی موٹے ہو گئے ہیں۔ اُن کی پیدائش میرے وطن میانوالی میں ہی ہوئی تھی، اِس وقت وہ اورینٹل کالج میں ڈین ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اِسی کالج کے صدر شعبۂ اُردو اور پرنسپل ہیں۔ پچھلے سال اُنھوں نے اقبال سیمینار دہلی میں شرکت کی تھی اور اس سفر کے بارے میں اُنھوں نے ایک نہایت ہی دلچسپ ریپورتاژ بھی شائع کرایا ہے جس میں دہلی کے کئی اہلِ قلم اور پرانی یادوں کا ذکر ہے۔ اُنھوں نے سابق وزیرِاعظم مسٹر مُرارجی بھائی ڈیسائی کی اُس تقریر کا بھی ذکر کیا ہے جو اُنھوں نے اُردو ہال کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی اور اُردو کو مشکل زبان کہہ کر حاضرین کو خاصا بدمزہ کر دیا تھا۔ آج کل پاکستان میں فرخندہ لودھی، سائرہ ہاشمی، عذرا اصغر اور مستنصر حسین تارڑ کے افسانے بہت مقبول ہیں۔ ہندوستان کے قارئین اُن کے ادبی کارناموں سے ابھی پورے طور پر روشناس نہیں ہیں۔ فرخندہ لودھی کے دو افسانوں کے مجموعے، 'شہر کے لوگ' اور 'آرسی' شائع ہو چکے ہیں اور ایک ناول 'حسرتِ عرضِ تمنا' بھی آ چکا ہے۔ اُن کی سب سے اچھی اور موثر کہانی 'یاربتی' ہے جو ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق ہے اور اسی کی بدولت وہ اُردو قارئین سے متعارف ہوئی تھیں۔ وہ اگرچہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئی تھیں، لیکن اُن کا بچپن اپنے والد کے پولیس کے محکمے میں ملازمت کی وجہ سے مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں گزرا تھا۔ دیکھا گیا ہے جن ادیبوں کی جڑیں غیر منقسم ہندوستان کے کسی بھی حصے میں موجود تھیں، وہ ابھی تک جذباتی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اُن کے یہاں انسانی رشتوں کی جو جذباتی فضا بنتی ہے وہ ادبی سطح پر کہیں بھی کمزور یا مصنوعی نہیں ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس بات کا خدشہ ہمیشہ موجود

www.taemeernews.com

رہتا ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر فن کو کہیں مجروح نہ کر دیں۔

سائرہ ہاشمی یوں تو جمیلہ ہاشمی کی چھوٹی بہن ہے لیکن اُس کی پہچان اُس کی اپنی افسانہ نگاری ہے، اُس کا ایک بہت ہی خوب صورت مجموعہ 'ریت کی دیوار' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے عورت کی جذباتی زندگی، اس کی جذباتیت، معاشرے میں اُس کی حیثیت، مرد سے اُس کے تعلقات کی نوعیت، اُن کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔

میں نے خود جب پہلی بار سائرہ ہاشمی کے افسانے اوراق میں پڑھے تو اُس کے جرأت آمیز اظہار کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس قسم کا اظہار ہمارے اُردو افسانے میں پہلے سے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، کرشنا سوبتی اور کویتا نہا کے یہاں موجود ہے۔ لیکن ہر نئی لڑکی جب اپنے گرد و پیش کے معاشرے کے سماجی اور نفسیاتی محرکات کو پوری طرح سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتی ہے تو وہ اپنے زاویہ نگاہ کی وجہ سے بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ سائرہ ہاشمی خالدہ حسین کی طرح فارم کے نقطۂ نظر سے جدید نہ سہی لیکن فکر کے اعتبار سے یقیناً جدید اور تازہ ہے، میں فارم کو یوں بھی محض ایک تجربہ سمجھتا ہوں اور فکر اور رویہ کو ہی جدیدیت کے لئے ضروری لوازم قرار دیتا ہوں۔ پروفیسر سلیم اختر نے اُس کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ "اُس کی ایک ادا یہ ہے کہ وہ موسم اور فطرت کو کرداروں کے داخلی احوال سے یوں ہم آہنگ کرتی ہے کہ خارج اور باطن دونوں ایک تال پر دھڑکتے معلوم ہوتے ہیں۔

عذرا اصغر کا نام افسانہ نگاری کے میدان میں نسبتاً نیا ہے۔ وہ ماہنامہ تخلیق کی اعزازی مدیر بھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ بھی نئے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن یہ دونوں قلم کار اپنے ذہین قارئین، وردانش ور طبقے کی توجہ فوری طور پر اپنی طرف مبذول کرا لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ عارف عبدالمتین بڑی دیر سے میری طرف بڑی محبت سے تاک رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے میں اُنکی صرف اسی حیثیت سے واقف ہوں کہ وہ اوراق میں ڈاکٹر وزیر آغا کے شریک مدیرہ

www.taemeernews.com

چکے ہیں۔ لیکن جب میں نے اُنھیں بتایا کہ میں تو اُنھیں پانچویں دہائی کے اُن کے ماہنامہ "جاوید" کے تعلق سے بھی جانتا ہوں تو وہ بہت جذباتی نظر آئے، پنجابی ادیب، ادب کے رشتے کو یاد کرکے ہمیشہ جذباتی ہو جاتے ہیں — جذباتی ہو جانا پنجاب کی مٹی کی خاص کمزوری ہے۔ وہ دیر تک میرے سینے کے ساتھ چمٹے سے کھڑے رہ گئے، اور اُن کی آنکھیں خلوص سے چھلکتی رہیں۔ عارف صاحب صرف اُردو کے ہی نہیں، پنجابی کے بھی ایک اہم شاعر اور نقاد ہیں اُردو میں اُن کے 'سفر کی عطا'، 'چراغ کا گھاؤ'، 'مٹی کی پکار'، دکھ کی میراث، موج در موج، سچائی کا زہر، دھوپ کی چادر، استعارہ، آتشِ سیّال، دیدۂ و دل، دریچے اور صحرا کے ناموں سے شعری مجموعے اور تحسینِ فن اور امکانات دو تنقیدی مضامین کے بھی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ پنجابی زبان کی شاعری کے اُن کے تین مجموعے اور ایک تنقیدی مقالات کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ آخرالذکر کتاب میں اُنھوں نے پنجابی کے کلاسیکی شعرا میں بابا فرید، شاہ حسین، سلطان باہو، بابا بلھے شاہ، علی حیدر سید ہاشم شاہ کے علاوہ جدید پنجابی شعرا میں استاد اکرم، مولا بخش کشتہ، پیر فضل گجراتی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اور حلیم ناصر کے علاوہ ڈاکٹر رشید انور، سلیم کاشر، رؤف شیخ، منیر نیازی، بشیر منذر، اقبال صلاح الدین، حفیظ تائب وغیرہ کئی جدید ترین شاعروں کے افکار کا جائزہ لیا ہے۔

شہزاد احمد اور ذوالفقار احمد تابش کا اُردو کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ شہزاد احمد کی غزلوں کے کچھ اشعار حال ہی میں میری نظر سے گزرے ہیں ؎

بادلوں میں دیکھ پائے ہیں کوئی چہرہ نہ جسم ‏ ‏ ‏ اب تو لگتا ہے کہ یہ برسات خالی جائے گی

یہ ضروری تو نہیں گھر تک ہی آئے سیلِ غم ‏ ‏ ‏ کچھ نہ کچھ دیوار بھی آگے بڑھائی جائے گی

کیا دولتِ غم میری ہی جاگیر بنے گی ‏ ‏ ‏ کیا درد فقط درد کے ماروں میں رہے گا

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ عشائیہ محض سرِ ملاقات کی قسم کی ایک تقریب تھی جہاں مجھے بہت سے پرانے اور نئے ادیب مل گئے۔ یار لوگ وقفے وقفے سے قہقہے بھی

www.taemeernews.com

لگاتے رہے (تاکہ اُن کے وجود کا احساس ہوتا رہے) اور علمی و ادبی باتیں بھی ہوتی رہیں جن کا انداز سرگوشیوں کا سا ہی تھا کیوں کہ ایسے موقع پر کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایک فوٹو گرافر ایک کرسی پر پورے پانچ منٹ تک کھڑا اپنے کیمرے کی آنکھ سے شاید خواتین کو ہی گھورتا رہا۔ اُس میں سے فلیش کی بجلی نہ گری تو اظہر جاوید برہم ہو کر اُسے ریسٹوراں کی کھڑکی میں سے نیچے مال روڈ پر پھینکنے کے لئے تُل گیا۔ لیکن بیدار سرمدی نے جو قدرے دیر سے وارد ہوا تھا نوائے وقت کے فوٹو گرافر کو فون کر کے محفل کو برخاست ہونے سے کچھ دیر اور روک دیا۔ جب ہم سب نیچے اُتر کر ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے تو عطاء الحق قاسمی بھی اچانک پہنچ گئے۔ وہ میرے لئے "معاصر" کا خاص نمبر لے آئے تھے اور اپنے نوائے وقت کے کالموں کا مجموعہ 'روزن دیوار سے' بھی۔ "معاصر" کی ضخامت سات سو چون صفحات ہے اور انور سدید نے اس پر پورے سات صفحوں کا تبصرہ سرگودھا کے رسالے "اُردو زبان" میں کیا ہے۔ کئی اور رسالوں میں بھی معاصر پر تبصرے دیکھ چکا تھا۔ انور سدید کے تبصرے نے اِس رسالے کے بعض مضامین کو پڑھنے کی بھوک اور بڑھا دی تھی۔ رحیم گُل نے اپنی کتاب پورٹریٹ میں پاکستان کو چار گروپوں میں تقسیم کیا ہے۔ ادب کا سرگودھا گروپ، پنڈی کا فوجی گروپ، کراچی کا اہل زبان گروپ اور لاہور کا زبان دان (بروزن پاندان) گروپ۔ اور لاہور کے باب میں اُس نے ایک مضمون بہ عنوان لاہور کے تین ادبی فتنے میں خالد احمد اور گلزار وفا چودھری کے ساتھ عطاء الحق قاسمی کو بھی شریک کیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نہ صرف ادبی تقریبات برپا کرنے میں ماہر ہیں، بلکہ نوائے وقت میں ادبی کالم لکھنے کے لئے بھی بہت مشہور رہیں — احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ابن انشا، محمد اظہر اور محمد خالد اختر نے اُن کے کالم نویسی کے فن کی بڑی تعریف کی ہے۔ عطاء الحق کے یہاں اس دھار کی واقعی کوئی کمی نہیں جسے انتظار حسین کالم نگاری کے لئے بہت ضروری سمجھتے ہیں

www.taemeernews.com

عطا الحق قاسمی نے (جنھیں انور سدید نے احمد ندیم قاسمی کے احترام میں چھوٹے قاسمی صاحب کہنا شروع کر دیا ہے) اپنے ایک کالم شناخت پریڈ میں فیض احمد فیض کو بحر الہند، حفیظ جالندھری کو بحر ظلمات، عبد العزیز خالد کو بحیرۂ عرب، ڈاکٹر عبادت بریلوی کو بحر منجمد اور کشور ناہید کو اُردو شاعری کی نہر سویز قرار دیا ہے۔ کشور ناہید کی شخصیت اور شاعری پاکستان کی موجودہ ادبی فضا میں واقعی ایسی اہمیت کی حامل ہے کہ اُسے نہر سویز کے خوب صورت لقب سے یاد کیا جائے۔ اگرچہ منیر نیازی اس کے بارے میں دو اور دلچسپ فقرے اکثر کہا کرتا ہے۔ کہ میں اس سے اپنی بیوی کا پردہ کراتا ہوں اور وہ ایک ایسی خاتون ہے جو راستہ بھلا دیتی ہے۔ انتظار حسین اُسے اُردو شاعری کی پہلی باغی عورت کہتا ہے۔ اُس نے لکھا ہے۔ باغی عورتیں اُردو ادب میں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر فکشن میں۔ شاعری اس مخلوق سے ناآشنا تھی۔ اور غزل تو ہے ہی مردانہ طرزِ احساس کی شاعری۔ اُردو غزل کی تاریخ میں کوئی قرۃ العین شاعرہ نہیں گزری، اب کہیں جاکر کشور ناہید نے سر اُٹھایا ہے۔ کشور ناہید کی صورت میں ہماری غزل میں پہلی مرتبہ عورت کی آواز سنائی دی۔ باغی عورت کی آواز، اور صرف غزل میں نہیں پوری اُردو شاعری میں۔

کشور ناہید کا ذکر چل نکلا ہے تو ذرا اُس کے کچھ اشعار بھی یاد کرتے چلیں جو اُس کے مجموعۂ کلام گلیاں، دھوپ، دروازے، میں موجود ہیں ؎

مجھے خبر ہے مرے گھر میں سانپ آنکھیں ہیں ۔۔۔ وگرنہ غم کے خزینے چھپا کے رکھتی کیوں

تمھیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ ناہید ۔۔۔ نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا

آنکھیں خواب دکھا کے روٹھا کرتی ہیں ۔۔۔ زخم چھپے گا لب تک نئی لگانے سے
جھوٹا کھایا اور جھوٹے برتن دھوئے ۔۔۔ ہنس کے عمر گزاری یوں اجانے سے

---

www.taemeernews.com

شامل ہوں میں تیرے رت جگوں میں　　میں جاگتی آنکھوں کے خواب سوچوں
بانہوں کے سمندروں میں اُتروں　　آنکھوں میں لکھی کتاب سوچوں

تمھارے لب تھے کٹورے ہمارے ہونٹ تھے پیاس　　وصال تھا کہ تھی تصویرِ تشنگی آخر
فصیلِ جسم میں زنجیرِ دل ہلاتی ہے　　تمھاری یاد کہ موجود مجھ میں تھی آخر
شکستہ خوابوں کو جھولی میں باندھ کر رکھو　　فضاؤں پہ ہے ہوا کی سپہ گری آخر

ملی نہ لاش زمیں اور پانیوں میں کہیں　　اُسے ہی سارے زمانے سے خوش خبر جانا
لرز رہی ہے زمیں سہمی لڑکیوں کی طرح　　پکارتی ہے کہ تنہا نہ چھوڑ کر جانا
بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی　　زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

میرے اندر چھپ کے بیٹھا ہے مرا دشمن کوئی　　چھن گئی لذت مرے ہونٹوں سے بھی تقریر کی

ہماری بے گنہی پہ ہمارے ہاتھ کٹے　　وہ خلعتوں میں سرافرازے کے خنجر بھی

اگلے روز یعنی ۱۴ فروری کی صبح ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ سرگودھا کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میانوالی جاتے ہوئے سرگودھا راستے میں ہی پڑتا تھا۔ صبح سویرے پولیس اسٹیشن پر جاکر روانگی درج کرانی تھی۔ میری غیر حاضری میں نقوش کے مدیر محمد طفیل صاحب کا فون آیا تھا۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے بتایا کہ وہ کھانے کی دعوت دینا چاہتے تھے۔ آغا سہیل نے انھیں میرا پروگرام بتا دیا تھا۔ میں نے خود بھی انھیں فون کر کے شکریہ ادا کیا اور کہہ دیا کہ میانوالی سے واپس آکر رابطہ قائم کروں گا۔

سرگودھا جانے والی سڑک پر دریائے راوی کا پُل پار کرتے ہی پنجاب کا دیہاتی ماحول ملنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں، اِکّے، تانگے، ریڑھے، کھیت، نہریں، اونچی اونچی لہراتی ہوئی گیہوں کی سنہری بالیاں، ٹرکوں اور بسوں کی باڈیاں

www.taemeernews.com

رنگ برنگے بیل بوٹوں سے پُتی ہوئی۔ جیسے ہمارے مشرقی یوپی کے اضلاع میں دیہاتی مسلمان عورتیں چھاپے کے کپڑے کے برقعے اوڑھا کرتی ہیں۔ ہر بس اور ٹرک میں ڈرائیور کی سیٹ کے پاس رنگین چٹلّے لہراتے ہوئے۔ پتہ نہیں آٹو موبائلز کو عورتوں کے چٹلّوں سے کیا نسبت ہے؟ شاید اُن سے اُن کے ڈرائیور اپنی عورتوں کی طرح پیار کرتے ہیں!—

کل ڈاکٹر وزیر آغا کے پاس اوراق کے سالنامے کی ڈمی دیکھی تھی۔ اُس میں اُن کی ایک طویل نظم 'آدھی صدی کے بعد' کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا۔ جو وہ کائنات اور انسان کے ازلی رشتے پر لکھ رہے تھے۔ یہ نظم ابھی نامکمل تھی جو شاید ڈیڑھ دو سو صفحات پر پھیل کر تکمیل کو پہنچے گی۔ میری فرمایش پر انھوں نے اُس نظم کے سارے بند سُنائے جتنے چھپ چکے تھے—

شب کا پچھلا پہر
پھڑپھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور یورپ کے ماتھے پر
قشقے کا مدھم نشاں
رات — اِک آبنوسی
جواں رتھ
شرارے اُگلتے ہوئے اسپ وحشی
کے پلوسے بندھنے کو تیار!
ہلکی ہلکی ہوا
اور میں
اپنے معصوم دل میں
مسرّت کی دولت چھپائے

www.taemeernews.com

شکستہ سی اِک بیل گاڑی میں
خوشبو میں لپٹی ہوئی چھٹیوں کو
کھلونوں کی صورت
دھڑکتے ہوئے اپنے سینے سے بھینچے

نظم سُنتے سُنتے پتہ ہی نہ چلا کہ چیچوں کی ملیاں، شیخوپورہ اور چنیوٹ کے قصبے بھی نکل گئے۔ اگرچہ میں کھُلی آنکھوں سے سڑک کے دونوں طرف کی بستیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ حیران بھی ہو رہا تھا کہ میں کبھی اپنے مغربی پنجاب کے بالکل اندر سے ہو کر اس طرح جا سکوں گا۔ پورے علاقے کا وہی نقشہ تھا جس طرح اسے تینتیس ۳۳ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ کسی فیکٹری یا کارخانے کی ایک بھی چمنی نہیں دکھائی پڑی۔ ہر جگہ کے لوگ بھی اُن ہی لباسوں میں تھے۔ کُرتا تہمد، قمیص شلوار اور پگڑیاں۔ چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے مینار اور گنبد بھی بہ کثرت نظر آئے لاہور جیسے بڑے شہر اور ان قصبوں کے لوگوں میں جو فرق پہلے موجود تھا وہ اب بھی ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سرگودھا اور ملتان بھی ضلعی شہر ہیں جہاں اتفاق سے ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، غلام جیلانی اصغر جیسے دانش ور پیدا ہو گئے ہیں، اور وہ ابھی تک اپنے اپنے ماحول سے چمٹے ہوئے ہیں۔ بڑے شہر کے ساتھ اُن کا رشتہ اپنی ضروریات کی وجہ سے ہے ورنہ ادیبوں کا جمگھٹ تو لاہور میں ہی ہے ہمیشہ کی طرح۔ ہمارے یہاں بھی بڑے بڑے شہر علم و ادب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں کے دانش ور اسی طرح کے جزیروں میں رہتے ہیں۔

پنڈی بھٹیاں میں گاڑی رکوا کر ڈاکٹر وزیر آغا نے میرے لئے سگریٹ کا پیکٹ منگوا دیا۔ اُسی وقت کچھ گرمی کا احساس ہوا تو میں نے کوٹ اُتار کر آگے ڈرائیور کے پاس خالی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی پھر روانہ ہوئی تو ہم لوگ پنجاب اور ہندوستان کے اُردو کے مراکز دہلی اور لکھنؤ کے اُردو الفاظ کے تلفظ پر گفتگو کرنے لگے۔ پنجاب کے اہلِ قلم عام پنجابیوں سے ذرا بہتر اُردو بولتے ہیں۔

www.taemeernews.com

لیکن اُن کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اُردو الفاظ کے تلفظ کے اختلاف نے قریباً ساٹھ ستر سال سے اہلِ زبان اور زبان داں لوگوں کے درمیان ایک ذہنی تناؤ پیدا کر رکھا ہے۔ میں نے اُنھیں بتایا پانچویں دہائی میں کسی جلسے میں میری کہانی سن کر احتشام حسین صاحب نے بعض الفاظ کے تلفظ کے بارے میں بڑی نرمی سے مجھے باخبر کیا تھا۔ اور میری یہ اب تک عادت بنی ہوئی ہے کہ اہل زبان کے بولتے وقت میں اپنے کان ہمیشہ کھلے رکھتا ہوں اور جس لفظ کا صحیح تلفظ پہلی بار سنتا ہوں تو اُسے چپکے سے نوٹ کر لیتا ہوں۔ ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ پنجاب میں سالہا سال تک صحیح اُردو بولنے کے لئے تربیت نہیں ہوتی رہی۔ اور اس بات پر مسرور بھی تھے کہ ہم اپنے لب و لہجہ کی وجہ سے اہل شمال ہونے کی ایک شناخت بھی رکھتے ہیں، اور یہی شناخت اُردو زبان کا ایک قابلِ قدر رنگ بھی ہے۔ اِس میں لسانی عصبیت کو کسی طرح دخل انداز ہونے کا حق نہیں دیا جانا چاہیئے۔ میں نے جب ڈاکٹر آغا کو یہ بتایا کہ اب تو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ بھی پنجابیوں کی کثرت کی وجہ سے غلط سلط اُردو بولنے لگے ہیں تو وہ زور سے ہنس پڑے۔ زبانیں کبھی ایک سی نہیں رہیں۔ اس سے سنسکرت، انگریزی، عربی اور فارسی بھی نہیں بچ سکیں۔

چناب کا پُل پار کرتے ہی مجھے پنجاب کے لوک گیت اور وہاں کی لوک کتھائیں یاد آگئیں۔ اس دریا نے کتنے شاعروں کو متاثر کیا ہے اور وہ آج کل اسے جدید شاعری میں بھی علامت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

ہم چناب پار کرتے ہی احمدیوں کی بستی ربوہ کے پاس سے گزرے جنھیں حکومت پاکستان نے اب غیر مسلم قرار دے دیا ہے۔ سرگودھا اب بہت دور نہیں رہ گیا تھا۔ وزیر کوٹ ڈاکٹر وزیر آغا کا آبائی گاؤں ہے جہاں اُن کی کئی سو ایکڑ سونا اُگلنے والی زمین ہے۔ وہاں سڑک کے کنارے اُن کا ایک ملازم ہمارے لئے کھانا لئے کھڑا تھا۔ اُسے بھی گاڑی کے اندر بٹھا لیا گیا، اور پھر ہم

www.taemeernews.com

سرگودھا میں داخل ہو گئے، پنجاب کے کسی بھی اوسط درجے کا ایک ضلعی شہر۔ چھوٹی چھوٹی بڑی بڑی دکانیں، یک منزلہ دو منزلہ مکان اور اسکولوں اور کالجوں سے لوٹتے ہوئے لڑکے۔ پیدل یا سائیکلوں پر۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کوٹھی شہر کے باہر، لیکن آبادی میں گھری ہوئی تھی۔ اُن کے بیوی بچے لاہور میں تھے باہر کے کمرے میں کئی صوفے، چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور دو بڑے پلنگ بھی بچھے تھے۔ دیواروں پر ایک ہی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی عوامی رقاصہ کی کئی تصویریں آویزاں تھیں۔ رقص کے مختلف اندازوں میں۔ میں جب باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلا تو ڈاکٹر آغا کو فون پر کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پایا۔ اُن کے ڈرائیور اور ملازم ایک طرف باادب کھڑے تھے۔ وہ سب ڈاکٹر صاحب کو احترام سے میاں جی کہتے تھے۔ ایک ممتاز شاعر، نقاد، انشائیہ نگار اور صحافی کے نام کے ساتھ میاں جی بھی جڑا ہوا سنا تو مجھے بے اختیار احمد ندیم قاسمی یاد آ گئے جنھیں گاؤں کے لوگ اسی طرح احتراماً شاہ جی کہا کرتے تھے۔ شاید اب بھی کہتے ہوں۔ اور اُردو کے جدید شاعر منیر نیازی کے بارے میں بھی کسی سے سُنا ہے کہ لوگ انھیں خاں صاحب بھی کہہ کر پکارتے ہیں۔ پنجاب میں شاید اور بھی کئی اہلِ قلم ہوں گے جن کے جانے پہچانے ناموں کے علاوہ بھی القاب ہوں گے۔

تھوڑی دیر میں سجاد نقوی، غلام جیلانی اصغر، خورشید رضوی، راغب شکیب اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی آ گئے۔ گویا بہ قول رحیم گل پورا دبستانِ سرگودھا جمع ہو گیا۔ یہ سارے اہلِ قلم اُردو ادب کے معروف نام ہیں۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور باتیں بھی چلتی رہیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اپنے درمیان دیکھ کر غلام جیلانی اصغر کو آزادی کے فسادات یاد آ گئے۔ شاید میں بہ طور بھارتی ادیب ایک طویل مدت کے بعد وہاں پہنچا تھا اور میرے ساتھ ہندوستان کی تقسیم اور فسادات کا پورا دور بھیانک یادوں کی شکل میں وابستہ تھا۔ اصغر صاحب نے مشرقی پنجاب کے خوں ریز اور انسانیت سوز واقعات کا ذکر چھیڑ دیا جو سراسر مسلمان مہاجروں پر ڈھائے گئے مظالم سے متعلق تھے۔ میں خود اپنی آنکھوں

www.taemeernews.com

سے اُس زمانے میں کئی واقعات دیکھ چکا تھا جب میں اپنے خاندان کے ساتھ جالندھر کی ایک تحصیل نواں شہر دوآبہ میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ ایک بار میرے دادا مرحوم کو اُن کے لباس جو سفید تہمد کرتا اور پگڑی پر مشتمل تھا اور سر پر بالوں کے پٹوں اور ترشی ہوئی داڑھی مونچھوں کی وجہ سے جن کے درمیان سُنت بھی بنی ہوئی تھی مسلمان سمجھ کر سکھوں اور ہندوؤں نے گھیر لیا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے اُن کی اُن کی جان بچائی تھی۔ راجپورہ ریلوے اسٹیشن پر مجھے بھی ننگا کر کے دیکھا گیا تھا کیوں کہ میں بھی قمیص شلوار کی وجہ سے مسلمان نظر آتا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اُسے اُس زمانے میں لکھی ہوئی اپنی کئی کہانیوں کا موضوع بنایا تھا ــــ ایک عورت تھی علاجِ غم دینا تو نہ تھی، نئی دھرتی پرانے گیت، نصیب جلی، ایک شہری پاکستان کا، انقلاب آنے تک، وغیرہ میں۔ میرے ذہن میں مغربی پنجاب کے بھی ایسے کئی واقعات محفوظ تھے جو میانوالی، شیخوپورہ، لائل پور، جڑانوالہ، لاہور وغیرہ کے لوگوں نے ہندوستان میں پہنچ کر سُنائے تھے۔ اُن میں بیشتر تو افواہوں کی وجہ سے پھیلتے چلے گئے تھے۔ لیکن اُن لمحوں میں جب میرے سامنے صرف یک طرفہ واقعات کا بیان ہو رہا تھا تو اچانک میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو گئی۔ شاید ڈاکٹر وزیر آغا نے اُس کو بھانپ کر فوراً کہہ دیا ــــ "ظلم کہاں نہیں ہوئے تھے۔ اِسی شہر میں میرے سامنے ایک پٹھان نے اپنی جیبوں میں سے بے شمار گلے اور کانوں کے زیوروں کا ڈھیر سا لگا دیا تھا جن کے ساتھ کتنی عورتوں کے خون آلود کانوں کے ٹوٹنے تک لٹک رہے تھے۔" یہ سنتے ہی کمرے میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اور میرے اندر ایک عجیب سا بے رحمانہ اطمینان بھی پیدا ہو گیا۔ جیسے یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ میری ہم مذہب عورتوں کے ساتھ بھی ویسی ہی سنگ دلی کا سلوک کیا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ظلم اور سفاکی اور وحشت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم سب کے چہروں پر اچانک جو خاموشی نمودار ہو گئی تھی وہ اُن واقعات سے کہیں زیادہ گہری اور تکلیف دہ تھی۔ انصاف اور اپنے علم و ادب کی عدالت میں ہم سب مجرم تھے۔ ہمارے

www.taemeernews.com

آبا و اجداد بھی مجرم تھے۔ تاریخ کے اوراق کتنے معصوم انسانوں کے قتل سے داغ دار ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی نسلی و جنگی لوٹ میں زر و جواہر کے ساتھ ساتھ کتنی بار عورتوں کو بھی بھیڑوں بکریوں کی طرح اپنے آگے آگے ہانک کر نہیں لے جایا گیا۔ یوں تو ہر مذہب عورت کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن کتنی قومیں آج بھی دولھا کے لئے شادی کے وقت تلوار اور گھوڑے کی موجودگی شادی کا لازمی جزو سمجھتی ہیں۔ دولھا کو ہمیشہ ایک فاتح کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ عورت اور اُس کے جہیز کا۔

سرگودھا سے میں روانہ ہوا تو میرا دل ایک بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اگرچہ ہم سب ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے سے گلے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے، میں نے جب غلام جیلانی اصغر کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچا تو ڈاکٹر وزیر آغا مسکرا کر بولے:۔

"ذرا احتیاط سے۔ یہ چینی کے بنے ہوئے ہیں!"

غلام جیلانی اصغر واقعی بہت ہی دبلے پتلے اور منحنی انسان ہیں۔ میں نے گھبرا کر اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پہلے اُس کی پسلیاں گنیں جو خدا کا شکر ہے کہ پوری اور صحیح و سلامت تھیں پھر اُن کے گالوں پر بوسہ دے کر انھیں اپنی غریب الوطنی کی کیفیت سے بھرپور شہزاد احمد کا ایک شعر سُنایا ؎

بادل کی طرح توڑ دیا خاک سے رشتہ
سورج مجھے سینے سے لگاتا نہیں پھر بھی

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کار میں میرے لئے اپنے دو ڈرائیور ساتھ کر دیئے تھے تاکہ مجھے میانوالی پہنچنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ میں نے اُن سب کو ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکراتے ہوئے الوداع کہی۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔

یار زندہ صحبت باقی ۔

ہ کہ ہ

www.taemeernews.com

گواہ رہنا میں ایک بار لوٹ کر آیا تھا!

۷

سرگودھا سے میانوالی کا سفر میرے لئے نیا نہیں تھا۔ اس راستے سے میں ریل اور بسوں کے ذریعے کئی بار آیا گیا تھا۔ لیکن یہ جو تیس برس پہلے کی بات ہے ایک مرتبہ لاہور سے لوٹتے ہوئے کسی نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا تھا اور مجھے سرگودھا اتر کر پولیس اسٹیشن پر رپورٹ درج کرانی پڑی تھی۔ جس ہیڈ کانسٹبل نے رپورٹ لکھی تھی اس نے یہ بھی چاہا تھا کہ میں اس کے ساتھ قادر آباد گاؤں میں جا کر چور پکڑنے میں مدد کروں اور اپنے کپڑوں وغیرہ کی جو اس سوٹ کیس میں تھے شناخت بھی کر دوں

www.taemeernews.com

میں اُس کی چالاکی بھانپ گیا تھا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں اچانک یہ بات بھی سوجھ گئی تھی کہ اُسے اب کچھ دے دلا کر پنڈ چھڑاؤں۔ سامان تو کیا ملے گا اُلٹا مجھے مزید پریشانی میں مبتلا ہونا پڑ جائے گا۔ میں اُس کی ہتھیلی پر ملکہ وکٹوریہ کا چاندی کا چمکتا ہوا سکہ رکھ کر دوسری گاڑی سے اپنے گھر روانہ ہو گیا تھا۔

اسی پراستے پر چنیوٹ کے قریب ایک شخص گرمیوں کی راتوں میں گاڑیوں کے آنے جانے کے وقت ایک لمبی کانٹے دار جھاڑی لے کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ پنجاب کے لوگ جو سروں پر پگڑیاں باندھے کھڑکیوں میں سر رکھ کر سو جاتے تھے اُن کی پگڑیاں جھاڑی کے ساتھ لگ کر کر درجنوں کی تعداد میں نیچے گر جاتی تھیں اور وہ شخص پگڑیاں اکٹھی کر کے اپنے وارے نیارے کر لیتا تھا۔ یہ واقعہ مجھے میرے والد نے مجھے بچپن میں بتایا تھا اور میں نے اُس کردار پر بیس پچیس برس کے بعد ایک کہانی 'تیرے بچے جئیں' لکھی تھی۔

ایک بار لاہور جاتے ہوئے میں رات کے وقت خوشاب اسٹیشن پر پانی پینے کے لئے اُتر پڑا تھا اور گاڑی چل دی تھی۔ میں بھاگتے ہوئے جس ڈبے کا ہینڈل پکڑ کر فٹ بورڈ پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ اتفاق سے ایک زنانہ ڈبہ تھا اور اُس میں ایک معمر خاتون بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔ میں نے بہت التجا آمیز لہجے میں اُس سے دروازہ کھول دینے کے لئے کہا تھا، کیونکہ ہر لمحہ گر پڑنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اُس نے نماز چھوڑ کر میرے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کو میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے اگر اُس نے دروازہ نہ کھولا ہوتا اور میں گر گیا ہوتا تو شاید آج میرا وجود بھی نہ ہوتا۔

جہلم پُل کے پار میں نے ایک ہاتھی جتنے بڑے ٹرک کو اُلٹے پڑے ہوئے دیکھا جس میں لکڑیوں کے لٹھے لدے ہوئے تھے۔ اُسے دیکھ کر ایک مرے ہوئے ہاتھی کا ہی تصور میرے ذہن میں اُبھرا۔ لیکن ہم تینوں نے (دو ڈرائیور کار میں آگے بیٹھے تھے) اس کی طرف ایک عجیب سی خاموشی سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے لکھنؤ

www.taemeernews.com

میں رہتے ہوئے کتنی مرتبہ اپنے سابق وطن کی اس سمت میں دیکھا تھا۔ جب بھی سورج ہمارے سر پر سے ہوتا ہوا مغرب کی طرف سفر کرجاتا تھا۔ میرے لئے ایک مغرب یہ بھی تھا اور میں اب اسی مغربی علاقے میں لال لال شفق کو دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس پڑھنے کے لئے اوراق کے دو گذشتہ نمبر اور کچھ اور کتابیں بھی رکھی تھیں۔ لیکن میں اُس وقت پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دونوں طرف کے کھیتوں، درختوں اور اُن کے اوپر چھائے ہوئے آسمان کو بڑی خاموشی سے دیکھتا جارہا تھا۔ میں دھیرے دھیرے اُس سرزمین کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں پہنچنے کے لئے میں نے بے شمار خواب دیکھے تھے۔ لیکن یہ یقین کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں واقعی کسی روز وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا اس وقت وہاں کئی لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ محمد رمضان کانجو نے صبح فون پر لاہور میں میرا پروگرام معلوم کرلیا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا اگر میں ٹرین سے پہنچوں تو شہر کے بے شمار لوگ وہاں میرا استقبال کریں گے۔ لیکن میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ میں چھ بجے کے قریب سلطان میڈیکل اسٹور پر کار سے پہنچ جاؤں گا۔

چھ بجے کار کمپنی باغ روڈ سے ہوکر گورنمنٹ ہائی اسکول کی طرف مڑی۔ (جو اب گورنمنٹ گرلس کالج ہوگیا ہے) تو میرے ذہن میں سوئے ہوئے سارے نقشے پھر سے بیدار ہوگئے۔ میرا جی چاہا گاڑی رکوا کر اور باہر نکل کر میں اس دھرتی کو چوم لوں۔ لیکن ڈرائیور بڑی تیزی سے اُسے مارٹن انڈس جانے والی ریلوے لائن کے پھاٹک کے پار لے آیا اور پھر رفتار کو مدھم کرکے پوچھنے لگا۔ "اب کس طرف جانا ہے جناب!"

میں نے کہا۔ "دائیں ہاتھ پر میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے۔ تم بائیں ہاتھ ریلوے روڈ کی طرف مڑ جاؤ۔ اسٹیشن کے سامنے ایک لمبا بازار آئے گا۔ ہم اسی بازار میں جاکر سلطان میڈیکل اسٹور پوچھ لیں گے۔ غلہ منڈی کے سامنے ہوگا۔"

میرے بچپن کے دوست سلطان احمد کنڈی نے آزادی کے بعد ہی ریلوے ورک شاپ کی نوکری چھوڑ کر میڈیکل اسٹور کھول لیا تھا۔ آزادی کے وقت

www.taemeernews.com

وہ دلّی میں تھا۔ فسادات میں ہی وہ کسی طرح بچ کر آگرے چلا گیا تھا، وہاں سے بہار کی طرف نکل گیا تھا اور بالآخر اپنے وطن واپس آگیا تھا۔ میں نے جنوری یا فروری ۱۹۴۸ء میں بنارس سے اُس کے بڑے بھائی محمد یوسف کو خط لکھ کر اُس کی خیریت دریافت کی تھی اور چاہا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے ہی کسی شہر میں ہو تو اُسے اپنے پاس بلا لوں۔ لیکن جواب میں خود سلطان کا ہی میانوالی سے خط آگیا تھا۔ اُس کے بعد سے ہماری خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ جنگوں کے زمانے میں عارضی طور پر ٹوٹ جاتا تھا تو پھر جاری ہو جاتا تھا۔

ریلوے روڈ پر دُکانیں جگمگا رہی تھیں۔ اگرچہ وہاں اب موبل آئل کے ڈرم پڑے ہوئے دکھائی نہ دیئے جو میری کسی نہ کسی کہانی میں اچانک شامل ہو گئے تھے۔ اور برف کا کارخانہ بھی نظر نہ آیا اور رنگینہ جان طوائف کا وہ اڈہ بھی موجود نہیں تھا جسے میں اپنی نوعمری میں آتے جاتے گھور گھور کر دیکھتا ہوا گزر جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ ایک روز اپنے اڈّے کے سامنے چارپائی پر مہین ململ کا سفید کرتا اور تہمد پہنے ہوئے بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اُس کے کرتے میں سے اس کا شہابی بدن جھانک رہا تھا۔ وہ ہر روز شام کو موتیا کے پھولوں سے سج دھج کر شہر کے سب سے خوب صورت تانگے پر ایک بار بازار سے ضرور نکلتی تھی۔ ایک اور تانگے پر اس میدان میں نسبتاً نو وارد ایک اور بالو نام کی طوائف بھی ویسی ہی سج دھج کے ساتھ دائیں بائیں آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھتے ہوئے راہ گیروں اور دوکان داروں کی طرف بڑی شوخی سے ہنس ہنس کر آنکھیں مارتی ہوئی نکل جاتی تھی۔

مال گودام کی چھوٹی سی پرانی عمارت کے آس پاس، ونچے اونچے دو اور شیڈ بنا دیئے گئے تھے۔ گیہوں کے اسٹاک رکھنے کے لئے۔ دائیں طرف پہلے ایک سٹی پولیس اسٹیشن ہوا کرتا تھا اب اس کی جگہ فوٹو گرافر اور کیسٹ بیچنے والوں کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور عطاء اللہ عیسےٰ خیلوی کی گمبھیر اور جوان آواز گونج رہی تھی۔

www.taemeernews.com

اللہ نہ بھلاوے تاں ماہی والی ٹور ہے
(اللہ نہ بھلاوے تو اس کی چال میرے محبوب جیسی ہے)

پاکستان کے مشہور شاعر محمد اجمل نیازی نے لکھا تھا کہ آج کل عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے کیسٹ سندھ کے ریگستانوں، پنجاب کے کھیتوں، اور کافرستان کے پہاڑوں میں بھی گونج رہے ہیں۔

دکانوں کے اسی سلسلے میں جوتوں اور چپلوں کی دکانوں کے ساتھ کئی ریسٹوراں دکھائی دیئے جہاں پہلے سوڈا واٹر، قلفیاں، فالودے، سات سات فٹ اونچے گنے اور مٹھائیاں بیچنے والوں کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے عین سامنے ایک نیا تانگہ شیڈ بنا ہوا نظر آیا۔ اور پھر ہم ریلوے اسٹیشن کے سامنے پہنچ گئے، جس کی وہی پرانی عمارت تھی۔ پرانا مسافر خانہ تھا۔ پرانا چنگی گھر تھا جسے میں نے اپنے افسانے 'داماد' میں پیش کر دیا تھا۔ وہاں بیچوں بیچ ایک فوارہ دکھائی دیا جو نیا بنا تھا۔ میانوالی کا سیدھا، اور لمبا بازار جو میلہ مویشیاں میدان تک چلا گیا تھا ہمارے شہر کی خاص پہچان تھی۔ دونوں طرف یک منزلہ دکانیں تھیں اور لوگوں کی بھیڑ تھی۔ لیکن مجھے ایسے لگا جیسے راستہ کچھ تنگ سا ہو گیا ہے۔ بازار تو پہلے خاصا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ شاید میں ہی تب بہت چھوٹا تھا اس لئے وہاں کی ہر چیز بڑی اور کشادہ معلوم ہوتی تھی۔ میں ایک عجیب سی مسرت اور خاموشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے اس شہر کے بازار میں داخل ہوا جہاں میں بچپن میں اپنے دادا، والد اور چچا کی انگلی پکڑ کر گزرتا تھا۔ اسی بازار میں میں نے پہلی بار بارہ سال کی عمر میں سائیکل چلائی تھی اور ایک بار بھی نہیں گرا تھا۔ یہاں میں ہمیشہ شلوار اور قمیص پہن کر آتا جاتا رہا تھا اور ۱۹۳۸ء کے بعد لاہور میں جا کر رہنے کے بعد کوٹ پینٹ پہن کر واپس آیا تھا تو کئی ہم وطن میری طرف حیرت سے بھی دیکھتے تھے اور طنز بھی کرتے تھے۔ اسی بازار میں آس پاس کے دیہات سے آئے ہوئے دہقان کندھوں پر بندوقیں اور پیتل کے کوکوں سے جڑی ہوئی اور تیل پلائی ہوئی لمبی لمبی لاٹھیاں رکھ کر

www.taemeernews.com

آتے تھے۔ وہ کبھی کبھی اچانک بازار میں لڑ بھی پڑتے تھے۔ دو ایک آدمی مرجاتے اور درجن بھر زخمی ہوکر گرجاتے۔ پھر پولیس آجاتی اور سارا بازار آناً فاناً بند ہوجاتا تھا۔ اِسی بازار کی رونق کو ایک ہولناک سناٹے میں تبدیل کردینے کے لئے کبھی کبھی وہاں کے غنڈے بھی کامیاب ہوجاتے تھے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہاں ہمیشہ انگریز ڈپٹی کمشنر مقرر ہوتا تھا۔ جو اس بازار میں کبھی نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ سول لائنز کے علاقے میں پیڑوں اور پھولوں سے گھرے ہوئے بنگلے میں رہتا تھا، جس کے سامنے کی پکی سڑک پر کبھی کبھار انگریز گورنر کی آمد پر اسکول کے ہزاروں بچوں کو چھوٹے چھوٹے یونین جیک پکڑ کر گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہنا پڑتا تھا اور "گاڈ سیو دی کنگ" گانا پڑتا تھا۔ اُس کے بعد ہر ایک بچے کو چار چار لڈو ملتے تھے اور وہ خوشی سے ہنستے ہوئے اور اُچھلتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ کیونکہ اُس کے بعد اسکول میں چھٹی بھی کردی جاتی تھی۔ میں بھی اپنے بچپن میں ایک ہاتھ سے کاغذ کا یونین جیک اُٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے لڈو کھاتا ہوا اِسی بازار میں سے واپس آتا تھا۔ یونین جیک لہرانے والوں میں سے کتنے بچوں نے بڑے ہوکر ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ لیا تھا اِس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اِسی بازار میں ایک بار کالے ٹیکسوں کے خلاف احتجاجاً ہڑتال ہوئی تھی اور اُس میں میرے والد صاحب کو بھی ایک دن کے لئے جیل جانا پڑا تھا۔ اِسی بازار میں سے رام لیلا اور ہولی کے جلوس اور محرم میں تعزیے بھی نکلتے تھے۔ اور کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں آزادی ملنے کے دن قریب آتے گئے اور سیاسی تناؤ بڑھتا گیا تو ۱۹۴۶ء میں پہلی بار یہاں کے ہندوؤں نے جو صرف سات فی صدی تھے۔ لیکن بازار کی دوکانوں اور شہر کے مکانوں کے اسّی فی صدی مالک تھے۔ پاکستان بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ فرقہ وارانہ جھگڑے سے بچنے کے لئے رام لیلا اور دسہرہ نہ منانے کا

www.taemeernews.com

فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے اپنی عزّت کی خاطر پولیس کی بہت بڑی جمعیت بھیج کر انھیں یہ تہوار منانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہماری کار اچانک ایک جگہ رک گئی تو کئی لوگوں نے آکر مجھے گھیر لیا۔ وہ پیچھے پیچھے چلتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اُن میں میرا بچپن کا ساتھی سلطان احمد کنڈی، فضل رحمان، محمد اجمل نیازی، شمیم احمد، ملک محمد اسلم کلیم اللہ، سلیم احسن نیازی، فیروز شاہ اور کئی دوسرے تھے۔ باہر آکر میں ہر ایک کے ساتھ گلے سے لگ لگ کر ملا۔ سلطان کا سر بھی میرے سر کی طرح بالکل سفید ہو چکا تھا۔ جوانی میں بچھڑے اب بڑھاپے میں مل گئے تھے۔ اس میں یقیناً پاکستان سرکار کا ہاتھ تھا۔ وہ اجازت نہ دیتی تو میں چونتیس برسوں کے بعد وہاں پہنچ کر اپنے کھوئے ہوئے نشانات کو پھر سے کیسے دریافت کر سکتا تھا۔ فضل رحمان آزادی کے بعد پیدا ہوا تھا لیکن اُس کے ساتھ بھی ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اُس نے چند برس پہلے میرے گھر اور اسکول کی کئی تصاویر اُتار کر مجھے لکھنؤ بھجوائی تھیں۔ سلطان اُس کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور اُس نے مجھے اپنے مکان کی طرف سے ایک طویل خط لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا۔ میرے مکینوں کو میری دعائیں پہنچیں جو اگر زندہ ہیں اور کہیں بھی رہ رہے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن اپنی کمزور بنیادوں پر ابھی تک کھڑا انتظار کر رہا ہوں کہ کبھی تو انھیں پھر سے دیکھ سکوں گا۔ جو میری گود میں پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے اور پھر مجھے اچانک چھوڑ کر چل دیئے۔ سلطان کے یہ تاثرات پڑھ کر اب بھی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اپنے بچپن کے یار کو میں نے بار بار سینے کے ساتھ لپٹایا اور اُسے چوما اور اُس کی آنکھوں میں ڈوب ڈوب کر دیکھا، لیکن وہاں تو آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ بار بار اپنے آنسو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیتا تھا۔ محمد اجمل نیازی گورنمنٹ کالج میں اُردو پڑھاتا ہے۔ بڑی خوب صورت داڑھی رکھتا ہے۔ پورا درویش لگتا ہے۔ اُردو اور میانوالی کی زبان میں شاعری کرتا ہے۔ اور مجھ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ اُسے اِس بات پر فخر ہے کہ میں اُردو کا ایک ادیب ہوں اور میانوالی کا

www.taemeernews.com

ہوں۔ جو میری کہانیوں میں سے آج تک غائب نہیں ہو سکا۔ شمیم احمد خاں ملک محمد اسلم اور فیروز شاہ مختلف شعبوں کے اُستاد ہیں۔ اُردو ادب نے میرے ڈانڈے نئی نسل کے ساتھ بھی ملا رکھے ہیں ــــ

فضل رحمٰن نے کہا۔ "آپ کی کار ٹھیک اُس جگہ آکر رُک گئی ہے جہاں کبھی آپ کے والد کی دوکان تھی۔ دیکھ لیجئے۔"

میں نے بڑی حیرت سے دو تین بند دکانوں کی طرف دیکھا۔ اُن میں سے کون سی ہماری دُکان تھی۔ میں نے ایک دو منزلہ دُکان کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا۔ اُس کے ساتھ کی ایک دُکان چھوڑ کر اپنی دکان کو پہچاننے کی کوشش کی۔ سارے سائن بورڈ بدل چکے تھے۔ رات اُتر رہی تھی۔ بتیاں گُل ہو رہی تھیں۔ میں دوستوں کے گھیرے میں کھڑا ہوا خاموشی سے اُس دکان کے بند دروازوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اسکول سے لوٹ کر میں شام تک یہیں پڑھتا رہتا تھا۔ اپنے والد اور چچا کی کڑی نظروں کے سامنے۔ کپڑے کی اس دوکان سے مجھے ہر قسم کا لباس بنوانے کی آزادی حاصل رہی تھی۔ اسی دوکان کے اندرونی حصے میں ایک بار مجھے ایک بچھو نے ڈنک مار دیا تھا، اور میرے پاؤں کو جھاڑنے کے لئے ایک ایسے شخص سُکھا کو بلوایا گیا تھا جو وہاں کا ایک نامی غنڈہ تھا اور وہ کئی سال بعد ایک عورت کے قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اسی دُکان پر میں نے ایک مرتبہ ایک اکنی چرائی تھی اور اپنے والد سے پہلی مرتبہ مار کھائی تھی۔ اسی دکان پر ہمارا دھوبی رحمان کپڑے دھو کر دے جاتا تھا اور میرے والد اپنے ہاتھوں سے مجھے کپڑے پہناتے تھے اور خود ہی میری قمیص کے بٹن بند کرتے تھے ــــ

میرا قیام سلطان احمد کے گھر پر تھا۔ وہاں سے میں چائے پی کر دوستوں کے ہجوم کے ساتھ پھر نکل پڑا۔ نیا پولیس اسٹیشن پڑوس میں ہی تھا۔ وہاں اپنی آمد کی رپورٹ لکھوا کر بازار اور گلیوں میں گھومتا پھرا۔ ایک گلی جو میری نانی کے گھر کو جاتی تھی۔ ایک گلی سناتن دھرم مندر کو اور ایک فتح محمد کی میت (مسجد)

www.taemeernews.com

کے نام سے موسوم تھا۔ اُس کے سامنے ملک مظفر اسٹریٹ تھی۔ اسی گلی میں میں نے ایک بار اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ لڑائی لڑی تھی۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو کتابوں کے جزو دانوں سے مارا تھا۔ ملک مظفر چونکہ میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر تھا اِس لئے یہ گلی ہمیشہ پکّی بنائی جاتی تھی۔

ہر شہر اپنی گلیوں، بازاروں اور خاص خاص عمارتوں کی وجہ سے اپنی ایک پہچان رکھتا ہے۔ لیکن وہی گلیاں اور بازار وہاں کے باسیوں کے لاشعور میں بھی مستقل طور پر چلے جاتے ہیں۔ وہ زندگی بھر ان ہی کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ میں اس ماحول سے دور جاکر انھیں کبھی بھُلا نہیں پایا تھا۔ آنکھیں بند کرکے ہر کہیں گھوم پھر سکتا تھا۔ کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات کو یاد کرسکتا تھا جن کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اہمیت اُسی وقت واضح ہوتی ہے جب انسان اُن سے بچھڑ جاتا ہے اور وہ خوابوں اور یادوں میں پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ گلیاں تاریک اور خاموش تھیں۔ پہلے سے کہیں زیادہ چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی تھیں یا آس پاس کے سارے مکان ہی میرے قریب سرک آئے تھے۔ ہر مکان کے ساتھ میری کوئی نہ کوئی یاد ضرور وابستہ تھی۔ اِس گلی میں میرے والد نے جب دوسری شادی کی تھی تو عید دوسرے روز اپنے چچا کی اُنگلی پکڑ کر دعوت میں گیا تھا وہاں میں نے بینڈ باجا جانے والے پہلی بار دیکھے تھے۔ سامنے کے مکان میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا جس نے میرے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے سے انکار کردیا تھا کیوں کہ میرے چھوٹے بھائی کو ٹی بی کا مرض ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں ایسے گھر میں رشتہ نہیں دیا جاتا تھا جہاں ٹی بی جیسا موذی مرض گھُس گیا ہو۔ ساتھ ایک اور مکان ایک رائے صاحب کا تھا جو انگریزوں کی نمک خواری کے لئے مشہور تھا۔ اسی مکان میں مارچ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ تناؤ میں میرے گھر کے لوگ رات کو پناہ لینے کے لئے چلے آتے تھے اور رات بھر بندوقیں لئے چھتوں پر پہرہ دیا کرتے تھے۔ آگے میانوں کے کھیت تھے جن کے کنویں پر میں بے شمار بار نہانے کے لئے گیا تھا۔ اور وہاں میں نے پہلی بار ایک اونٹ کو بھی ذبح ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اونٹ کے گوشت میں سے حصہ لینے کیلئے

www.taemeernews.com

آس پاس کے کتنے غریب مسلمان اور فقیر گھنٹوں بیٹھے انتظار کرتے رہتے تھے۔ اُسی کھیت کے جسے ہم اب بھی اینٹھا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سامنے سندھوا سٹریٹ میں ہمارا مکان تھا۔ ہم سب اُس کے سامنے جاکر رُک گئے۔ فضل رحمان نے اِسی دروازے کی جو تصویر مجھے بھجوائی تھی اُس پر چاند اور تارا بنا ہوا تھا۔

چاند اور تارا اس وقت بھی موجود تھا۔ میں کتنے لمحوں تک بند دروازے کو دیکھتا سا رہ گیا۔ قریباً پندرہ فٹ اونچا اور آٹھ فٹ چوڑا جس میں سے اونٹ بھوسے کے ترنگڑ (جال) لادے ہوئے بڑی آسانی سے اندر چلا جاتا تھا۔ اوپر ایک اینٹ کی چوڑی دیوار تھی جو میرے بڑے چچا اور ہمارے پڑوسی جیل کے ڈاکٹر کے گھر سے ملا دیتی تھی۔ یہ وہی دیوار تھی جس پر سے میں بلا خوف و خطر بھاگتا ہوا نکل جاتا تھا۔ میرے افسانہ ننھا خدا میں اسی دیوار کا ذکر موجود ہے جو چالیس برس تک میرے لاشعور میں پڑی رہنے کے بعد اچانک میرے افسانے میں گھس آئی تھی۔ میرے دوستوں نے چاہا کہ دروازہ کھلوا کر اندر ہو لیں۔ لیکن میں نے کل صبح پھر آنے کے لئے کہہ کر انھیں منع کر دیا۔ اور پھر آگے بڑھ گئے۔ یہ گلی وہی تھی جہاں میں بچپن میں ہاکی اور کئی دوسرے کھیل کھیلتا پھرا تھا۔ آس پاس کے کتنے مکان جو پہلے مٹی کے کچے بنے ہوئے ہوتے تھے میرے بچپن کے زمانے میں گرا کر پختہ بنوا لئے گئے تھے۔ اسی گلی میں ایک پگلی رہا کرتی تھی جسے میں چڑھاتا تو اُس سے گالیاں بھی کھاتا تھا لیکن خوب ہنستا تھا۔ اسی گلی کے موڑ پر نجاں دائی رہا کرتی تھی جس نے مجھے اور ہمارے خاندان کے کتنے بچوں کو جنوایا تھا۔ اُسے میں اماں کہہ کر بلاتا تھا۔ اور وہ مجھے مٹیا پر دعائیں دیا کرتی تھی۔ آج یہ سب اندھیرے میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ماضی بھی ایک گھنا اندھیرا ہی ہوتا ہے جس میں سے سب کچھ صاف صاف کبھی نظر نہیں آسکتا۔ ہم انسانوں کی آنکھیں اُن جانوروں کی جیسی ہوتیں جو اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں تب بھی ہم اس عمیق اندھیرے میں پوری طرح کبھی نہ جھانک سکتے۔ کیونکہ ماضی کا تعلق آنکھوں سے کم اور لاشعور سے زیادہ ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

رات کو کھانا کھا چکنے کے بعد ہم میانوالی کے ایک اور نوجوان گلوکار ایوب نیازی کے گھر اُس سے لوک گیت سننے کے لئے گئے۔ وہاں امیر حسین موسیقار بھی موجود تھا۔ جس نے دُھنیں بنائی تھیں۔ ہمارے ساتھ پروفیسر سلیم احسن نیازی بھی تھا جو اُردو کا اُبھرتا ہوا نوجوان شاعر ہونے کے علاوہ میانوالی کی سرائیکی زبان میں بھی گیت لکھتا ہے۔ ایوب نیازی نے اُس کے اور فاروق روکھڑی کے بھی کئی گیت سُنائے جو ایک اور بہت اچھا شاعر ہے ؎

گھڑا پئی بھر ندی آں گیڑے پئی ڈنڈی آں
کھو میرے یار دا چنگاں پئی کر ندی آں

(میں گھڑا بھر رہی ہوں (رہٹ کی مال کو) چکر دے رہی ہوں۔
کنواں میرے محبوب کا ہے (جو کچھ کر رہی ہوں) ٹھیک ہی کر رہی ہوں) ؎

آجن ماہی آپر دیسیا
پھٹی تھیوی نوکری مولا گھر ڈیسیا
کرم کریسیا

(واپس آجا میرے چاند جیسے محبوب، واپس آجا پردیسی۔ نوکری کو لات مار دے۔ مولا اپنے گھر میں بہت کچھ دے دے گا اور وہی کرم کرے گا)

ہندی کی طرح پنجاب کی شاعری میں بھی عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہونا ہے شاید یہ سنسکرت کا ہی اثر ہو ؎

مے تو گڈیاں آئیاں

بے پروا دیاں بے پروائیاں
مولا ڈیتاں آپ جدائیاں
کدی تاں آن ملاسی
مولا کوں سوہناں ڈھول دے

(جنوب (علامتی طور پر کراچی سے دُور عرب ممالک کی طرف) سے

www.taemeernews.com

گاڑیاں آرہی ہیں، بے پردا (محبوب) کی بے پروائیوں کا جواب نہیں۔
(لیکن اُس کا گلہ کیا کروں) یہ جدائیاں تو خود مولا نے ہی دی ہیں۔
کبھی تو مولا مجھے میرے حسین محبوب سے پھر سے ملا دے گا)

جس مکان میں ہم بیٹھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ آزادی سے پہلے کھیم چند کا لڑا عرائض نویس کا تھا جس کا ایک بھائی پاگل ہو جانے کی وجہ سے اپنے گھر پر ہی ایک مضبوط چارپائی پر زنجیروں سے جکڑا ہوا پڑا داہی تباہی بکا کرتا تھا۔ اُس کا ایک لڑکا دلّی میں سرکاری وکیل ہے۔ اِس مکان سے تھوڑی دور میری سب سے بڑی پھوپھی کا مکان تھا۔ میرے پھوپھا آٹے کی مشین لگا کر کئی شہروں میں کام کرتے رہے تھے۔ اُن کے پاس میں کئی دیہات پائی خیل، موسیٰ خیل وغیرہ جا کر رہا تھا۔ جہاں کی نہر میں الف ننگا ہو کر نہانا مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میری پھوپھی کا لکھنؤ میں ہی ۱۹۷۲ء میں انتقال ہو گیا تھا اُن سے میں نے کئی لوک گیت سُن سُن کر اپنی کہانیوں، نئی دھرتی پرانے گیت وغیرہ میں سجائے تھے۔ میرے پھوپھا ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور پچاسی سال سے اوپر کے ہو چکے ہیں۔ (اُن کا انتقال دو جون ۱۹۸۰ء کو ہو گیا ہے)

رات کو مجھے آزادی کے بعد پہلی بار گہری نیند آئی جس میں کوئی خواب نہیں تھا شاید یہ اپنی دھرتی پر لوٹنے کے سبب سے تھا۔ اگلے روز ۱۰ فروری کی صبح کو جاگا تو سلطان اور کئی دوسرے دوستوں نے مجھ سے رات کی نیند کے بارے میں پوچھا اُنھیں میں نے یہی جواب دیا کہ مجھے تو ایسا لگا جیسے کوئی بچہ گلی میں کھیلتے کھیلتے تھک کر اپنی ماں کی گود میں لوٹ آئے اور فوراً میٹھی نیند سو جائے۔ ایک طویل مدت کے بعد نیند کے اِس سُکھ کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ اِسی سُکھ اور راحت کو یاد کرتے ہوئے میں باقی ماندہ زندگی گزار سکتا ہوں۔ اِسی کی خاطر میں یہاں آنا دوں جو اَب مجھے حاصل ہو گیا ہے۔

میں ناشتے کے بعد پھر اُسی یاترا پر نکل پڑا جہاں کل رات کو وہاں پہنچتے ہی جا چکا تھا۔ عبادت گاہوں پر بار بار جانے میں میری کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے

www.taemeernews.com

لیکن اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی ایک روایتی اور دیہاتی عقیدت مند ہوں جو کسی تاریخی یا اہم مندر کی زیارت کرنے کے لئے کئی روز کی مسافت طے کر کے پہنچتا ہے تو وہ وہاں جتنے روز قیام کرتا ہے ہر روز ماتھا رگڑنے کے لئے جاتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ سلطان احمد، فضل رحمٰن، غلام نصیر نیازی، تسلیم احمد اور ملک محمد اسلم بھی تھے۔ ہم سب غلام نصیر نیازی کی کار میں سوار تھے اور کار بازار میں سے ہوتی ہوئی اور ملک مظفر اسٹریٹ اور گورو بازار سے گزرتی ہوئی پھر ہمارے مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ ہم ابھی کار سے باہر نکلے ہی تھے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے قد کے ترشی ہوئی سفید داڑھی والے بزرگ کو جو سفید کرتا، سفید تہمد اور سفید پگڑی میں ملبوس تھے، دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا — یہ ہو بہو صورت تو میرے دادا مرحوم کی تھی جو ۱۹۵۴ء میں دہلی میں انتقال کر چکے تھے۔ چونکہ ایک ہندو سماج سے تعلق رکھتا ہوں آواگون کے قصے بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ اس فلاسفی پر وشواس نہ ہوتے ہوئے بھی اُس بزرگ کی شبیہہ میں اپنے دادا مرحوم کو دیکھ کر خوش ہو اُٹھا۔ اتفاق سے اُنھوں نے بھی مجھے اتنے سارے لوگوں کے جلو میں دیکھا تو کچھ سوچتے ہوئے میری طرف بڑھ آئے اور میری طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولے: — "تم، تو چھتہ خیل رام لعل ہو! مجھے کل لوگوں نے بتایا کہ کوئی رام لعل آیا ہے۔ میں نے کہا یہاں تو صرف دو رام لعل رہتے تھے۔ ایک ماسٹر رام لعل جو گمبھیر خاندان سے تھا جو دھا رام کا بیٹا اور دوسرا چھتہ خیل رام لعل! آج کل کہاں ہو پتر!—"

اُس کی آواز میرے دادا مرحوم کی جیسی تو نہیں تھی۔ لیکن انداز وہی تھے زبان وہی تھی۔ اُس میں شفقت اور نرمی بھی وہی تھی بالکل وہی۔ اُس کا نام حاجی عنایت محمد ولد تیر محمد تھا۔ عمر اسّی سال سے اوپر۔ قوم جت جوڑا، پیشہ زرگری ساکن پنوں خیل۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اُس نے مجھے میرے دادا چھتہ رام کے حوالے سے پہچانا۔ اور یہ سوچ کر اور بھی اطمینان محسوس ہوا کہ یہاں قدم قدم پر شناخت کے نشان موجود ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ سفر دو سال پہلے کئے ہوئے

www.taemeernews.com

یورپ کے سفر سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ جس مکان کے سامنے میں کھڑا تھا اُس کا دروازہ میرے لئے کھول دیا گیا تھا۔ وہاں رہنے والے دو بھائی فردش بھائی عبدالعزیز اور عبدالرشید جو کرنال سے ہجرت کرکے وہاں بس گئے تھے اندر مدعو کرا کے مجھے اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے مدعو کر رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کے کتنے بچوں اور بڑوں کا ایک ہجوم جمع ہوگیا تھا۔ وہ سب میرے ساتھ ساتھ اندر گئے۔ میں بہ ظاہر بڑی خاموشی سے لمبی ڈیوڑھی میں سے گزرا جس کی اب چھت غائب تھی۔ وہاں پانی کا ہینڈ پمپ بھی موجود نہیں تھا جہاں بیٹھ کر میری دادی اور دوسری والدہ اپنے ہاتھوں سے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ اوپر کے حصے کو دو سیڑھیاں جاتی تھیں جن کے نچلے حصے مسمار ہوچکے تھے۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سفید مینار اب اپنی حقیقی آب و تاب کھو چکے تھے۔ دو بڑے بڑے کمرے، ایک بڑی سی رسوئی، اور پرنیم تھیتی جس میں میرے والد پاٹھ پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ٹھیک اُسی سائز اور طرز کے میرے چھوٹے چچا کے کمرے اور سامنے میرے دادا اور دادی کا کمرہ جس کے سامنے کی رسوئی غائب تھی۔ جس چھپّر کے نیچے ہماری گائیں بندھی رہتی تھیں وہ بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہاں وہی ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا جسے میں ڈیوڑھی میں تلاش کر رہا تھا، اوپر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ہماری مُرغیاں رکھی جاتی تھیں۔ اُس کی کھڑکیاں اینٹوں سے چُن دی گئی تھیں۔ میرے چھوٹے چچا نے ہی مجھے پہلے پہل مُرغیاں ذبح کرنا سکھایا تھا۔ میں نے ہر طرف ایک عجیب سی اُداسی سے دیکھا۔ جس دیوار کے ساتھ ہمارا تندور ہوا کرتا تھا وہ تو غائب تھا لیکن دیوار پر دھوئیں کا ایک نشان ابھی تک موجود تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ چکّی کا ایک پاٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ اِسی چکّی پر میری دادی اور پردادی نے بھی برسوں تک اناج پیسا ہوگا۔ اور ساتھ ساتھ کئی لوک گیت گائے ہوں گے۔ میں کتنے سارے لوگوں کی نظروں کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میرا ماضی شروع ہوتا ہے، جب میں چھوٹا تھا تو یہاں مٹی اور اینٹوں کے بنے ہوئے کمرے ہوا کرتے تھے۔

www.taemeernews.com

جس کے آنگن میں ایک بیروں کا گھنا پیڑ بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر یہ جدید طرز کا مکان بنا لیا گیا تھا۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اسی گھر کو میں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ء کو چھوڑا تھا جب میں اپنی بیوی اور ایک ماہ کی بچی کو ساتھ لے کر لاہور گیا تھا۔ میری بچی نے بھی اسی گھر میں جنم لیا تھا۔ اب وہ بیکانیر میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی گھر سے میری پانچوں پھوپھیوں کی ڈولیاں اٹھائی گئی تھیں، جن میں سے اب صرف ایک زندہ ہے۔ اسی گھر میں میرے والد اور چھوٹے چچا اپنی دلہنیں بیاہ کر لے آئے تھے۔ میری والدہ نے اسی گھر میں دم توڑا تھا۔ اور میرے جواں سال چھوٹے بھائی شام نے بھی ٹی بی جیسے موذی مرض میں جان دی تھی۔ اب میرے والد اور چھوٹے اور بڑے چچا بھی حیات نہیں ہیں۔ میں ہی اپنے خاندان میں اب سب سے بڑا ہوں اور برسوں بعد اس گھر میں واپس آیا ہوں۔ جس کی مٹی کا ذرہ ذرہ میرے جسم اور دل و دماغ میں رچا بسا ہوا ہے۔ میں نے من ہی من میں اپنے پُرکھوں اور مرحوم عزیزوں کو یاد کیا اور اُن سے مخاطب ہوا۔ 'تم اگر موجود ہو۔ تم اگر دیکھ سکتے ہو تو گواہ رہنا میں ایک بار لوٹ کر آیا تھا۔ تم سب کو اسی فضا میں محسوس کرنے اور یاد کرنے کے لئے۔ میرے بعد شاید پھر کوئی نہیں آئے گا۔ میں تمہارے خاندان کا آخری فرد ہوں جو تمہارے نام سے اور تمہارے بنائے ہوئے اس گھر کے ساتھ ایک جذباتی تعلق محسوس کرتا ہوں۔ اگر کوئی اور شخص کبھی بھولے بھٹکے یا ارادتاً آیا بھی تو وہ میری طرح ہرگز نہیں سوچ سکتا ہوگا۔ وہ تم سب سے اور مجھ سے بہت مختلف ہوگا ــــ'

پتہ نہیں کیسے میری زبان سے نکل گیا۔ "مجھے اس گھر کی تھوڑی سی مٹی دیدو" تو تین چار لڑکے لپک کر زمین کھودنے بیٹھ گئے۔ انھوں نے آناً فاناً پلاسٹک کی ایک تھیلی میں میری جنم بھومی کی مٹی بھر کر مجھے دے دی۔ میں نے ان لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھی بھرے ہوئے دیکھے۔ یہ بچے کون ہیں؟ ان کے تو میں نے نام تک نہیں پوچھے ہیں اور ان کے ساتھ تو میرا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے، پھر یہ کیوں رو رہے ہیں! جب کہ میں خاموش ہوں۔ اپنے اوپر پورا قابو

www.taemeernews.com

پائے ہوئے ہوں۔۔۔۔

شاید مٹی کا رشتہ بھی اِک رشتہ ہوتا ہے ——————

—————— زبان کا رشتہ بھی اِک رشتہ ہوتا ہے۔۔۔۔

فضل رحمان اپنے کیمرے سے میری تصویریں اُتار رہا ہے مجھے ہر جگہ کھڑا کر کے اور کئی کئی لوگوں کو میرے ساتھ رہنے کے لئے کہہ کہہ کر فوٹو اُتار رہا ہے۔ اور بار بار کہہ رہا ہے "یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ تصویریں ہمارے لئے ایک یادگار بن جائیں گی ——"

اِس مکان کے دونوں مکینوں نے چاہا کہ میں اِسی گھر میں اُن کے ساتھ رہوں لیکن چونکہ میں جانتا تھا اُس جگہ پر میرا اب اُتنا حق رہ گیا تھا جو میں نے حاصل کر لیا تھا۔ اِس لئے اُن کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔ سامنے مکان میں اب دو بھائی تاج محمد اور شیر محمد مقیم تھے جو کوکا کولا کی ایجنسی لئے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے میری اور میرے دوستوں کی تواضع کے لئے پہلے ہی چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اُنھوں نے اپنے نوعمر بچوں سے ملایا جو میری طرف بڑی حیرت سے تک رہے تھے۔ یہ بچے وہی تھے جنھوں نے میرے لئے میرے گھر کی مٹی کھودی تھی اور آب دیدہ ہو گئے تھے ——

ہم سب پھر موٹر میں سوار ہو گئے۔ موٹر پھر بختاں دائی کے گھر کے سامنے سے گزری جسے مرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ ہم بازار کے نچلے حصے سے ہوتے ہوئے میلۂ مویشیاں کے میدان تک گئے۔ آگے قبرستان تھا۔ قبروں کے درمیان سے ایک کچا راستہ سندھ دریا کی طرف نکل جاتا تھا جس کے کنارے پر شمشان گھاٹ بنا ہوا تھا۔ وہاں دریائے سندھ میں پہلی مرتبہ نہانے کے لئے میں اپنے دادا کے کندھوں پر سوار ہو کر اُترا تھا۔ اور اُسی وقت ایک آدمی کو الف ننگا ہو کر دریا میں گھستے ہوئے دیکھا تھا لیکن اُس نے اپنے آگے ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ سنبھال رکھی تھی۔ اس کا ذکر میرے افسانے ایک معمولی آدمی کی تصویر (مطبوعہ فنون) میں موجود ہے۔ ہم سب میانوالی کے

www.taemeernews.com

جنوبی محلے میں بھی گئے اور اُس مکان کے سامنے جاکر رُک گئے جہاں میری سُسرال تھی۔ میری بیوی نے لکھنؤ اسٹیشن پر مجھے وداع کرتے وقت کہا تھا۔ "ذرا اُس مکان میں بھی چلے جائیے گا جہاں بارات لے کر گئے تھے!" میں اِسی گھر میں بارات لے کر آیا تھا ــــ ۵ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کی رات کو۔ سہرا باندھے ہوئے اور گھوڑی پر سوار ہو کر۔ اس واقعے کا گواہ میرے ساتھ اس شہر کا اب صرف ایک شخص تھا۔ سلطان احمد کندی۔ اُس نے خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا ــــ اُس میں رہنے والے دو بھائیوں، خواجہ عباس اور خواجہ عبدالستار سے ملایا۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ دالان وہی تھا۔ تھوڑی بہت مرمت سے سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ ایک بیر کا پیڑ ابھی تک موجود تھا جس کے نیچے کھیل کر میری بیوی نے اپنا بچپن گزارا ہوگا۔ میں نے اِس پیڑ کی دو شاخیں مانگیں تو وہ مجھے ایک خوب صورت پلاسٹک کے تھیلے میں سجا کر دے دی گئیں۔ ہماری بھیڑ میں قائداعظم یونیورسٹی کے انتھروپولوجی کے پروفیسر ڈاکٹر خادم حسین بھی شامل ہو گئے تھے جو ڈینش زبان بھی جانتے تھے۔ وہ میرے ساتھ ناروجین زبان اور ڈینش زبان کے باہمی فرق پر گفتگو کرتے رہے۔ کیوں کہ میں نے بھی ۱۹۷۰ء میں ناروے میں جاکر ناروجین زبان کا کچھ مطالعہ کیا تھا اور اس کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون اور سفرنامہ بھی لکھ چکا ہوں۔ پروفیسر محمد اجمل نیازی اور پروفیسر سلیم آصف بھی وہیں پہنچ گئے۔ وہ اب تک شام کو میونسپل کمیٹی کے جناح ہال میں مجھے شہریوں کی طرف سے دیئے جانے والے استقبالئے کے سلسلے میں انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ اب چوں کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا وہ مجھے اور میرے دوستوں کو بلانے کے لئے آگئے تھے۔ خواجہ منزل کے دونوں بھائیوں کا میں نے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چل پڑا ــــ

www.taemeernews.com

میانوالی۔ یادیں، خواب اور حقیقت

۸

دوپہر کا کھانا فضل رحمٰن کے یہاں تھا۔ وہاں محمد اجمل نیازی، سلطان احمد کنڈی، پروفیسر شمیم احمد، پرویز محمد محمد اسلم ملک، پروفیسر سلیم احسن، محمد رمضان کانجو، پروفیسر فیروز شاہ، غلام نصیر نیازی وغیرہ سارے احباب موجود تھے جن سے میں ایک لمحے کے لئے جدا ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم سب نے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور ساتھ ساتھ خوش گپیاں بھی چلتی رہیں۔ میانوالی کے لوگ بے حد کشادہ دل اور خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اُن کے مزاج میں انتہا پسندی بھی موجود

www.taemeernews.com

ہے۔ محبت اور دشمنی میں یہ انتہا پسندی اہلِ میانوالی کی شناخت بن گئی ہے۔ صدیوں پہلے یہی لوگ کھوکھر یا کھکر کہلاتے تھے جنھیں مسلمان مورخین نے سرکش، وحشی اور خوں خوار لکھا ہے۔ اِس علاقے پر کوئی بیرونی کلچر کبھی اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکا۔ پروفیسر محمد اسلم ملک نے اپنے تحقیقی مضمون میانوالی کی تاریخی تصویر۔ (مطبوعہ ادبی مجلّہ سہیل گورنمنٹ کالج میانوالی ۱۹۸۰ء) میں لکھا ہے کہ مورخین اِس بات پر متفق ہیں کہ برہمن کلچر میانوالی کے علاقے میں اپنا اثر و نفوذ پیدا نہ کر سکا۔ ہیون تسانگ اور دوسرے چینی سیاح اس علاقے کو ہند خاص کا حصہ نہیں سمجھتے۔ البیرونی نے یہاں کے لوگوں کو مثل ہندو لکھا ہے۔ یعنی وہ ہندو نہیں تھے۔ اِسی طرح ابتدائی عرب دور کے مورخ بھی اس علاقے کو ہندوستانِ خاص کہنے کے بجائے شنوران یا سنکرام کہتے ہیں۔ شنوران یا سنکرام دریائے سندھ کے مشرق اور نمکسار کے دامن کے ساتھ ساتھ کے علاقے کو کہتے ہیں۔ سندھ کے مغرب میں دریائے کرم کی وادیوں کو عربوں نے کرمان لکھا ہے۔ کرمان غالباً کرم کی مناسبت سے ہے۔ ابنِ خلدون نے کرمان اور شنوران کا تذکرہ کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ علاقے کابل اور ہند کے درمیان واقع ہیں۔ اور یہ وہ کرمان نہیں جو کہ خراسان اور ایران کی سرحد پر ہے ــــ

پروفیسر محمد اسلم ملک کے مطابق اس علاقے (میانوالی) کے چاروں طرف مختلف ادوار میں اگرچہ طاقت ور اور عظیم سلطنتیں قائم ہوتی رہیں مگر یہ علاقہ اکثر و بیشتر آزاد اور خود مختار رہا۔ اگر کسی وقت اُسے فتح بھی کر لیا گیا تو مستقل تسلط قائم رکھنا دشوار ثابت ہوا۔ قبل مسیح میں ٹیکسلا اور بھیرہ (جو میانوالی کے شمال مشرق میں واقع ہیں) مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں، مگر میانوالی اُن سے آزاد رہا۔ ہندو شاہی دریائے سندھ کے مغرب تک محدود رہی۔ راجہ داہر کی سلطنت اگرچہ نمکسار تک پھیلی رہی۔ لیکن میانوالی کا سرحدی علاقہ برائے نام راجہ داہر کے ماتحت رہا۔ غزنوی اور غوری سلطنتیں اپنے فوجی دبدبے اور عسکری قوت کے باوجود اس علاقے کو زیرنگیں لانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ البتہ اُسے کئی بار لوٹا جلایا

www.taemeernews.com

اور ویران ضرور کیا گیا۔ دلّی میں جب مسلمان ترکوں نے مستقل حکومت کی بنیاد ڈالی تو کم و بیش ایک سو سال تک یہ علاقہ اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے جنگ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ بلبن جیسے عظیم اور جابر فرماں روا نے بھی بالآخر عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں کے لوگوں سے تعرض نہ کیا جائے ــــ

لیکن میانوالی کے جدید دور کے بارے میں کہ یہاں وہ ہندو جو اپنا رشتہ اروڑ دنش سے جوڑتے ہیں اور اروڑا کہلاتے ہیں کب وارد ہوئے مورخ خاموش ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے جو روایات سُنی ہیں اُن کے مطابق صدیوں پہلے (غالباً مسلم دور سے بھی) کشمیر اور وزیرستان کے درمیان جب راجہ اروڑ کی سلطنت اُجڑی تو وہاں کے اروڑے دو بڑے قافلوں کی شکل میں جنوب کی طرف روانہ ہوئے جن میں ایک تو میانوالی، راولپنڈی، سرگودھا اور ملتان تک کے علاقوں میں پہنچ کر وہیں بس گیا اور دوسرا قافلہ کسی دوسرے راستے پر پڑ کر راجستھان کی طرف نکل گیا جو وہاں ایک یا دو صدی تک اپنا ساز و سامان گھوڑوں کی پیٹھ پر لادے لادے خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر جب سندھ کے راستے سے اُن پر عرب حملہ آور ہوئے تو وہ پھر شمال کی طرف نکل گئے: اور ملتان میانوالی کے علاقوں میں اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں سے جا ملے اور اس کے بعد سے وہ بھی وہیں بس گئے۔ یہ قافلہ چونکہ اب جنوب کی طرف سے آیا تھا اس لئے وہ جنوبی (دکشنی) اروڑے کہلاتے تھے۔ میرا تعلق اسی جنوبی قافلے سے ہے۔ مجھے یاد ہے میرے بچپن تک اُتر اور دکھن کے اروڑوں میں آپسی رشتے ناتے نہیں ہوتے تھے شاید اس کی وجہ ایک دو صدیوں کا معاشرتی بُعد ہو جو اُن کے الگ رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو یا ایک سبب یہ بھی ہو کہ اُتر کے قافلے والوں کے بیشتر لوگ اسلام قبول کر چکے تھے باقی جو بچے تھے وہ ہندو ضرور تھے لیکن اُن کے لباس اور طرز بود و باش پر اسلامی اثرات زیادہ نظر آتے تھے جب کہ جنوب سے آنے والے ہندوؤں کے لباس، زبان اور رہن سہن پر راجستھانی چھاپ بہت گہری تھی۔ جب یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے میں گھُل مِل گئیں چنانچہ ۱۹۴۷ء

www.taemeernews.com

تک اُن کا یہ معاشرتی اور طبقاتی اختلاف یک سر ختم ہو چکا تھا۔

فضل رحمان کے دادا فتح محمد نیازی کے ساتھ بھی کچھ دیر گفتگو رہی جو اپنے چھوٹے چھوٹے پڑپوتوں کو گود میں لے کر ہمارے پاس آ بیٹھے تھے۔ وہ اور سیر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور خانیوال کی طرف کے علاقے میں سروس کرتے رہے تھے۔ اُنھوں نے میانوالی سے ترک وطن کر جانے والے ہندوؤں کا بڑی محبت سے ذکر کیا اور اُنھیں ایک مہذب اور شایستہ قوم قرار دیتے ہوئے کہا۔ "اُن کی کمی ہمیں اب بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے جو تجارت، سرکاری ملازمتوں اور وکالت جیسے پیشوں پر عرصۂ دراز تک حاوی رہے تھے"۔

وہاں سے ہم سیر کو نکلے اور موٹر میں سوار ہو کر شہر کے باہر دو نہروں کے ایک پُل پر جا کر کھڑے ہو گئے جو بکہ کراڑ کے نام سے موسوم ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر محمد اسلم ملک اور میرے درمیان لفظ کراڑ پر بحث چھڑ گئی، جو عام طور پر اِس علاقے کے ہندوؤں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ بلکہ اِس لفظ کو خاصی بیزاری اور نفرت سے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمیں اِس لفظ کے ماخذ کی تلاش تھی۔ جو نہ تو سنسکرت میں مل رہا تھا نہ ہی عربی یا فارسی زبانوں میں۔ ہماری بحث اس علاقے کے اوّلین قبائل کی طرف بھی جا نکلی، جنھوں نے افغانستان، ایران اور ماوراالنہر کے تہذیبی مراکز سے آنے والے تجارتی اور عسکری قافلوں کے ساتھ میل جول قائم رکھنے کے لئے اپنی تجارتی چوکیاں آباد کر لی ہوں گی اور اُن لوگوں کو قالین اور دیگر قیمتی پارچہ جات اور خشک میوہ جات کے بدلے اپنا علاقائی سامانِ خورد و نوش مہیا کر دیتے ہوں گے اور وہی لوگ بعد میں پوری تجارت پر قابض ہو گئے ہوں گے۔ تجارتی ذہن رکھنے والے لوگوں کا ہی نام کراڑ پڑ گیا ہو گا۔ اور اب آزادی کے بعد اسی تجارت پر جب کہ خود مسلمان جن میں مہاجر بھی شامل ہیں قابض ہو چکے ہیں اُن کے لئے آج نہیں تو اور پچاس یا سو سال کے بعد یہی لفظ کراڑ، یا اُس کا کوئی متبادل لفظ ضرور استعمال ہونے لگے گا کیوں کہ تاجر اور گاہک کے درمیان معاشی وجوہات بنا پر اختلاف یا بیزاری بہرحال پیدا ہونا لازمی ہے۔

www.taemeernews.com

وہاں سے لوٹ کر ہم جناح ہال میں پہنچے جہاں بہت سے لوگ باہر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اندر ساری کرسیاں بھر چکی تھیں۔ وہاں حیدر آباد کے مہاجر سیّد انوار ظہوری سے میری پہلی ملاقات ہوئی جو اُردو کے قادر الکلام شاعر ہیں اور میانوالی کی تحصیل بھکر میں بس گئے ہیں۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بہ طورِ خاص وہاں آئے تھے۔ یہ استقبالیہ جلسہ شہریوں کی طرف سے تھا جس کی صدارت کے فرائض میرے بچپن کے دوست سلطان احمد کندی کو سونپے گئے۔ سلطان نے اپنی صدارتی تقریر میں میرے ساتھ اپنے بچپن کے واقعات کا ذکر کیا اور بڑے فخر سے کہا کہ اُن کے پاس آئے ہوئے میرے خطوط، کتابوں، رسالوں اور ادبی سرگرمیوں کی تصاویر کو سارے شہر کے لوگ آکر دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ سیالکوٹ کے مرے کالج میں پنجابی کے اُستاد اور شاعر گلزار بخاری نے میرے بارے میں ایک نظم پڑھ کر سنائی۔ فیروز شاہ نے میری افسانہ نگاری پر ایک مقالہ سُنایا جس میں ایسے کرداروں اور افسانوں کا ذکر کیا گیا تھا جن کا تعلق میانوالی سے جڑا ہوا ہے۔ محمد اجمل نیازی اور محمد رمضان کانجو نے بھی تقریریں کیں۔ جب مجھ سے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تو یہ خواہش بھی ظاہر کی گئی کہ میں میانوالی کی بولی میں ہی تقریر کروں۔ لیکن میں نے معذرت پیش کی کہ اپنی علاقائی زبان کو میں نے کبھی ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا اگرچہ ہم لوگ اپنے گھر میں ابھی تک یہی زبان بولتے ہیں۔ لیکن چوں کہ میرا رویّہ سراسر اُردو زبان کے وسیلے سے بن چکا ہے اِس لئے میں اُردو میں ہی تقریر کروں گا ——

میں نے اپنی ایک گھنٹے کی تقریر میں میانوالی کے عہدِ گزشتہ کی ثقافت، مختلف فرقوں کی باہمی رواداری، اپنے بچپن کی یادوں اور میانوالی کے لوگوں کے مزاج کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا جو نہ صرف مجھے ورثے میں ملی ہیں، بلکہ میں اُنھیں اپنے افسانوں کا بھی موضوع بناتا رہا ہوں۔ جو لوگ یہاں سے بھارت چلے گئے ہیں وہ ابھی تک میانوالی کی روایات، لوک گیتوں اور عوامی ناچوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے ہندوستان کے کئی شہروں میں میانوالی کے

www.taemeernews.com

نام سے اپنی ایسوسی ایشنیں قائم کر رکھی ہیں۔ جن کا مرکز دہلی میں ہے جہاں ہر سال ۲ اکتوبر کو اجمل خاں پارک میں دس ہزار کے قریب میانوالی کے باشندے جمع ہوتے ہیں۔ یہ اجتماع اپنے کلچر کو زندہ رکھنے کے لئے ہی ہوتا ہے اور بیشتر لوگ وہی لباس پہن کر آتے ہیں جو یہاں پہنا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی زبان میں گانے بھی سناتے ہیں، اور ڈرامے بھی پیش کرتے ہیں۔ ہم لوگ گوڑگاؤں میں میانوالی نگر کے نام سے ایک کالونی بنا چکے ہیں، اور دہلی میں روہتک روڈ پر بھی ایک بہت بڑی کالونی اسی نام سے بسائی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ دہلی سے ۱۹۵۲ء سے ایک اُردو ہندی کا رسالہ 'میانوالی گزٹ' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے جس کی ادارت مرحوم تلوک چند مرحوم بھی کر چکے ہیں ــــ

میں نے جب وطن چھوڑنے کے کرب کا ذکر کیا جو میرے خوابوں اور لاشعور کا حصہ بن چکا ہے تو سامنے کی صف میں بیٹھے ہوئے کچھ نئی نسل کی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ میں خود کچھ لمحوں کے لئے خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں جگہ جگہ میانوالی کی زبان استعمال کی، کیوں کہ مجھے اپنے جذبات کے صحیح اظہار کے لئے اُردو زبان میں مناسب الفاظ نہیں مل سکے تھے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ملک کی تقسیم اور ہماری نقلِ مکانی کے باوجود ہم اپنی جنم بھومی سے اپنی پہچان کو ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ اور ہمارے مورخ آنے والی کئی نسلوں کے یہاں بھی میانوالی کی زبان اور اس علاقے کے مزاج اور خصوصیات کی نشان دہی کرتے رہیں گے۔ آخر میں میں نے انھیں میانوالی کے ہی تعلق سے ایک نئی کہانی 'ایک ہزار بچوں والی ماں' سنائی جس کا مرکزی کردار میری دائی اماں بختاں ایک مسلم خاتون تھی۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد میری ملاقات کئی اور لوگوں سے کرائی گئی۔ جن میں خواجہ محمد اقبال، کلیم اللہ ملک، خواجہ عبدالستار، شرر صہبائی، انجم جعفری، سالار نیازی، مشتاق گمٹالوی، وحید الزماں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ میونسپل کمیٹی کے سامنے ایک کارخانے میں میں نے ۱۹۳۸ء میں مستری علی محمد سے دو چار ماہ خراد کا کام سیکھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی حیات ہیں تو میں نے اُن کے نیاز حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی،

www.taemeernews.com

میرے دوست مجھے اُن کے گھر لے گئے جو وہاں کے ایک قریبی محلّے میں تھا۔ مستری محمد علی کی عمر پچاسی سال سے اوپر ہو چکی ہے، اُس وقت وہ بستر پر دراز تھے۔ میری آمد پر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اور مجھے دروازے تک چھوڑنے کے لئے ساتھ آئے۔ وہاں سے ہم چائنا ہاؤس میں گئے جہاں کچھ وکلا میرا انتظار کر رہے تھے۔ اُن میں امان اللہ خاں نیازی بھی تھے جو ہائی کورٹ کے وکیلوں کی انجمن کے صدر رہیں اور مشہور کرکٹ کھلاڑی عمران خاں کے چچا ہیں۔ اُن لوگوں نے ہندوستان کے لوگوں اور حالات پر کچھ سوالات کئے۔ اور چاہا کہ میں مقامی کچہری میں وکیلوں کے ایک عشائیے میں شرکت کروں۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے معذرت کرنی پڑی۔ اُن کا شکریہ ادا کر کے میں پھر اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے کے لئے نکل پڑا۔

ہم لوگ گور دوارا بازار کے ایک ڈاکٹر خواجہ رشید کے مطب میں پہنچ گئے۔ جو سردار بھگت سنگھ کے ساتھی بھی رہ چکے ہیں۔ اُن کی عمر اَسّی سال سے تجاوز کر چکی ہے اور جب میں نے اُنھیں بتایا کہ اب بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں اُن کے علاوہ دو اور ساتھی دُرگا بھابھی اور کان پور کے ایک ورما صاحب زندہ رہ گئے ہیں، تو وہ کئی لمحوں تک خاموش سے رہ گئے، خواجہ رشید نے بم پھینکنے اور دہشت پسندوں کی خفیہ تنظیم کے بارے میں کئی اشارے بتائے جن کی مدد سے وہ اپنے ساتھیوں کو پہچانا کرتے تھے۔ اُن کا سابق وطن لُدھیانہ ہے اور اب وہ پُرانی یادوں کو سینے کے ساتھ لگائے زندگی کے باقی ماندہ دن غیر سیاسی طور پر گزار رہے ہیں۔

وہاں سے اُٹھ کر ہم پروفیسر سلیم احسن کے یہاں گئے جو گوردوارے کے پاس ایک گلی میں رہتے ہیں۔ اِسی گوردوارے میں بچپن میں کئی بار جا چکا تھا اُس کے باہر دار پرب پر بڑا بھاری میلہ لگتا تھا۔ اب اس میں کئی لوگ رہتے ہیں سلیم احسن کے یہاں کھانے کا اہتمام تھا اور اُنھوں نے میری خاطر گوشت پلاؤ کے علاوہ میانوالی کی اُن ترکاریوں کو بہ طورِ خاص تیار کرا رکھا تھا جو میں نے تقسیم

www.taemeernews.com

کے بعد یوپی میں دیکھی بھی نہیں تھیں۔ لیکن اُن کا ذائقہ بھی تک ذہن میں محفوظ تھا۔ اُنھوں نے میانوالی کی ہی خصوصیت کا حامل ایک دودھی والا حلوہ بھی تیار کر رکھا تھا۔ جو لکھنؤ میں میری بیوی سال میں ایک دو بار میری فرمائش پر بنا دیتی ہے اس میں خاصی محنت پڑتی ہے۔

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل جمائی گئی جس میں امیر حسین اور ایوب نیازی نے حصہ لیا۔ وہ یوں بھی شام سے وہیں موجود تھے اور میرے لئے اپنے گانوں کے کیسٹ تیار کرتے رہے تھے۔ سامعین میں ایک درجن کے قریب میرے وہی احباب تھے اور وہاں خواجہ رشید صاحب بھی آ گئے تو محفل کا وقار بڑھ گیا۔ دیوار گیر پر ہاتھ سے بنائی ہوئی سردار بھگت سنگھ کی ایک تصویر بھی رکھی ہوئی تھی۔ فاروق روکھڑی اور سلیم احسن کے گیت سننے کے بعد مجھے گلزار بخاری کی بھی کچھ غزلیں سنوائی گئیں۔ گلزار کو میانوالی میں ایک پرجوش اور انقلابی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے اُس کی شاعری سے واقعی ایک اجتہاد اور بغاوت کی بو آتی ہے ؎

شب کو اُجالنے کا ہنر ہم پہ چھوڑ دو
تم تھک چکے ہو اب یہ سفر ہم پہ چھوڑ دو
اس کے لئے جو تم نے کیا سب کو علم ہے
اس گھر میں ہم بھی رہتے ہیں گھر ہم پہ چھوڑ دو

رات محمد اجمل نیازی میرے ساتھ ہی رہ گیا۔ ہم بہت رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ اُس کے گاؤں موسیٰ خیل کے بارے میں جہاں کے مذہبیات کے عالم مولانا کوثر نیازی بھی ہیں۔ جو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ ہم نے میانوالی کی ادبی محاظ سے ترقی، ورجنرل اے اے کے نیازی (ٹائیگر) کے بارے میں بھی گفتگو کی جو میانوالی کے ہی ہیں اور بنگلہ دیش کی جنگ کے زمانے میں مشرقی کمان اُن کے ہاتھ میں تھی۔ مجھ سے کئی لوگوں نے پوچھا تھا کیا میں جنرل نیازی سے ملاقات کروں گا۔ میں نے سب کو ایک سا جواب دیا تھا کہ میں ایک ایسے فوجی سے کیوں ملوں جس نے بنا خاص مزاحمت کے ترانوے ہزار

www.taemeernews.com

فوجیوں کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا ہوتا یا مر کر شہید ہو گیا ہوتا تو میں بھی فخر سے سر اونچا کر کے کہہ سکتا کہ وہ میرے ہی وطن کا ایک جاں باز سپاہی تھا۔ اگرچہ وہ میرے ہی ملک کی فوجوں کے سامنے صف آرا تھا۔ یوں بھی میانوالی میں جنرل نیازی کے خلاف کافی غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ خود محمد اجمل نیازی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے۔ 'تاریخ میں ایک بدقسمت لمحہ اُن کے سارے کردار کو مشکوک اور متنازعہ فیہ بنا کر گزر گیا' وہ سانحہ 'سقوطِ مشرقی پاکستان کے بارے میں لکھی گئی کتاب وِٹنس ٹو سَرنڈر کے مصنّف کرنل محمد صدیق سالک سے اختلاف کرتے ہوئے جنرل نیازی سے ابھی تک پوچھ رہے ہیں کہ" وطنِ عزیز کو دولخت کرنے میں میانوالی کا سپوت (جنرل نیازی) تو شامل نہیں؟" اس نے قریب قریب میری بات کی موافقت ان الفاظ میں کردی ہے۔ موّرخ کو پاکستان کی یہ تاریخ شکست یا شکست تاریخ لکھتے ہوئے یہ تو کہنا پڑے گا کہ ہتھیار ڈالنے کی تقریب آپ کے ہاتھوں انجام پائی۔ اِس تلخ حقیقت کو آپ کیسے محسوس کرتے ہیں جب کہ یہاں ہارٹ فیل ہوئے، لوگ صدمۂ سقوط سے سکتے میں آ گئے، کئی پاگل بھی ہوئے۔ کیا زندہ بچ کر یہاں اپنی صفائی پیش کرنے کے نہ ختم ہونے والے ناقابلِ برداشت مرحلوں میں آپ عجیب عجیب محسوس نہیں کرتے! اس سے تو وہ موت بہتر تھی کہ آپ زندۂ جاوید ہو جاتے!۔'

۱۶ر فروری کی صبح خوب چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی ـــــــــ میانوالی کی دھوپ ہمیشہ چمکیلی ہی ہوتی ہے۔ سردی اور گرمی کے دونوں موسموں میں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ صبح ہوتے ہی سلطان احمد اپنے آٹھ ماہ کے نواسے نصیر کو گود میں اُٹھائے میرے پاس آ گیا۔ میں لکھنؤ میں بھی صبح صبح اپنی پوتی ڈکیٹر کو دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ نئے دن کی نوید اور بچے کا چہرہ ایک سی مشابہت رکھتے ہیں۔ جس طرح صبح کی پہلی روشنی بے حد خوش گوار اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اُسی طرح ساری دنیا کے ننھے ننھے بچّوں کے چہرے بھی بے اندازہ مسرّت اور معصومیت کا تاثر دیتے ہیں۔ اِس ننھّے بچّے نصیر کا باپ فوج میں کیپٹن ہے۔ پتہ نہیں وہ بھی بڑا

www.taemeernews.com

ہو کر اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا ملٹری کا کیپٹن یا جرنیل ہی بنے گا۔ میانوالی صدیوں سے فوجی بھرتی کے لئے مشہور رہا ہے۔ لیکن خدا نہ کرے وہ کبھی ہندوستان کے خلاف لڑنے کے لئے آئے۔ اگرچہ تب میں نہیں ہوں گا۔ ہماری نسل کے سارے ہی لوگ اپنا سفر تمام کر چکے ہوں گے۔

آج میرا پہلا کام کچہری میں جا کر ڈی ایس پی کے آفس میں اپنی آمد اور روانگی درج کرانی تھی۔ گزشتہ روز جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے یہ کام نہیں ہو سکا تھا۔ فضلِ رحمان آج موٹر کے بہ جائے ایک تانگہ لے کر آگیا تاکہ میں میانوالی کو تانگے پر بھی بیٹھ کر دیکھ سکوں، تانگے والا رب نواز تھا جو تقسیم سے پہلے کے کئی ہندو تانگے والوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پھر ایا تانگے والے کو یاد کرتا رہا جسے میں نے کبھی ایک افسانے 'ہسٹری شیٹر' کا مرکزی کردار بنایا تھا۔ کچہری میں اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر سے بھی ملاقات ہو گئی جس نے چائے بھی پلائی اور ساتھ لدھیانوی اور کئی دوسرے ادیبوں کو یاد کیا۔ اُس کا وطن لدھیانہ تھا۔ اُس کے بعد میرے دوست مجھے اپنے اسکول میں لے گئے جہاں میں پانچویں سے دسویں درجے تک پڑھتا رہا تھا۔ وہاں سے میں نے ۱۹۳۸ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہاں کے ہیڈ ماسٹر غفار خاں، ٹیچرز اور لڑکے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اُن سب کو ساتھ لے کر میں اسکول کے ایک ایک کمرے میں گیا۔ جہاں جہاں میں مختلف درجوں میں۔ انگریزی، سنسکرت، اُردو، ہندی، سائنس وغیرہ پڑھتا رہا تھا۔ اُنھیں میں نے وہ ڈیسک دکھائے جہاں میں بیٹھتا تھا اور وہ واقعات بھی بتائے جن کی بنا پر میں نے اپنے ٹیچروں سے ہاتھوں پر بید کھائے تھے۔ اُنھیں نویں درجے کا وہ کمرہ بھی دکھایا جہاں میں نے اسکول کی بزمِ ادب کے ایک جلسے میں اپنی پہلی کہانی سُنائی تھی۔ آدھی لکھی ہوئی اور آدھی منھ زبانی۔ میں کھیل کے اُس میدان میں بھی گیا جہاں کبھی ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ اور سائیکل دوڑ میں حصہ لیتا رہا تھا۔ واپسی پر اپنے والد کے بنوائے ہوئے سینما گھر کے سامنے سے گزرا جہاں میں نے بارہ سال کی عمر سے فلمیں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔ ماسٹر نثار اور رنجن کی لیلیٰ مجنوں، مختار بیگم کی عورت کا پیار جس کے مصنف آغا حشر کاشمیری تھے۔ اور ای بلوریا، ڈی بلیموریا،

www.taemeernews.com

سوچنا، مادھوری، لیلا ڈیسائی اور موتی لال کی بے شمار فلموں کے تاثرات ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھے۔ ہمارے شہر کے بعض جاٹ پٹھان مختار بیگم کو کان پر ایک ہاتھ رکھ کر اپنی پاٹ دار آواز میں غزل سرا ہوتا دیکھتے تو جوش میں آکر اللہ اللہ بی اللہ پکار اٹھتے تھے۔ ایک بار کسی فلم کے ساتھ زندہ ناچ گانے کا پروگرام چل رہا تھا کہ کچھ من چلے ناچنے والی ساحرہ کو ہی اُٹھا کر لے گئے تھے۔

بازار کے ایک کٹڑے میں انجمن تاجران نے ایک استقبالئے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر سارے دوکان دار اکٹھے ہو گئے۔ انجمن کے صدر ملک کلیم اللہ صاحب نے ایک مختصر سا خطبۂ صدارت پڑھا جس کے آغاز میں اُنھوں نے کہا۔

"آج ہمارے درمیان ایک ایسا مہمان بیٹھا ہے جسے مہمان کہتے ہوئے بھی مجھے لاج آتی ہے۔" اُنھوں نے میرے چونتیس سال کے بعد واپس آنے پر میرا استقبال کیا اور کہا "یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ کی معصومیت نے قدم چلنا سیکھا اور بانکپن کا روپ دھارا۔" کلیم اللہ صاحب نے دو قومی نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھے ؎

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

اُنھوں نے کہا ــــ "میں آپ کو میانوالی کی داستان سنانا چاہتا تھا۔ سین دو دن کی محدود مدت اور آپ کی مصروفیت نے اجازت نہیں دی۔ کاش آپ زیادہ وقت لے کر آئے ہوتے اور ہم ایک دوسرے کے دُکھڑے کھولتے۔ لیکن قانون کی پابندیاں دل کے معاملات میں ہمیشہ چاچا کیدو (قصۂ ہیر رانجھا کا روایتی دلن) کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے اُنھوں نے پھر دو شعر پڑھے ؎

www.taemeernews.com

اُٹھتے رہے کلیوں کی جوانی کے جنازے
جلتے رہے پھولوں کے نگر شہر میں تیرے
کچھ لوگ تمناؤں کا خوں چہروں پہ مل کر
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر شہر میں تیرے

آخر میں اُنھوں نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کی۔ 'رام لعل کو دیکھا نہ تھا صرف محترم بھائی سلطان سے باتیں سُنی تھیں تو اجنبیت کا ایک پردہ باقی رہا۔ لیکن دیکھ لیا تو دل نہیں کرتا کہ اُسے جُدا ہونے دیا جائے۔ اِس کی جُدائی کا صدمہ ابوالکلام آزاد کے اُس ہندو دوست کا سا ہوگا جو آج بھی دوپہر کی چائے آزاد کی قبر پر ہی پیتا ہے۔ جب رام لعل صاحب کے یہاں سے چلے جانے کے بعد کا منظر نگاہوں میں لاتا ہوں تو بے اختیار کہہ اُٹھتا ہوں ؎

بچھڑا وہ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اِس موقع پر سید انوار ظہوری نے ایک آزاد نظم بھی پڑھی اور آخر میں مَیں نے اس قدر پُرخلوص استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میانوالی سے ہندوستان کے کئی شہروں میں جا کر بسے ہوئے دوکان داروں کا ذکر کیا اور اُن کی محنت، ترقی اور خوش حالی کے قصے سُنائے اور کہا کہ اُن کی اِس کامیابی میں بھی اِسی شہر کی مٹی کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ اُنھوں نے نقل مکانی کے جاں گُسل حالات میں بھی ہمت نہ ہاری اور پھر سے سرسبز اور شاداب ہو گئے ہیں ــ اور نہ صرف ہندوستان کے کونے کونے میں بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بھی بسے ہوئے ہیں۔

اپنوں سے بار بار ملنے اور اُن کا خلوص سمیٹنے کا یہ سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا اور مجھے کئی بار یہ شبہہ ہونے لگتا میرے بجائے کوئی دوسرا شخص تو وہاں نہیں پہنچ گیا ہے۔ میں نے خود کو اِس طرح کبھی اہم نہیں سمجھا تھا۔ میں ہمیشہ سے تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ میں نے اِسی شہر میں بچپن میں بہت کم دوست بنائے تھے اس بات کی کمی کی شدت اب محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سب مجھے جانتے ہیں اور

www.taemeernews.com

محبت کرتے ہیں اور مجھ سے ملنے کے لئے ہر کہیں آناً فاناً جمع ہو جاتے ہیں۔ اس شہر میں دو دن میں ہی بلا شبہ ایک ہزار ہم وطنوں کو گلے لگا لگا کر مل چکا ہوں گا۔ ایک دوسرے کو سینے سے لگا کر ملنا یہاں کی خاص روایت ہے۔

وہاں سے ہم گورنمنٹ کالج گئے جہاں شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد اقبال کاظمی، وائس پرنسپل انتصار رضوی جو لکھنؤ کے ہیں۔ شعبۂ انگریزی کے سلطان محمود ملک، سرور خاں نیازی اور محمد حنیف شاہ، جغرافیہ کے نعیم احمد اور عطاء اللہ خاں، تاریخ کے محمد اسلم ملک، معاشیات کے عبدالحمید، فزکس کے طاہر یعقوب اور ملک غلام محمد، زولوجی کے پیر محمد اقبال، باٹنی کے مقصود احمد اور ملک محمد فاروق، پولٹیکل سائنس کے ملک محمد سلیم احسن اور محمد اسلم خاں۔ اردو کے محمد اجمل نیازی، کیمسٹری کے عبدالوحید اور عبدالرؤف نیازی، ایجوکیشن کے خالد رشید اور لائبریرین محمد اسلم خاں غلبلی کے علاوہ کئی سینیر طلبا اور شہر کے وہ لوگ بھی شامل تھے جو میرے ساتھ ساتھ آئے تھے۔ فضل رحمان، غلام نصیر خاں، سلطان احمد وغیرہ ایک بڑے ہال میں موجود تھے۔ اس دن سورج گرہن تھا۔ لڑکوں کو مضرت رساں روشنی سے بچانے کے لئے ان کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ لیکن اس استقبالئے کی حیثیت خالص ادبی بن گئی تھی کیونکہ وہاں مجھے ہندوپاک کے اردو ادب پر ہی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے تقسیم سے پہلے کی ادبی فضا، ارباب ذوق، ترقی پسند تحریک اور آزادی کی جدوجہد کا ذکر کرنے کے بعد دونوں ملکوں کے فسادات پر لکھے گئے افسانوں اور ناولوں کا جائزہ لیا اور اس کے بعد ادبی تحریکوں کے زوال اور جدید رجحانات کے ابھرنے اور نئے نئے تجربات، کاوشوں اور ادبی رسائل کے اجرا اور کتابوں کی اشاعت پر بحث کی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں کے استادوں نے بھی اس ادبی بحث میں خاصی دلچسپی دکھائی۔ وہاں بھی سید انوار ظہوری نے میرے بارے میں ایک تقریر کی اور پروفیسر سلیم احسن نے سرائیکی میں میرے بارے میں ایک دلچسپ نظم سنائی جس میں ایک عورت کی طرف سے لمبی چھٹی لے کر آنے کی استدعا کی گئی۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک

www.taemeernews.com

دلچسپ واقعہ بھی سنایا کہ جب میں لکھنو سے روانہ ہوا تھا تو خواجہ انوارالدین کی والدہ نے میری بیوی کو متنبہ کیا تھا کہ اپنے وطن سے میں لوٹ کر نہیں آؤں گا کیوں کہ وہاں کوئی ماضی کی محبوبہ ضرور میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن میری بیوی نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے کیوں کہ میرا شوہر بوڑھا ہو چکا ہے اور وہ بھی اگر کوئی ہوگی تو کئی بچوں کی ماں بن چکی ہوگی جس کا سر بھی سفید ہو چکا ہوگا۔" انور کی والدہ نے ہنستے ہوئے کہا وہ تو سر پر مہندی بھی لگا لیتی ہوگی۔ میں نے نظم کے بارے میں کہا۔ اس نظم کی ہیروئن تو سلیم احسن کی ہی عمر کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے میں نے اب تک اپنی بیوی سے ہی عشق کیا ہے ——

یوں یہ محفل بھی قہقہوں، خوش گوار باتوں اور پر تکلف چائے پر ختم ہوئی۔ میں دوستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا سڑک کے آس پاس کے گھنے ذخیرے کی طرف دیکھ دیکھ کر انھیں بتاتا ہوا کہ میں وہاں کبھی کبھی کچھ ہم جولیوں کے ساتھ بیر توڑنے کے لیے آیا کرتا تھا، پھر شہر میں لوٹ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد میرے پاس اتنا وقفہ تھا کہ ایک گاؤں رودکھڑی سے ملنے کے لئے آئی ہوئی ایک بزرگ برقع پوش خاتون کے پاس بیٹھ کر میں نے کچھ باتیں کریں جو رودکھڑی سے اکھڑ کر ہندوستان میں جا بسنے والوں کے بارے میں تھیں۔ اُن میں میری بیٹی شکیل کے مرحوم سسر نوتہ رام سرور کا بھی ذکر تھا۔ رودکھڑی کے زیادہ تر لوگ ریواڑی میں بسے ہوئے ہیں جن تک اُن کا سلام پہنچانے کی میں نے ذمہ داری لی اور اس کے لئے میں نے میانوالی گزٹ کا ہی سہارا لیا ہے جو ہماری سوسائٹی جرنل ہے۔ میں تھوڑی سی شاپنگ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے دوستوں فضل رحمان، شمیم احمد اور ملک محمد اکرم وغیرہ نے سنہری تلا اور سارکی کی کئی جوڑ چپلیں اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اور ایوب نیازی کے کئی کیسٹ خود ہی خرید کر دے دیئے۔ جب ہم غلہ منڈی میں سے گزر رہے تھے تو وہاں سے میں نے شیشے کی مانند صاف اور شفاف نمک کی تین چار چھوٹی چھوٹی ڈلیاں بھی اٹھا کر جیب میں رکھ لیں اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی جگہ میں نے پہلی بار بلوانگل ڈرامہ دیکھا تھا اور ۱۹۲۲ء میں میں نے پہلی بار دو سیاسی جلسوں میں

www.taemeernews.com

بھیم سین سچر اور مکند لال پوری کی تقریریں سُنی تھیں۔ دونوں صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار تھے۔ سچر کانگریس کے اور پوری یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے جس کے سربراہ سر سکندر حیات تھے۔ اس انتخاب میں پوری جیت گئے تھے۔ وہاں سے ہو کر پریس کلب میں گیا جہاں پاکستان ٹائمز، نوائے وقت، جنگ، اور مشرق کے نمائندے موجود تھے اُنھوں نے مجھ سے میرے اب تک کے دورے کے بارے میں تاثرات پوچھے اور میں نے اُن کے متعدد غیر سیاسی سوالات کے جواب دیئے۔ مجھے اُنھوں نے کئی اسپورٹس میگزینوں کے انگریزی و اُردو کے کئی شمارے تحفے کے طور پر عنایت کئے۔

تین بجے سہ پہر کو سلطان احمد کے ہی گھر پر عیسیٰ خیل کے اسسٹنٹ کمشنر توقیر احمد فائق کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں سید انوار ظہوری، محمد اجمل نیازی، اقبال یاسر، سلیم احسن، توقیر احمد فائق، سید گلزار بخاری، سوز زیدی، شرر صہبائی، مرتضیٰ جعفری خاور، سالار نیازی، تاج محمد تاج، اور فیروز شاہ نے اپنا کلام سنایا۔ یہ شعری نشست قدیم و جدید کا سنگم تھی، کچھ اشعار جو یاد رہ گئے ہیں درج کر رہا ہوں ؎

کام آئیں گے تعصب کے سہارے کب تک
تو سمجھتا ہے تری اصل نہ جانی ہم نے
(انوار ظہوری)

میں نے اجمل روشنی کی اک کرن مانگی تھی بس
آگ سارے شہر کو کس نے لگائی کیا ہوا
(محمد اجمل نیازی)

ٹپکے گی آج باغ میں اُمید کی کلی
میں کے شاخ گُل پہ نشاں دیکھتا ہوں میں

گلزار ہم چراغ نہیں آفتاب ہیں
ہنگامۂ طلوعِ سحر ہم پہ چھوڑ دو
(سید گلزار بخاری)

وہاں کی خاک میں پلتے ہیں اَن گنت سورج
وہ ایک شہر کہ سرچشمۂ حیات بھی ہے
(فیروز شاہ)

www.taemeernews.com

رات اتر رہی تھی۔ گاڑی کا وقت بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ احباب کا ہجوم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جتنے لوگ مکان کے اندر تھے اتنے ہی باہر گلی میں بھی کھڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شکریے کے کلمات کہے۔ اپنے وطن میں مجھے جو بے پناہ محبت ملی تھی اُس کا تجزیہ کیا اور مشاعروں سے بھی اپنی دیرینہ رغبت کا ذکر کیا۔ وہاں جا کر جو خواب پورا ہو گیا تھا اور اب خوابوں کا جو نیا سلسلہ شروع ہونے والا تھا اُس کی ابھی سے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے نشان دہی کی۔ میانوالی کے لوگوں کو دہلی اور لکھنؤ کے میلوں میں آکر شامل ہونے کے لئے مدعو کیا۔ حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے اپنے ہم وطنوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ یہ تو نہ کہہ سکا کہ پھر کب آؤں گا۔ لیکن اِس خواہش کا اظہار ضرور کر دیا کہ بار بار آنا چاہوں گا تاکہ یادیں اور خواب ایک اذیت بن کر میرا تعاقب نہ کریں ـــــ

اسٹیشن تک چھوڑنے کے لئے بہت سے لوگ میرے ساتھ ساتھ آئے۔ ملک محمد اسلم نے ایک خوب صورت طلائی ہار بہ وقتِ رخصت میرے گلے میں ڈال دیا جسے میں اپنے ساتھ بڑی حفاظت سے لے آیا ہوں۔ بچے۔ بوڑھے اور جوان بار بار مجھ سے گلے مل رہے تھے، میں بار بار بچوں کے سر چوم رہا تھا اور اُنھیں دعائیں دے رہا تھا، خدا اُنھیں خوش رکھے۔ آباد رکھے ـــــ

جب گاڑی چلی تو میرے ڈبے میں فضل رحمان، شمیم احمد اور محمد اسلم ملک بھی وہیں موجود تھے۔ اُنھوں نے کہا ہم آپ کو داؤد خیل / بھجراں تک چھوڑنے کے لئے ساتھ آ رہے ہیں۔ ابھی ہماری باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ ہمارے پاس دو گھنٹے اور ہوں گے۔ اُسی ڈبے میں کالا باغ کا ایک نوعمر لڑکا رشید پراچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ جواب ماسکو

www.taemeernews.com

میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ اُس سے بھی اُنھوں نے یہ کہہ کر تعارف کرا دیا کہ وہ میرا لاہور تک ساتھ دے گا۔ میں نے حیرت اور خوشی کی کیفیت میں کھڑکی سے جھانکا۔ میانوالی لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ میرے دوست پلیٹ فارم کے سرے تک آگئے تھے۔ ابھی تک ہاتھ لہرا رہے تھے ــــ

کیا میں واقعی پھر کبھی واپس جا سکوں گا ؟ ــــ

میں اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور کھڑکی سے سر اندر کر لیا ــــ

www.taemeernews.com

پھر کیا حائل زمانہ رابطوں کے درمیاں

۹

۱۶ اور ۱۷ فروری کی درمیانی شب کا سفر جو میں نے میانوالی سے لاہور تک کیا، کئی معنوں میں دلچسپ ثابت ہوا۔ واں بچھراں اسٹیشن تک تسنیم احمد، فضل رحمان اور محمد اسلم ملک میرے ساتھ رہے۔ بیچ میں کندیاں جنکشن پر فاروق رو کھڑی کا انتظار کیا گیا کہ شاید وہ ریل کار سے راولپنڈی سے لوٹ آئے۔ لیکن ہماری گاڑی کے چلنے تک ریل کار نہ آسکی۔ جس گاڑی سے میں سفر کر رہا تھا وہ ماڑی انڈس اور لاہور کے درمیان شاید اُس وقت سے چل رہی تھی جب اس علاقے میں

www.taemeernews.com

ریلوے لائن بچھائی گئی تھی۔ اِس کے علاوہ آج تک کوئی اور گاڑی اِس لائن پر نہیں چلائی گئی ہے۔ فضل رحمان میرے لئے ایک پھولا ہوا لفافہ کیمو، کیلوں، اخروٹوں، کھجوروں، چلغوزوں اور کشمش کا میرے پاس چھوڑ کر واں بچھراں اُتر گئے۔ اُن کا اور اُن کے دونوں ساتھیوں کا یا تو رات اُسی گاؤں میں رہ جانے کا پروگرام تھا یا پھر بس مل جانے پر میانوالی لوٹ جانے کا۔ جس وقت میں اور ماسکو میں پڑھنے والا بشیر پراچہ میوہ جات سے پیٹ بھر رہے تھے۔ اچانک ساتھ کے زنانہ ڈبے میں کچھ عورتوں کے گیت گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز گاڑی کے شور پر بھی حاوی ہو گئی ؎

تیرے کن پا کے آیاں ونگاں نہ تڑوڑ دے
بانہہ بھنی ویسی ڈھولا دینی نہ مڑوڑ دے
ڈینہ لتھے ویڑھ گیاں ساریاں بلاڑیاں
چونڈی پا کے پچھدیاں تیریاں کھانیاں
اسے گلوں دیر تھئی ہے چن میڈے جانڑیاں
مل جاوے معافی مینوں اکھاں ہتھ جوڑ کے

"یہ چوڑیاں میں تیرے لئے پہن کے آئی ہوں، انھیں مت توڑ۔ میری کلائی نہ مروڑ کہ بازو ٹوٹ جائے گا۔ شام ہوتے ہی ساری سہیلیوں نے مجھے گھیر لیا اور چٹکی لے لے کر تیری کہانیاں پوچھنے لگیں۔ میرے دل کے رازداں چاند (محبوب) اسی وجہ سے مجھے آنے میں دیر بھی ہوئی ہے۔ لیکن میں ہاتھ جوڑ کر استدعا کرتی ہوں کہ مجھے معافی مل جائے۔"

گیت میرے دوست فاروق روکھڑی کا ہی تھا۔ مجھے خوشی ہوئی یہ عوام کی زبان پر چڑھ چکا ہے۔ ایسے کئی گیت میں رات کے سناٹے میں برسوں پہلے کبھی بنوں جاتے ہوئے جاٹ عورتوں کی زبان سے سُن چکا تھا۔ عورتیں جب خود کو تنہا پاتی ہیں تو اُن کی زبان پر بے اختیار گیت آجاتے ہیں،

www.taemeernews.com

گیت گاتے گاتے وہ رونے بھی لگتی ہیں۔ گاڑی کے سفر میں ہوں یا چکی پیس رہی ہوں یا کشیدہ کاری میں مصروف ہوں یا اوکھلی یا گھڑے کے جسم پر ہاتھوں سے ئی ئی کرمیدے کی سوتیاں بیل رہی ہوں۔ اُس وقت بھی اُن کی آواز خاصی رندھانسی تھی۔ گیت گاتے گاتے روتے بھی جانا پنجاب کی عورتوں کا مقدر بن چکا ہے ـــــ

پراچہ کی اور میری باتیں سُن کر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ایک بزرگ اچانک ہمارے پاس آبیٹھا۔ سفید ترشی ہوئی داڑھی، بھاری اوورکوٹ اور سر پر ٹوپی! بولا "آپ دلّی میں رہتے ہیں یا کسی اور شہر میں"۔ میں نے اُسے بتایا، "رہتا تو میں لکھنؤ میں ہوں، پر میرا ایک گھر دہلی میں بھی ہے جو جائیداد کے معاوضے میں باڑہ ہندو رائے صدر بازار میں ملا ہے"۔ وہ کہنے لگا میں بھی وہیں کا رہنے والا تھا۔ اب لاہور میں رہتا ہوں۔ کچھ سال پہلے اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر ایک پنڈت دوست سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ سنہ سینتالیس کے فسادات میں اُسی نے ہماری جان بچائی تھی۔ اپنے گھر میں ہمیں کئی روز تک چھپا کر رکھا تھا۔ تب میرے دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ اُنھیں میں وہ لرزہ براندام کر دینے والے واقعات سناتا تھا تو اُنھیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں کر بچ نکلے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ وہاں جا کر پنڈت شیو نرائن کے مہمان ہوئے۔ اپنا گھر دیکھا جس میں سرگودھا کا ایک ہندو خاندان آباد ہے تو بہت خوش ہوئے۔ وہاں بھی دو دن رہے، بڑی خاطر تواضع کی اُنھوں نے۔ کیا آپ بھی اپنے گھر گئے تھے؟ ـــ"

میں نے اُسے گذشتہ دو دنوں کی یاترا کا احوال کہہ سنایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔ پھر یہ کہہ کر "اپنا گھر اپنا گھر ہوتا ہے" دوبارہ کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور منھ پھیر کر سگریٹ پینے لگا۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔ گاڑی سرگودھا سے نکل چکی تھی۔ میں اوپر کے برتھ پر بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گذشتہ دو دنوں کے سارے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ سارے دوستوں کے چہرے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ محبّت

www.taemeernews.com

کا ذائقہ میں جانتا ہوں۔ اس کے معنی بھی خوب سمجھتا ہوں۔ یہ کوئی اور بڑی چیز تھی جس سے میرا دامن بھر گیا تھا۔ پتہ نہیں کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ ایک بلّی کسی اسٹیشن پر ڈبے میں گھس آئی تھی اور گاڑی چل پڑنے کی وجہ سے اُتر نہیں سکی تھی، اُس کی زور زور کی میاؤں میاؤں کی آواز نے پھر جگا دیا۔ جو لوگ بیٹھے بیٹھے سفر کر رہے تھے وہ سفر کی بوریت کو دور کرنے کے لئے بلّی کے چلّانے کے ساتھ ساتھ میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر ہنستے ہی چلے جاتے تھے۔

گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ چل رہی تھی۔ لاہور کے دفتروں میں کام کرنے والے بابو شیخوپورہ سے ہی گاڑی میں بھر گئے۔ قریب قریب سب ہی کے ہاتھوں میں ٹفن بکس تھے۔ راستے میں قلعہ ستار شاہ، چیچوں کی ملیاں، وغیرہ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے بھی لوگ سوار ہوئے۔ اور وہ سب باتیں بھی کرتے رہے۔ زور زور سے۔ افغانستان اور روس کے مسئلہ پر۔ ان دنوں یہی سب سے بڑا موضوع تھا۔ ایک شخص بولا، "روس افغانستان کے بعد پاکستان کو ہڑپ کر کے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کو اس وقت مل کر اپنا دفاع کرنا چاہیئے۔" دوسرے آدمی نے رائے دی، "اندرا گاندھی ایک مرتبہ پاکستان آجائے تو اُسے ساری صورت حال کا پتہ چل جائے گا۔ دلّی میں بیٹھ کر اُسے یہاں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔" ایک تیسرا آدمی بولا، "اُسے تو یہ بھی نہیں پتہ یار، جب وہ الکشن جیتی تھی تو یہاں اُس کی پارٹی کی جیت میں کتنی دلچسپی لی گئی تھی۔ میں نے تو سُنا ہے انارکلی میں اس کے زندہ باد کے نعرے تک بلند ہو گئے تھے ــــ!"

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہیں یہ سب مجھے سُنانے کے لئے تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن اُن میں کوئی بھی میری طرف مخاطب نہیں تھا، نہ ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ رات کو وہ بزرگ جو سامنے کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، اُس کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ شاید کہیں پڑ کر سو گیا ہوگا۔ بشیر پراچہ اور میں بڑی خاموشی سے اُسی لفافے میں سے پھل نکال نکال کر ناشتہ کر رہے تھے۔ اُس نے مجھ سے صرف اِس

www.taemeernews.com

موضوع پر گفتگو کی کہ وہ ایک لڑکی سے عشق کرتا ہے جس کی شادی کسی ایر فورس کے آفیسر کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ وہ لڑکی بھی اُس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی، اُس نے مجھ سے اس کا حل پوچھا تو میں نے کہا "اس میں تمہارا کیریر داؤ پر لگ جائے گا۔ تمھیں ڈاکٹری ضرور پاس کر لینی چاہیئے۔ اور لڑکی کو بھی سمجھاؤ کہ جس سے تمہاری سگائی طے ہو چکی ہے اُس کا کیریر بھی برا نہیں۔ ساتھ رہتے رہتے محبت ہو ہی جاتی ہے اور ماضی کے نشان بھی دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن پراچہ نے بتایا "وہ تو مایوس ہو کر خودکشی کر لے گی۔ میں اُسے جانتا ہوں"۔ تو پھر اس کا ایک ہی علاج ہے کہ وہ لڑکی خود اپنے منگیتر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دے اور اس کو صاف صاف لکھ دے کہ وہ اس کے لئے اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکے گی اس لئے وہ رشتہ توڑ دے۔ اگر وہ شخص حقیقت پسند ہوگا تو اُسے چھوڑ دے گا اِدھر وہ کسی سبجکٹ میں ایم۔ اے کرتی رہے۔ اُدھر تم ماسکو میں رہ کر اپنی تعلیم پوری کر لو۔ لیکن اس دوران میں یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم کسی دوسری لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاؤ اور پھر کبھی واپس نہ آؤ۔ زندگی میں بہت سی تبدیلیاں اچانک رونما ہو جاتی ہیں"۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ "اگر وہ لڑکی مجھے بھول جائے تو ٹھیک ہے ورنہ میں ضرور واپس آجاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو!—"

گاڑی شاہدرہ اسٹیشن پر رُکی تو وہ اپنا بیگ کندھے سے لٹکا کر اُتر گیا۔ یہ کہہ کر "میں ماسکو سے آپ کو خط لکھوں گا اور شاید آپ سے ملنے کے لئے ہندوستان بھی آؤں —!"

ایف سی کالج میں ڈاکٹر آغا سہیل کے بنگلے پر پہنچ کر اس کے بیٹے محسن اور اس کے دوست اُسامہ کے ساتھ پولیس اسٹیشن گیا، وہاں جا کر آمد کی رپورٹ درج کرائی۔ اس کے بعد انارکلی میں محمد طفیل صاحب سے مل کر واپس آ گیا۔ فون پر انتظار حسین، طاہر تونسوی اور میمونہ انصاری سے بات ہوئی۔ اسی دوران میں آغا سہیل بھی کالج سے آ گئے۔ انھوں نے کراچی کے دوستوں کے پیغام دیئے۔ اور شام کو سائرہ ہاشمی کے یہاں کھانے کی خبر دی۔ میں نے سائرہ ہاشمی کو فون

www.taemeernews.com

کرکے اپنی آمد کی اطلاع دی تو اُسے بڑا اطمینان ہوا کیونکہ اُس نے کئی لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا ـــــ

دوپہر میں ریڈیو پروڈیوسر اور اُردو کے نوجوان شاعر ستار سید جو ہمارے شہر کے ہی ہیں ملنے کے لئے آئے۔ اُن کا کلام ابھی تک ہندوستان میں نہیں پہنچا لیکن وہ پاکستان کے معیاری رسالوں میں بہت چھپتے رہتے ہیں۔ اُن کے کچھ اشعار دیکھئے ؎

قحطِ آواز میں میٹھی باتوں کا رس کان میں گھولیئے
شہر لب بستہ ہے منتظر آپ کا، بولیئے، بولیئے
اپنے اپنے گھروں میں مقفل مکیں، گھٹ کے مرنے لگے
ہر طرف سے ہوا دستکیں دے رہی ہے کہ در کھولئے
یہ دیارِ تہی داماں ہے، یہاں اپنی مرضی کہاں
جس طرف بے ارادہ ہوا چل پڑی، اُس طرف ہو لیے

زمیں پہ پانی نہیں ہے، آتش برس رہی ہے ‏ ‏ دبک کے بیٹھے ہوئے ہو کیوں اپنے مسکنوں میں

پھول کو ترسیلِ خوشبو کی صلاحیت ملے ‏ ‏ لفظ کو آواز میں ڈھلنے کی تربیت ملے
کر لیا حائل زمانہ رابطوں کے درمیاں ‏ ‏ کس طرح اِک دوسرے کی خیر و عافیت ملے

گلی گلی زنجیریں چھنکیں پاؤں کی ‏ ‏ لئے ہوئے متحیر چہرے، روزن جاگے

مشہور ناول نگار حامد سعید کے بیٹے سلمان سعید بھی آ گئے جو ٹی وی پر پروڈیوسر ہیں۔ افسانے اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد فارسی کے استاد حفیظ الرحمان بھی آ گئے۔ اُن کے ساتھ بھی گپ شپ رہی ـــــ

شام کو چھ بجے آغا سہیل کے ساتھ سائرہ ہاشمی کے گھر جانے کے لئے نکلا آغا سہیل نے کہا "آج پیدل چلیں گے اُن کا گھر بہت دور نہیں ہے۔" لیکن معلوم

www.taemeernews.com

ہوا سڑکیں ناپنے کا ان کا اپنا ایک پیمانہ ہے۔ چلتے چلتے گھنٹہ بھر ہو گیا تو پتہ چلا وہ راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ دراصل وہ میری ہمت کا امتحان لینے کے لئے اپنی ہمت کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ راستے میں کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملی۔ پھر اچانک انھیں یاد آیا کہ شیر پاؤ پل کے پاس ہی تو اُن کا مکان ہے، ایک مسجد کے عقب میں۔ چلتے چلتے شیر پاؤ پل کے پاس پہنچے تو انھیں وہ مسجد کہیں نہ دکھائی دی جس کی نشانی انھیں سائرہ نے فون پر بتائی تھی۔ میں تھک ہار کر فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گیا اور کہا "میں تو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہیں بنائے لیتا ہوں تم اسی کے آس پاس محترمہ کا گھر تلاش کرو۔" وہ کچھ دیر تک میرے پاس کھڑے ہنستے رہے۔ کھسیانے سے بھی ہو رہے تھے۔ میں نے کچھ دم لے لیا تو پھر اُٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ اور ایک میل لمبا شیر پاؤ پل کراس کیا۔ جس کے وسط سے اندھیرے میں ایک مسجد کے سفید سفید چمکتے ہوئے مینار دکھائی دے گئے تو جی خوش ہو گیا۔ لیکن درمیان میں کہیں بھی اُترنے کا راستہ نہیں تھا۔ ناچار پورا پل عبور کر کے ایک نیچے بنے ہوئے راستے سے پھر لوٹے سی مسجد کو تلاش کرتے ہوئے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "یار پاکستان کو پُل بنانا نہیں آیا۔ یہی پُل سیدھا امرتسر بھی جا سکتا تھا۔" آغا ہنسنے لگے۔ اور پھر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ایک کوٹھی میں گھس گئے۔ وہاں سے بھی ناکام لوٹے تو پھر میرے آگے آگے چل پڑے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی کافی تھک چکے تھے لیکن انھیں منزل تلاش کرنی تھی۔ انھوں نے میری اس تجویز پر بھی کان نہ دھرا کہ لوٹ چلیں۔ فون پر کہہ دیں گے کہ گھر نہیں ملا۔ بولے "گھر واپس پہنچنے کے لئے بھی تو پھر دو گھنٹے چلنا پڑے گا۔" خدا کی شان مسجد کے پاس پہنچ کر بھی کوئی ایسا مکان نظر نہ آیا جس میں سائرہ ہاشمی نام کی کوئی جدید افسانہ نگار رہتی ہو۔ مسجد میں بھی گہری خاموشی تھی، نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ رہے نام اللہ کا۔ شاید میں ہی قسمت کا دھنی تھا کہ جب آگے بڑھنے کا سارا حوصلہ چھوڑ چکا تھا کہ ایک خالی تانگہ آتا ہوا دکھائی دیئے گیا۔ ہم دونوں اس کی ٹپ ٹپ کی مدھر آواز پر کان لگائے کھڑے رہے

www.taemeernews.com

جیسے ویرانے میں اچانک کوئی حسینہ چھم چھم کرتی آجائے۔ مگر وہ شان بے نیازی سے پاس سے گزر کر جانے لگا تو میں اُچک کر پیچھے کی سیٹ پر جا بیٹھا اور تانگے والے سے کہا:۔

"بھائی ہم پردیسی آدمی ہیں۔ بڑی دیر سے سینٹ جونز پارک تک پہنچنے کے لئے بھٹک رہے ہیں۔ اگر اسی طرح سڑکوں کی خاک چھانتے رہے تو مارشل لا کے قوانین کے تحت دھر لئے جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکام کو تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو بے قصور دُرّے بھی کھائیں۔ تو ہم پر رحم کھا اور ہمیں ہماری منزل مقصود پر پہنچا۔ ہم تجھے خاطر خواہ مزدوری دیں گے اور خدا الگ تجھے اس کا اجر دے گا۔"

آدمی شریف تھا۔ اُس نے آغا سہیل کو بھی بٹھا لیا اور سڑک کا موڑ کاٹ کر تانگہ مسجد کے عین پیچھے 'الفیصل' کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بلکہ اس کا گھوڑا ہی خود بہ خود وہیں رُک گیا۔ جیسے اُسے معلوم ہو کہ لاہور کے جتنے ادیب اور شاعر اس طرف آتے ہیں تو وہ یہیں اُتر جاتے ہیں۔ سخت تھکن سے وہ ساری خوش گواری تو ذہن سے غائب ہو چکی تھی جسے لے کر میں گھر سے نکلا تھا۔ لیکن وہاں پہنچنے والے ہم ہی پہلے مہمان تھے۔ اگر سب لوگ آبھی چکے ہوتے تب بھی میں سیدھا صوفے پر جا گرتا۔ سائرہ پورا ماجرا سُن کر افسوس کرنے لگی۔ اور بولی، میں آپ کو کیمو کھلاتی ہوں۔ چائے پلواتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے کہیں سے بھی فون کر لیتے تو میں خود گاڑی لے کر پہنچ جاتی ——"

تھوڑی ہی دیر بعد صلاح الدین محمود اور اُن کی بیگم، عبدالعزیز خالد اور اُن کی بیگم، محمد خالد اختر اور اُن کی بیگم اور ایک اور وکیل صاحب بھی مع اپنی بیگم کے پہنچ گئے۔ سائرہ کے شوہر یعقوب علی خاں صاحب جو ایک بہت ہی مشہور اور معروف ترین ایڈووکیٹ ہیں تھوڑی دیر بعد اپنے موکلوں سے نپٹ کر ہم لوگوں سے مل کر پھر لوٹ جاتے تھے۔ صلاح الدین محمود نے سہگل، کانن بالا، جوتھیکا رائے اور کے سی ڈے جیسے گلوکاروں اور نیو تھیٹرز کا قصہ چھیڑ دیا۔ انھوں نے میرا بائی کے گیتوں کے بارے میں بھی

www.taemeernews.com

گفتگو کی۔ وہ کائنات اور زمین کے آغاز کے حوالے سے میرا کو 'وقفۂ گل' کہتے ہیں۔ اُن لمحوں میں صلاح الدین محمود کی زبان سے میرا بھجن سُن کر بڑی فرحت نصیب ہوئی اس لئے کہ چار سو سال کے بعد بھی میرا کی حیات اور شاعری اُن کے نزدیک گہرے پانی کی سماعت کا درجہ رکھتی ہے ؎

چاکر رہسوں، باگ لگاسوں، نت اٹھ درسن پاسوں
برندابن کی کنج گلن میں، تیری لیلا گاسوں
کہنے چاکر راکھو جی

۱۹۷۵ء میں سویرا کی اشاعت نمبر ۹ ۴ میں میرا بائی کے دس بھجن شائع کئے گئے ہیں جو ایم ایس سُبھ لکشمی کی آواز سے فلم بند کئے گئے ہیں اور زبان اور تلفظ کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ صلاح الدین محمود نے میرا بائی کی حیات اور شاعری پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے اور اشفاق انور نے جو میرا کی پوری پداولی بھی شائع کر چکے ہیں، اُس کے گیتوں کا ایک مبسوط فرہنگ بھی تیار کیا ہے۔ حیرت اس بات پر نہیں ہوئی کہ پاکستان میں برصغیر کی چار سو سال پرانی اس یاترا کے اولین قدموں کے نشان تلاش کرنے کی سعی کی گئی بلکہ افسوس یہ سوچ کر ہوا کہ ہمارے اُردو کے بیشتر ہندوستانی رسالے اپنی صحافتی تاریخ سے بہلوتہی کرتے ہیں اور کبھی شرمندہ نہیں ہوتے ــــ!

محمد طفیل صاحب کی آمد کی بھی خبر گرم تھی جب اُن کا انتظار بہت لمبا ہو گیا تو ہم لوگ کھانے کی میز کی طرف بڑھ گئے۔ کھانا کھا کر چائے پی گئی اور صلاح الدین محمود نے اپنی کچھ نظمیں سنائیں۔ عبدالعزیز خالد، مجھے اور آغا سہیل کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے گھر لے گئے۔ اُن کا اسٹڈی روم دیکھا جو فرش سے عرش تک بھرا ہوا تھا۔ بلکہ اُن کا پورا گھر ہی ایک کتاب گھر نظر آیا۔ کیوں کہ برآمدے میں بھی بڑے سلیقے سے کتابوں کے اونچے اونچے ریک سجائے گئے تھے۔ خالد صاحب فارسی اور عربی الفاظ کا ایک پورا سمندر پیے ہوئے ہیں۔ اُن کی نظمیں طویل اور مشکل الفاظ سے بھرپور ہوتی ہیں، جن کی تفہیم کے لئے کئی کئی ڈکشنریاں سامنے رکھنی پڑ جاتی ہیں۔

www.taemeernews.com

اور میرے پاس تو زیادہ ڈکشنریاں بھی نہیں ہیں۔ رات بہت بیت چکی تھی اس لئے وہاں زیادہ بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ خالد صاحب کی شاعری تو نہ سن سکے مگر اُن کی بیگم نے بہ صد اصرار گاجر کے حلوے کی ایک ایک پلیٹ اور کھلا دی۔ اس کے بعد خالد صاحب ہمیں اپنی گاڑی میں ایف سی کالج تک پہنچا گئے۔

۱۸ فروری کی صبح طاہر تونسوی اور صلاح الدین محمود صاحب کی ملاقات شروع ہوئی۔ صلاح الدین صاحب میرے لئے سویرا کے وہ سارے گذشتہ شمارے لے کر آئے تھے جو مجھ تک ہندوستان میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ طاہر تونسوی کا ٹرانسفر اگرچہ ڈیرہ غازی خاں کے گورنمنٹ کالج میں ہو چکا تھا لیکن وہ صرف میری خاطر لاہور میں رُکے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے میں جتنے روز لاہور میں رہوں وہ میرے ساتھ ساتھ رہیں اور اپنے سارے دوستوں سے مجھے ملا دیں۔ صلاح الدین محمود صاحب نے ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں گورنمنٹ کالج تک پہنچا دیا۔

شعبۂ اُردو میں جاتے ہی مشرف انصاری، مشکور حسین یاد، علی ظہیر منہاس، سید مرتضیٰ زیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، خواجہ سعید، صدیق جاوید، خالد ملک اور اقبال نواز سے ملاقات ہوگئی۔

ان سب سے مجھے طاہر تونسوی ہی متعارف کراتے رہے۔ لیکن مجھے بار بار ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک دوسرے کو عرصے سے جاننے والے لوگ ایک مدت کے بعد پھر مل رہے ہیں۔ سلیم اختر کو میں بہ طور افسانہ نگار اور نقاد ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ افسانے پر اُن کی نظر بہت گہری ہے۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں کا تعارف کراتے ہوئے اُنھوں نے افسانہ نگاروں کی ایک کمزوری واحد متکلم کو پکڑ کر بحث کی ہے۔ "منٹو نے بھی اپنے بیشتر افسانوں میں 'مَیں' سے کام لیا ہے، لیکن منٹو نے اسی بہانے اپنی ذات بھی اُجاگر کی تھی۔ سائرہ 'میں' کے باوجود خود کو پس منظر میں رکھ کر کرداروں سے ایک بے نام سا رشتہ اُستوار کر لیتی ہے۔

www.taemeernews.com

افسانے میں اس تکنیک کو برتنے میں ہر تخلیق کار نے الگ الگ طریقے اختیار کئے ہیں۔ دو ایک امریکن رائٹرز نے تو زندگی بھر واحد متکلم میں افسانے لکھے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے ایک بار اس پر معترض ہو کر کہا تھا کہ اس طرح صرف ایک ہی کردار اہم بن جاتا ہے اور دوسرے کردار اسی ایک کردار کی عینک یا زاویۂ نگاہ سے دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس بات کا قطعی فیصلہ دو چار افسانے سامنے رکھ کر نہیں کیا جانا چاہیئے۔ 'میں' ہمیشہ افسانہ نگار کا کوئی ھــم خیــال کردار نہیں ہوا کرتا۔ وہ کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔ اور اسے تخلیق کار پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اسے کتنی سچائی سے پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یعنی بحث صرف اسی سچائی پر ہونی چاہیئے نہ کہ تکنیک پر۔ بہرکیف، سلیم اختر نے تنقید اور افسانوں اور ناولٹوں کی بے شمار کتابیں چھپوائی ہیں۔ اُن کے نام کے ساتھ اتنی زیادہ کتابیں وابستہ دیکھ کر ڈر نہیں لگتا بلکہ اُن سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پاکستان سے چھپنے والی ہر تیسرے نئے افسانہ نگار کی کتاب کا دیباچہ بھی یا تو انھیں کا لکھا ہوا ملتا ہے یا پھر ڈاکٹر وزیر آغا کا۔ باقی کتابوں پر احمد ندیم قاسمی یا میرزا ادیب کی آرا دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے فرصت کے لمحوں کا یہ آسان ترین کام ہندوستان میں مرحوم سید احتشام حسین بھی کیا کرتے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ بعض ادیب انھیں راستے میں روک کر اپنے بارے میں رائے لکھوا لیا کرتے تھے ۔۔! آج کل یہ کام ڈاکٹر محمد حسن اور شمس الرحمان فاروقی بھی کرنے لگے ہیں۔

مشکور حسین یاد اُردو کے مشہور مزاح نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ ان کی بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن وہ اسی وجہ سے مسرور اور مطمئن نظر نہیں آتے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے انسان کی جبلتوں اور خصلتوں کے سارے اسرار دریافت کر لئے ہیں۔ آپ اُن سے پہلی بار یا آخری بار کتنی ہی باوقار سنجیدگی سے ملیں پھر بھی وہ آپ کی شخصیت سے قطعاً اس طرح مرعوب ہوتے نظر نہیں آئیں گے جس طرح آپ نے اپنے دل میں ٹھان رکھی ہو گی۔ بلکہ ہر ہر لمحہ آپ کو

www.taemeernews.com

یہ احساس ہوتا رہے گا کہ اس آدمی کو مسکرانے سے باز رکھنے کے لئے اب کون سا نیا پینترا آزمایا جائے۔ مشکور حسین یاد نے ایک انشائیہ "کتاب" کی ابتدائی سطور اس طرح لکھی ہیں۔ "لکھنے والوں میں ذہانت برائے نام ہوتی ہے۔ ذہین ہونے کا زیادہ تعلق پڑھنے والوں سے ہے۔ قاری ذہین نہ ہوں تو کتاب کون پڑھے؟ اس کے علاوہ کتابوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ یہی ایک آدھ سوال ــــ بڑے سے بڑا مصنف بہت زور مارتا ہے تو اپنی تصنیف میں ایک کے بجائے ڈیڑھ یا پونے دو یا صد سے حد دو سوال کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس دوسرے سوال کو پہلے سوال کی پرچھائیں سے زیادہ اہمیت کبھی حاصل نہیں ہوتی اور بس۔ سوال ختم۔ کتاب ختم۔ کتاب کو زندہ رکھنا، اس کی قدر و قیمت متعین کرنا، اس کے ایک سوال کو ایک لاکھ سوال بنانا یہ سب کام پڑھنے والوں کا ہے۔ پڑھنے والے نہ ہوں تو لکھنے والوں کا ناطقہ بند ہو جائے۔ دراصل کتاب پڑھنے والوں کی چیز ہے لکھنے والوں کی نہیں، کتابوں پر مصنفین اپنے نام لکھوا کر اچھی خاصی حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔"!

مشہور اُردو افسانہ نگار میرزا ریاض سے بھی وہیں ملاقات ہوگئی اور غلام الثقلین نقوی سے بھی۔ میرزا ریاض کی ایک کہانی 'بیالیس روپے' ایک عرصہ ہوا ادب لطیف کے کسی شمارے میں شایع ہوئی تھی جسے میری بیٹی شکیل مومنی نے ہندی میں منتقل کر دیا تھا۔ میں تبھی سے اُن کے نام اور کام سے واقف ہوں، اُن کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اُن کے بارے میں بڑی سچائی سے یہ بات لکھی ہے کہ میرزا ریاض کے افسانوں میں خیر و شر کی آویزش ایک بڑی حد تک زیر سطح ہے۔ وہ ایک انسان کے طور پر بھی مجھے بہت شریف نظر آئے۔ اُن کے اندر ہنگامہ وغیرہ کی بو تک نہ محسوس ہو سکی۔ تخلیق میں شرافت یا ہنگامے کی بُو کے ذکر سے یاد آیا۔ احمد ندیم قاسمی اپنے دیہاتی افسانوں میں کسی الھڑ حسینہ سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں تو یہ دھڑکا برابر لگا رہتا ہے کہ وہ گھبرا کر اُسے بہن نہ بنا لیں۔ کرشن اتنا بڑا حسن پرست تھا کہ

www.taemeernews.com

اُس نے اپنے لکھے ہوئے چار سو افسانوں میں چار سو عورتوں کے لئے اتنی ہی بڑی تعداد میں نئی نئی تشبیہیں گڑھی ہوں گی۔ منٹو نے اپنے ہر کردار کے چاہے وہ عورت تھی یا مرد کپڑے اُتار اُتار ڈالے ہیں۔ بیدی جزیات کا ماہر تسلیم کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنے افسانوں کی ہیروئنوں کے جسم تک پہنچنے کے لئے بھی اتنی ہی باریک بینی سے کام لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور پتہ نہیں اگر ڈاکٹر وزیر آغا خود افسانہ نگار ہوتے تو وہ اپنی شرافت کا کون سا نیا معیار ادب کو دیتے! اپنے انشائیوں میں تو وہ صرف مسکرانے کی ہی تلقین کیا کرتے ہیں ــ غلام الثقلین نقوی پچاس سے اوپر ہو کر بھی ابھی تک اپنے ناولوں میں ایک بچہ نظر آتے ہیں اور اُن کا یہی کردار لافانی معلوم ہوتا ہے۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے شعبۂ فلسفہ کے اُستاد ڈاکٹر محمد معروف کے آفس میں بھی گئے جہاں وہ کچھ لڑکیوں کو پڑھا رہے تھے۔ اُنھوں نے جب زبیدہ خانم، نسرین سعیدہ، لطف النسا، وغیرہ اسٹوڈنٹس سے میرا تعارف کرایا تو وہاں سوالات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ افسانوں سے متعلق تو وہی سوالات تھے جو ہر نیا طالب علم جاننا چاہتا ہے۔ لیکن انھیں یہ معلوم کر کے زیادہ خوشی ہوئی کہ میں اسی شہر کا کبھی باسی تھا اور اس کالج میں بھی گھومنے پھرنے کے لئے آچکا تھا۔ جب ایک اسٹوڈنٹ کیمرہ لے کر پہنچ گیا اور چھوٹے سے کمپس میں اچھی بیک گراونڈ کی کھوج کرنے لگا تو وہاں کئی اور لڑکیاں بھی آکر کھڑی ہو گئیں، وہاں ایک بہت ہی لمبی لڑکی کو دیکھ کر میں نے کہا شاید تم ہی پاکستان کی سب سے طویل قامت والی لڑکی ہو تو اُس نے مسکرا کر یقین کر لیا۔ اُسے میں نے فوٹو کھنچوانے کے دوران دو سیڑھیاں نیچے ہی کھڑا ہونے کے لئے کہہ دیا تھا تاکہ فوٹو میں نظر آنے والوں کی صفوں میں ایک توازن نظر آسکے ــ طاہر تونسوی کے ساتھ میں لاہور اکیڈمی کے آفس اُردو بازار چوک میں بھی گیا جس کے مالک ابن انشا کے بڑے بھائی سردار محمود ہیں۔ اُنھوں نے مجھے حناڈائجسٹ کے کچھ پرچے اور ابن انشا کی بہترین کتاب 'اُردو کی آخری کتاب' کا بھی تازہ ایڈیشن عنایت کیا

www.taemeernews.com

ابن انشا سے میری ایک ہی ملاقات ۱۹۶۱ء میں دہلی کی پہلی انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں ہوئی تھی۔ ابن انشا کی اس کتاب کو مغربی پاکستان کے ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیرمین میر نسیم محمود نے یہ لکھ کر مسترد کر دیا تھا کہ اس سے طلبا کے لئے باقی ۵۶۶ درسی کتابوں سے بے نیاز ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اور یہ خدشہ بھی کہ اسے پڑھ کر استاد طالب علم اور طالب علم استاد بن جائیں گے۔ اس کتاب کا ایک مضمون "ہمارا ملک" (مطبوعہ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۹ء) غور طلب ہے ــــ

"ایران میں کون رہتا ہے؟" ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے ــ
"انگلستان میں کون رہتا ہے؟" انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے ــ
"فرانس میں کون رہتا ہے؟" فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے ــ
"یہ کون سا ملک ہے؟" یہ پاکستان ہے ــــ
"اِس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟" نہیں اِس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔ اِس میں سندھی قوم رہتی ہے۔ اِس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔ اِس میں بنگالی قوم رہتی ہے۔ اس میں یہ قوم رہتی ہے، اس میں وہ قوم رہتی ہے۔"
"لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں، سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا گیا ــــ؟"
"غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے ــــ"

لاہور جا کر میری پنجابی بولنے کی اچھی خاصی مشق ہو رہی تھی۔ ہر وقت پنجابی میں ہی اُردو ادب پر باتیں کرتے رہنا میرے لئے کوئی انوکھا تجربہ نہ سہی لیکن اب ایک روزمرّہ کا رویّہ بنتا جا رہا تھا۔ سنگ میل پبلشرز کے مالک نیاز احمد صاحب کے ساتھ بھی پنجابی میں ہی ہندوستان کے اُردو ناشرین کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اُنھوں نے وہاں آناً فاناً جو کھانا ملا وہیں منگوا کر کھلوایا۔ اس میں بھی پنجابی ڈشز اور پنجابی خلوص ہی شامل تھا۔ قیمے کے بڑے بڑے تندوری پراٹھے ایک مدّت کے بعد خوب میسر ہو کر کھائے۔ لکھنؤ میں گھر پر میری بیوی تو سے پر

www.taemeernews.com

کبھی کبھی ایسے پراٹھے بنا کر کھلا دیتی ہے جب وہ بہت مہربان ہوتی ہے۔ نیاز احمد نے اپنی مطبوعات کا ایک ڈھیر سا میرے سامنے لگا دیا۔ لیکن میں وہ سب تو ساتھ نہیں لا سکتا تھا کیوں کہ تحفوں میں ملنے والی کتابیں ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں جن کے لئے آغا سہیل نے اپنے گھر پر میرے لئے دو بڑے بڑے ریک خالی کر دیئے تھے۔ اور یہ دھڑکا برابر لگا رہتا تھا کہ ان سب کتابوں کو ہندوستان کیسے لے جا سکوں گا؟ میں نے میرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے 'فصیلِ شب' 'ستون' اور اقبال کا فارسی کلام۔ ارمغانِ حجاز کا پنجابی ترجمہ۔ سلیم اختر کی دو کتابیں 'ذکرِ اقبال' کا تعارف اور مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیاتِ جاوید' کی تلخیص، انصار عبدالعلی کے لکھے ہوئے بچوں کے ٹیلی ڈراموں کا مجموعہ خالی ہاتھ، شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ ایک اور کتاب جو احمد سعید صاحب کی انگریزی میں محمد علی جناح کے بارے میں لکھی ہوئی تھی وہ بھی لے لی اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا ایک بہت پرانا مجموعہ 'دانہ و دام' جو نیا ادارہ نے چھاپا تھا وہ نیاز صاحب نے وہیں سے منگوا کر عنایت کر دیا۔

طاہر تونسوی اس کے بعد مجھے مکتبہ عالیہ میں لے گئے جہاں اس کے مالک جمیل النبی سے تعارف کرایا۔ انھوں نے بھی بہت سی کتابیں تحفتاً دے دیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی 'اردو ادب میں طنز و مزاح' اور 'اردو شاعری کے مزاج' کے نئے ایڈیشن اور ان کے خاکوں کا نیا مجموعہ 'شام دوستاں آباد'۔ کشور ناہید کا مجموعہ کلام 'گلیاں دھوپ اور دروازے'، اخلاق احمد دہلوی کے مضامین کا مجموعہ 'پھر وہی بیان اپنا' قتیل شفائی کے دو شعری مجموعے۔ 'چھتنار' اور 'گفتگو'، میرزا ریاض کے افسانوں کا مجموعہ 'آندھی میں صدا'، سلیم اختر کا ناولٹ 'ضبط کی دیوار'، ساغر صدیقی کا مجموعہ کلام 'چادرِ صحرا' شامل ہیں۔ طاہر تونسوی نے اپنی ایک کتاب 'اقبال اور سید سلیمان ندوی' وہیں سے لے کر عنایت کی۔

ادیب دوستوں اور کتابوں کی ہم سفری ایک سی ہوتی ہے۔ دونوں سے آدمی بڑی رغبت سے ملتا ہے اور جتنے ملتے دونوں سے ہی تھوڑی سی دیر کے لئے

www.taemeernews.com

بیزار بھی ہو جاتا ہے۔ جس طرح آدمی چوبیس گھنٹے اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ کوئی بیوی بھی اپنے شوہر کے ساتھ چوبیس گھنٹے نہیں رہنا چاہتی!۔ صبح سے تین بجے سہ پہر تک میں ادیبوں اور کتابوں کے ہی درمیان گھوم رہا تھا۔ اُن سب سے رخصت لے کر ایک آٹو رکشا لی اور گھومنے کے لئے نکل پڑا۔ انارکلی، میکلوڈ روڈ، نسبت روڈ، ریلوے اسٹیشن اور پھر ایف سی کالج کی طرف راستے میں خوب ٹھنڈی ہوا کھائی۔ اور اسکوٹر کے خوش پوش ڈرائیور کے ساتھ باتیں بھی کیں۔ اس کے رکشا کے باہر انگریزی میں لکھا تھا۔ کم، کم، پلیز کم! اس سارے عرصے میں ادب کو بھلائے رکھا۔ صرف سوچتا رہا۔ شام کو پانچ بجے انتظار حسین نے چائے پر مدعو کر رکھا تھا۔ آغا سہیل اور میں آٹو رکشا سے جیل روڈ گئے۔ وہاں جمیل الدین عالی بھی مل گئے جو کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ شہرت بخاری، کشور ناہید، یوسف کامران، انور سجاد، یونس جاوید، ریاض انور، صلاح الدین محمود اور اُن کی بیگم بھی مدعو تھے۔ جمیل الدین عالی کا ایک پیغام لاہور پہنچتے ہی مجھے ملا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا "شاید رام لعل مجھے نہ جانتے ہوں لیکن میں رام لعل کو جانتا ہوں۔ اُن کے کراچی آنے کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کروں گا ـــ" اب جمیل الدین عالی سے ملاقات ہو گئی تو میں نے کہا میں تو آپ کو آپ کے دوہوں کے حوالے سے جانتا ہوں۔ برصغیر میں اُردو کے شاعروں میں دوہے تخلیق کرنے والوں میں ایک مدت سے آپ ہی سرفہرست چلے آتے ہیں۔ اور میرا ہمیشہ سے یہ یقین رہا ہے کہ اگر ہندوستان کے مشاعروں میں آپ ایک بار آ گئے تو پھر آپ کو واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ یا پھر آپ کو بار بار بلایا جائے گا۔ ہندوستان کی جنتا کبھی کبھی کسی شاعر کی ایسی ہی دیوانی ہو جاتی ہے ـــ جیسے فیض صاحب ہمارے یہاں مقبول ہیں۔

عالی جی نے ہم سب کی فرمائش پر کئی دوہے سنائے۔ شہرت بخاری سے بھی ایک غزل سُنی گئی۔ انور سجاد چائے پی کر فوراً چل دیئے تھے انھیں اپنے

www.taemeernews.com

جو نا منڈی کے کلینک میں پہنچا تھا۔ اس محفل میں دو ڈھائی گھنٹے تک خوب باتیں ہوئیں۔ قہقہے بھی چلے۔ چائے اور ناشتے کا دوسرا دور بھی چلا۔ مسز انتظار حسین کی تیز نظر اپنے سامان خورد و نوش پر جس میں گاجر کا حلوہ بھی شامل تھا اور مہمانوں پر اس لئے نہیں جمی ہوئی تھی کہ کون زیادہ کھا رہا ہے بلکہ اس لئے کہ ابھی تک کھانے کا سامان بچا ہوا کیوں ہے اور مہمان ہونے کے حقوق سے کون کون غافل ہے، یا وہ جان بوجھ کر تکلف کیوں کر رہا ہے۔ لیکن ہم سب بلا تکلف یہاں وہاں صوفوں پر، دیوان پر اور ایک دیوار کے ساتھ فرش پر لگے ہوئے چھوٹے سے قالین پر بھی بکھر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آزادی کے بعد پہلی مرتبہ پھر شلوار پہنی تھی اور کشور ناہید کے پاس بیٹھ کر ان کی اس تجویز کو رد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مجھ سے افسانہ سننے کے لئے کوئی نشست کی جائے۔ کیوں کہ اس سے میرا گھومنے پھرنے اور اس فضا سے پھر سے مانوس ہونے کا عمل رک جائے گا۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ پاکستان میں بھی کہیں نہ کہیں چھپ ہی جاتا ہے۔ اس طرح غائبانہ طور پر کسی تخلیق کو پڑھنے اور پرکھنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تکلف بھی نہیں ہوتا وہ تخلیق کار کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

جمیل الدین عالی نے مجھے اور ڈاکٹر آغا سہیل کو اپنی موٹر میں ایف سی کالج بھجوا دیا۔ راستے میں اتفاق سے ہم اسی چوک سے بھی گذرے جہاں ایک قتل کے ارتکاب کی سازش میں ماخوذ ہونے کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی ـــــ

۱۹ فروری کو احمد فراز سے ملنے کے لئے میں صبح دس بجے کشور ناہید کے آفس پہنچ گیا۔ وہ بہت ہی خوب صورت انسان اور بہت ہی خوب صورت شاعر ہے۔ پاکستان میں اس کے شعری مجموعے سب سے زیادہ بکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ملک میں کبھی ساحر لدھیانوی مقبول تھا۔ یہیں مسعود اشعر سے بھی ایک اور ملاقات ہو گئی۔ طاہر تونسوی سے بھی اسی جگہ ملنے کے لئے ساڑھے

www.taemeernews.com

گیارہ بجے وقت مقرر ہوا تھا۔ محمد اجمل نیازی بھی وہیں مل گئے۔ کشور ناہید نے اُن کے گورنمنٹ کالج لاہور میں طاہر تونسوی کی جگہ پر تقرری کی خوش خبری سنائی۔ طاہر تونسوی مجھے وہاں سے ساڑھے بارہ بجے اٹھا کر وائی ایم سی اے کے ریسٹوراں میں لے گئے۔ جہاں گورنمنٹ کالج کے استادوں کی طرف سے لنچ کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں خواجہ محمد سعید صدر شعبۂ اُردو، میرزا ریاض، ڈاکٹر سلیم اختر، مشرف انصاری، سید مرتضےٰ زیدی، صدیق جاوید، منیر لاہوری، علی ظہیر منہاس، جعفر بلوچ، شکور حسین یاد، اور صابر لودھی کے علاوہ احراز نقوی، سعادت سعید، وحید رضا بھٹی اور مکتبہ عالیہ کے مالکان جمیل النبی اور الطاف حسین بھی شامل تھے۔ لنچ بہت ہی پر تکلف تھا۔ اُردو افسانے پر بھی کچھ سوالات پوچھے گئے۔ خصوصاً ہندوستان میں نئے لوگوں کے بارے میں۔ اور میرزا ریاض اور کچھ اور دوست میرے لئے اپنی اپنی کتابیں بھی لے کر آئے تھے۔ خواجہ سعید صاحب نے گورنمنٹ کالج کی طرف سے 'راوی' کے کئی بیش بہا اور نایاب نمبروں کا ایک بہت بڑا پیکٹ عنایت فرمایا۔ شکور حسین یاد نے اپنی گاڑی کو بس میں تبدیل کر لیا۔ اور جگہ جگہ سواریاں اُتارتے ہوئے آخر میں مجھے ایف سی کالج میں پہنچا دیا۔ گاڑی کا ڈرائیور اُن کا بیٹا تھا جو ایم بی بی ایس کا اسٹوڈنٹ ہے ــــ

چار بجے احمد سعید صاحب کے گھر پر چائے تھی اور آٹھ بجے ڈاکٹر احراز نقوی کے یہاں کھانا تھا۔ رات کو قریب قریب ہر روز انور سجاد کے یہاں بھی چھوٹی سی محفل جمتی تھی جس میں ان کے اور میرے علاوہ آغا سہیل بھی ہوتے تھے۔ لاہور پہنچ کر میں نے اتنے مصروف پروگراموں کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ ہر جگہ کہیں نہ کہیں کھانے پر میرے ساتھ ساتھ مدعو ہونے کی وجہ سے آغا سہیل کی بیوی نے انھیں دھمکی دے دی تھی کہ اب وہ اُن کا نام پراشن کارڈ سے کٹوا دیں گی۔ شاید اسی لئے وہ کسی کسی پروگرام سے غائب ہو جاتے تھے ــــ

www.taemeernews.com

حامد سعید صاحب کے یہاں ہمارے علاوہ احمد ندیم قاسمی، سید قاسم محمود اور طاہر تونسوی بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ سلمان سعید بھی تھا جو حامد صاحب کا بیٹا ہے اور ٹی وی پر ڈرامہ پروڈیوسر ہے۔ حامد صاحب نے ایک بہت بڑا کیک منگوا رکھا تھا۔ اس شام کو منانے کے لئے جسے وہ میرے ہاتھ سے کٹوانا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے یہ کام اُردو کے بزرگ شاعر اور افسانہ نگار اور اپنے مشفق احمد ندیم قاسمی سے کرایا۔

احراز نقوی اور ان کی بیگم میمونہ انصاری نے رات کے کھانے پر بہت سے لوگوں کو بلا رکھا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ظہیر بابر، خدیجہ مستور، انور سجاد، سلیم اختر، آغا سہیل، فرخندہ لودھی، صابر لودھی، ابصار عبدالعلی، شہرت بخاری، تبسم کاشمیری وغیرہ کو۔ اب ہر محفل میں بار بار وہی لوگ مل رہے ہیں اس لئے اجنبیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔

خدیجہ مستور بہت کم گو ہیں۔ اتنی کم گو کہ انھوں نے مجھ سے لکھنؤ کے بارے میں بھی کچھ نہ پوچھا۔ ناول 'آنگن' ان کا بہترین کارنامہ ہے۔ احراز نقوی نے اپنا نیا مکان بڑے فخر سے دکھایا جس کے کچھ حصے ابھی مکمل ہونے باقی تھے، لیکن یہ سطور لکھتے وقت کلیجہ منھ کو آرہا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ۱۸ مارچ کو اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ جس کی اطلاع انتظار حسین نے مجھے ۲۱ مارچ کو دہلی میں آکر دی۔ اُن کی بیگم میمونہ انصاری اور بارہ سال کے اکلوتے بیٹے شجیع کا بھی بارہا خیال آتا ہے۔ کیا انسان واقعی اس قدر بے بس اور لاچار ہے کہ وہ اپنے سارے کام کبھی پورے نہیں کر پاتا۔؟

دہلی

www.taemeernews.com

میں نابینائیں نابینا

(۱۰)

بیس فروری کی صبح خالی تھی اس لئے کچھ دوستوں کو خطوط لکھے۔ کراچی سرگودھا، راولپنڈی، ملتان اور میانوالی۔ کچھ لوگوں کے خطوط بھی آئے انور سدید نے کوٹ ادو سے ٹرنک کال پر کہا۔ مجھے ایک بار پھر ملتان ضرور آنا چاہیئے اور وہاں سے کوٹ ادو بھی۔ وہ سرکاری مصروفیات کی وجہ سے لاہور نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ پشاور سے تاج سعید کا خط بھی ملا۔ اس نے میری پاکستان آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور میرے کراچی جانے سے پہلے لاہور میں

www.taemeernews.com

آکر ملنے کی خوش خبری دی۔ کراچی جانے کا ابھی تک کوئی پروگرام نہیں بن پایا تھا
ایسا لگتا تھا اب لاہور سے ہی واپس چلا جاؤں گا۔

گیارہ بجے ڈاکٹر آغا سہیل مجھے اورینٹل کالج میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سیادت بریلوی سے ملنے کا وقت مقرر تھا۔ وہیں میرزا ادیب صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی جن سے ملانے کے لئے میں نے محمد طفیل صاحب سے خاص طور پر درخواست کر رکھی تھی۔ بڑی محبت سے گلے لگا کر ملے۔ اب وہ پینسٹھ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ 'ادب لطیف' کی ادارت کا ایک شاندار دور اُن کے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔ انھوں نے چھٹی دہائی میں میرے کئی افسانے شایع کئے تھے۔ اور اپنے مضامین میں میرا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کیا تھا۔ ایک بار لکھا تھا، ہندوستان میں کرشن چندر کے بعد رام لعل اور مین راہی سے ایک نیا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے، اُردو افسانے کی کئی شاخیں پھیل چکی ہیں۔ اب یہ اتنا بڑا تناور درخت بن چکا ہے کہ اس کی شاخیں شمار کرنا بھی مشکل ہو گا۔ اس کی چھاؤں میں ہی ہمارے قارئین اب راحت محسوس کیا کریں گے۔ اُردو افسانے کی ترقی کی ضمانت اسی گہری اور ٹھنڈی چھاؤں سے مل سکتی ہے۔ میرزا ادیب صاحب نے اپنے ڈراموں کا نیا مجموعہ 'شیشہ و سنگ' بڑی محبت سے عنایت کیا جو تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ فاتح قسطنطنیہ، نواب سراج الدولہ، سید احمد شہید، نواب جھجر، مسجد قرطبہ، احمد شاہ ابدالی، حضرت مجدّد، سلطان محمود غزنوی وغیرہ۔ جس ادیب کا نام لیتے ہی صحرا نورد کے خطوط یاد آجاتے تھے اسی کا نام اب ڈرامے سے پوری طرح جڑ چکا ہے۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے فصیل شب اور ستون سنگ بھی کے ناشر نیاز احمد صاحب پہلے ہی مجھے دے چکے تھے پاکستان میں اسٹیج کی روایت اگر مضبوط ہوتی تو میرزا ادیب کا ہر ایک ڈرامہ پیش کیا جا چکا ہوتا۔ پھر بھی انھوں نے آغا حشر کاشمیری اور امتیاز علی تاج کے بعد اُردو ڈرامے کی صنف کو مرنے نہیں دیا۔ اب یہ روایت پاکستان میں

www.taemeernews.com

ٹی وی پر زیادہ توانائی کے ساتھ اُبھری ہے ۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اپنے کالج کا مجلّہ تحقیق کے کچھ شمارے عنایت کئے ۔ کچھ پیکٹ علی گڑھ، دہلی اور لکھنؤ کے محققین کے لئے بھی دیئے، تحقیق کے شمارہ نمبر ا جلد دو میں دو مضامین خصوصی توجہ کے طالب ہیں ۔ ایک ڈاکٹر سید عبداللہ کا 'تاریخ لاہور پر مزید دھندلی سی روشنی' جسے بھولا ناتھ ولد منشی رائے دین دیال کھتری ملتانی کی ایک فارسی قلمی کتاب 'تحفۃ الہند' کو ماخذ بنا کر لکھا گیا ہے اور دوسرا مضمون ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا 'پنجاب کا سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول' ہے ۔ جو عہد انگلشیہ کے وکٹورین عہد سے تعلق رکھتا ہے ۔ جلد ایک کے شمارہ خاص تین و چار میں ایک اور مضمون ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا ۔ انجمن پنجاب' اورینٹل یونی ورسٹی کی تحریک اور سرسید احمد خاں بھی اس لحاظ سے خاصا اہم ہے کہ اس سے انیسویں صدی کے اواخر میں اُردو، ہندی یا پنجابی کو ذریعۂ تعلیم اعلیٰ بنانے کے بارے میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے اختلافات پر روشنی پڑتی ہے ۔ ان ہی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی کو ان پر مسلط کر دیا تھا ۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری پنجاب یونیورسٹی کے غیر ملکی اُردو طلبہ کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر اور اُردو کے جدید شاعر بھی ہیں ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے آفس میں کئی اور لوگوں سے بھی ملاقات ہو گئی ۔ ڈاکٹر عبیداللہ خاں جنھوں نے وقار عظیم کی نگرانی میں پریم چند پر ریسرچ کی تھی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی جنھوں نے جائسی پر کام کیا ہے، ڈاکٹر تبسم کاشمیری ڈاکٹر معین الدین، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی جن کے ساتھ سرگودھا میں بھی ایک مختصر ملاقات ہو چکی تھی ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اورینٹل کالج کی بیش قیمت اور نادر مطبوعات عنایت کیں ۔ جن میں کالج کے متعدد میگزینوں کے علاوہ اورینٹل کالج میگزین کا وہ خصوصی شمارہ جس میں کالج کے جشن صد سالہ ۱۹۷۳ء کی مکمل رپورٹ موجود ہے اور

www.taemeernews.com

پنجاب یونی ورسٹی کے جشن صد سالہ کا رپوتاژ بھی شامل ہے ان کے علاوہ اُنھوں نے مجھے سید رحیدر بخش حیدری کی مختصر کہانیاں اور گلزار دانش کی دو جلدیں بھی عنایت کیں۔ گلزار دانش کا قلمی نسخہ انھیں ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کی ایک لائبریری میں ملا تھا۔ سید حیدر بخش حیدری کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ انھوں نے ترجمے بھی کئے اور طبع زاد کتابیں بھی لکھیں۔ ان کے قصے ہمارے افسانوی ادب کے آغاز کے سلسلے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں ــــ

کتابوں کا بوجھ خاصا بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ان کے بنڈل بندھوا کر میں تھوڑی دیر کے لئے آغا سہیل کے ساتھ طاہر رضا زیدی کے آفس میں چلا گیا۔ جو مصطفےٰ زیدی مرحوم کے کزن ہیں اور کسٹم آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی کار لے کر ہم پھر کالج میں آئے اور کتابوں کے بنڈل اٹھوائے۔ کالج کے احاطے میں لڑکیاں بہت زیادہ تعداد میں نظر آئیں، جس پر میں نے حیرت کا اظہار کیا تو آغا سہیل نے ہنستے ہوئے بتایا اسی کالج کے بارے میں ایک بار ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا تھا وہاں کچھ لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔!

شام کو اُردو کے مزاح نگار، خاکہ نگار، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار جناب محمد خالد اختر نے اپنے یہاں چائے پر مدعو کر رکھا تھا۔ خالد صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آزادی سے بہت پہلے سے لکھ رہے ہیں۔ اور احمد ندیم قاسمی صاحب کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنی کئی نایاب کتابیں عنایت کیں جن میں کھویا ہوا افق اور چاکی واڑہ بھی شامل ہیں، کھویا ہوا افق کو آدم جی پرائز مل چکا ہے۔ اُن کے یہاں آغا سہیل، احمد ندیم قاسمی، تاریخ کے پروفیسر میاں نامدار خاں جو ایجوکیشن بورڈ کے سابق سکریٹری ہیں، محمد کاظم، مسعود اشعر، رشید ملک، محمد باسط، سائرہ ہاشمی، نفیسہ خانم جو شیریں کے قلمی نام سے افسانے لکھا کرتی ہیں اور ہندوستان کی حمیدہ سلطان کی ہمشیرہ بھی ہیں مدعو تھے۔ محمد اختر خالد اور ان کی بیگم نے

www.taemeernews.com

بہت ہی پرتکلف چائے اور بہت زیادہ میٹھے ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا جس کی وجہ سے ہماری آپس کی باتیں کچھ پھیکی پڑ جاتی تھیں۔ لیکن قاسمی صاحب کی پرلطف گفتگو بار بار اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ نورجہاں، کشمیر اور تا منگیشکر کا بھی ذکر چلا تو کہا گیا وہ ساری تجاویز سرد پڑ گئی ہیں جو نورجہاں کے بدلے میں کشمیر اور کشمیر کے بدلے میں لتا منگیشکر کے فارمولوں پر مبنی تھی لیکن شیریں نے مجھ سے پوچھا۔ "آخر آپ کشمیر ہمیں کن شرائط پر دے سکتے ہیں تو میں نے جواب دیا۔ آج کل تو میں سیاست سے بہت دور ہوں اور صرف افسانہ نگاری کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ آپ نورجہاں کو بھی اپنے پاس رکھیئے اور لتا اور کشمیر بھی لے لیجئے۔ لیکن فراغت پاتے ہی میں تینوں کو آپ سے واپس لے لوں گا اور یہ معاہدہ صرف میرے اور آپ کے درمیان ہوگا۔" اس پر خوب قہقہے لگے۔

ساڑھے سات بجے تک یہ محفل چلتی رہی۔ میں نے واپڈا کالونی کے چھوٹے سے کپاؤنڈ میں لڑکوں کو جب رات کو بھی ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھا تو کہا۔ "شاید اسی وجہ سے پاکستان ہم سے ہاکی میں آگے نکل گیا ہے۔"

رات کا کھانا طاہر تونسوی کے یہاں تھا۔ وہاں تک مجھے اور آغا سہیل کو محمد کاظم صاحب نے اپنی گاڑی میں پہنچا دیا۔ اُسی گاڑی میں احمد ندیم قاسمی صاحب بھی تھے جنھیں اپنے گھر جانا تھا۔ راستے میں اچانک غالب کی 'انجمن آرزو' کا ذکر چھڑ گیا جس کے بارے میں ایک بار فکر تونسوی نے مجھے ایک خط میں اپنی ایک پھڑیا کی اطلاع دی تھی جو اُن کے جسم کے ایک خطرناک مقام پر اُبھر آئی تھی اور اس مقام کو اُس نے 'انجمن آرزو' کے ہی نام سے موسوم کیا تھا۔ میں نے یہ واقعہ قاسمی صاحب کو بتایا تو انھوں نے کہا۔ "پھوڑے کے اُس نازک ترین مقام کے بارے میں سب سے پہلے میں نے ہی غالب کی تشبیہ 'انجمن آرزو' سے مستعار لے کر ایک فکاہیہ میں لکھا تھا۔" قصہ بہرحال دلچسپ تھا اس لئے کار کے اندر خوب قہقہے لگے۔۔۔ ملتان روڈ پر پہنچ کر ہم نے طاہر تونسوی کی ہدت

www.taemeernews.com

کے بہ موجب پہلے تو دنیس سینہ تلاش کیا پھر پیپل کا وہ پیڑ جس کے سامنے یونچ ہا دسہ واقع تھا۔ لیکن وہاں کوئی بھی پیپل کا پیڑ نہیں دکھائی دیا تو آغا سہیل نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ طاہر تونسوی کے مخالف وہ پیڑ ہی اکھاڑ کرلے گئے ہوں تا کہ آپ وہاں نہ پہنچ سکیں، لیکن ایک جگہ اُس پیڑ کے بجائے خود طاہر تونسوی کو ہی کھڑے ہوئے دیکھ لیا، تو مجھے اس اطالوی ادیب کی بات یاد آگئی جس کا روم کے ایک چوراہے پر کئی لاکھ کے صرفے سے بُت تعمیر کیا جارہا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ اگر مجھے کل صرفے کی آدھی رقم دے دی جائے تو میں خود بقیہ زندگی چوراہے پر کھڑا ہونے کے تیار ہوں —!

کھانے پر آغا سہیل کے اور میرے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر، نیاز احمد، ڈاکٹر معروف، جمیل النبی، الطاف حسین اور خورشید میر موجود تھے۔ اُس وقت ٹی وی بھی چل رہا تھا اور امرتسر سے میں نے ہندوستان سے آنے کے بعد پہلی بار خبریں سُنیں۔ کھانے کے ساتھ ساتھ کرکٹ، بھارتی فلموں اور احمد فراز پر بھی گفتگو ہوئی —

رات دس بجے واپس آئے اور پھر حسب معمول چہل قدمی کرتے ہوئے انور سجاد کے گھر تک بھی گئے۔ انور سجاد نے مجھے میری نئی کتاب ڈوبتا اُبھرتا آدمی کے سرورق کا خاکہ بھی دکھایا۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار اور بہت اچھے آرٹسٹ بھی ہیں۔

اکیس فروری کی صبح اور دوپہر سید قاسم محمود کے لئے وقف تھی وہ صبح نو بجے آکر مجھے اپنے گھر لے گئے، پہلے اپنا آفس دکھایا جہاں سے رسائل شاہکار اور بے شمار کتابیں، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، سائنسی انسائیکلوپیڈیا، طلسم ہوش ربا سیریز اور ناول سیریز وغیرہ کئی سال سے شایع کی جارہی ہیں ان کے ہر کمرے میں اور برآمدوں میں بھی کتابوں کے انبار دیکھ کر میں نے کہا "شاید آپ کے کچن اور بیڈروم میں بھی کتابیں رکھی ہوں گی" یہ سن کر وہ مجھے کچن اور بیڈروم میں بھی لے گیا وہاں بھی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے

www.taemeernews.com

سید قاسم محمود کی بیوی نے کہا۔ "اِن کا بس چلے تو میری جگہ بھی کتابوں کو ہی دے دیں"۔ لیکن ان کی آنکھوں میں اپنے شوہر کے لئے محبت اور فخر کی بے پناہ چمک موجود تھی ۔

قاسم محمود کے آفس میں میں نے نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی مطبوعات بھی دیکھیں۔ بلوچی اور براہوی مصنفین کا تعارف، شیخ مبارک محمود پانی پتی کی ناول کی تاریخ، شاعری، عاداتِ مطالعہ کا ایک سروے، بچوں کے لئے علمی اور ادبی کتابیں، اور قومی مرکز پاکستان کی مطبوعات میں ڈائرکٹری ناشران و تاجران کتب، مغربی پاکستان میں مرد کیا پڑھتے ہیں، پاکستان کے ادبی انعامات شعرا اور پیشوں کی کتابیں، تنقید اور تاریخ ادب، تفسیر و حدیث، زراعت، مرغ بانی اور مویشیات پر کتابیں، مغربی پاکستان میں خواتین کیا پڑھتی ہیں، وغیرہ، اُردو کی ان کتابوں کو انگریزی میں بھی چھاپا گیا ہے۔ ان کے علاوہ انگریزی میں پاکستانی مطبوعات کے انگریزی میں سال بہ سال کے تعارف بھی چھپے ہوئے دیکھنے کو ملے جن کا ہمارے یہاں کوئی رواج نہیں ہے۔ یہ کام ہماری اُردو اکادمیاں بڑی آسانی سے کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کی میری کتنی تجاویز کو اُتر پردیش کی اُردو اکادمی کی مجلس عاملہ ہمیشہ سرد خانے میں ڈال دیتی رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے اُردو ادب اور مصنفین کا تعارف بین الاقوامی سطح تو ایک طرف قومی سطح پر ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔

دوپہر کا کھانا بھی قاسم محمود کے گھر پر کھایا جس میں اس کے آفس کا عملہ بھی شریک ہوا۔ اس کے بعد قاسم محمود اور میں قلعہ گوجر سنگھ کی طرف نکل گئے۔ پاکستان کی سڑکوں پر بیشتر کاریں باہر کی نظر آتی ہیں۔ جاپان کی ٹویوٹا تو بہت عام ہے۔ موٹر سائیکلوں اور اسکوٹروں میں سوزوکی، یاماہا، کاواساکی، اور ہونڈا بھی عام ہیں جو جاپان کے اشتراک سے یہیں تیار ہوتی ہیں۔ پاکستان کی اپنی گاڑیوں میں عوامی آٹوز۔ سوزوکی کارہ سوزوکی وین سوزوکی پک اپ، ملت ٹریکٹر، نشان جیپ، نیا دور جیپ، ویسپا اسکوٹر

www.taemeernews.com

اور رکشا دکھائی دیتی ہیں ــــ

جب ہم منٹگمری پارک اور قلعہ گوجر سنگھ کی گلیوں میں گھوم رہے تھے تو قاسم محمود نے اچانک پوچھا۔ "آپ نے اِن گلیوں میں کچھ عشق بھی ضرور کیئے ہوں گے، یا کچھ ایسی یادیں بھی ہوں گی جو خاص خاص چہروں یا واقعات کی وجہ سے ان گلیوں کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہوں ــــ!"

پاکستان پہنچ کر قاسم محمود کی شکل میں ہی مجھے پہلا افسانہ نگار ملا تھا جو میرے ماضی کی جذباتی یادیں کریدنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے بتانے میں ذرا سی بھی جھجک محسوس نہ کی کہ وہ میری عمر کا فطری تقاضا تھا کہ میں کچھ حسین چہروں سے متاثر ہوتا۔ جس لڑکی کے ساتھ میں نے احمقانہ سا عشق کیا تھا اس کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اُسے بتایا۔ "یہاں میں آتے ہوئے بھی گھبراتا تھا۔ اس کی شادی پہلے ہو گئی تھی۔ میری شادی بعد میں ہوئی تھی۔ لیکن ہم دونوں بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے سے گزر کر چلے جاتے تھے ــــ"

"کبھی شکایت سننے یا کرنے کا موقع نہیں ملا ــــ؟"

"نہیں۔ میں بہت خاموشی پسند واقع ہوا تھا۔ وہ بھی بے حد شرمیلی تھی ــــ"

"قلعہ گوجر سنگھ تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی کیسی مسلمان لڑکی سے عشق کیوں نہ ہوا ــــ؟"

میری کھوئی ہوئی یادوں میں سے اچانک ایک اور چہرے نے جھانکا جو بلقیس کا تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھ سے رسالے مانگنے کے لئے آجاتی تھی اور کبھی کبھی گھنٹوں باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی ماں نے ایک بار مجھے سخت تنبیہ کی تھی اور میں نے اُس سے بے رخی اختیار کر لی، تو اُس نے شکایتی لہجے میں کہا تھا "کیا بات ہے۔ کیا اس لئے کہ میں مسلمان ہوں؟" میں نے اقرار کر لیا۔ اور کہا۔ "ہمارے معاشرے کچھ ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔" اس کے کچھ عرصے بعد

www.taemeernews.com

میں نے اُسے ایک عیسائی لڑکے کے ساتھ لاہور چھاؤنی میں گھومتے ہوئے دیکھا جس کے ساتھ اُس نے مجھے متعارف بھی کرایا تھا، لیکن اُس وقت اس کی آنکھوں میں بے پناہ طنز بھی موجود تھا۔ جسے میں آج تک نہیں بھلا سکا"!

ہم گھومتے گھومتے میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل کے ریستوراں میں جا بیٹھے۔ وہاں قاسم محمود نے اپنے بچپن کے کئی واقعات سنائے۔ وہ نو سال کا تھا جب پاکستان بنا۔ مشرقی پنجاب کے فسادات میں وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا اور خوف کے مارے دن میں کھیتوں میں چھپ جاتا اور رات کو کسی ایک سمت میں چل پڑتا۔ اس طرح وہ ایک ہفتہ بعد اچانک دہلی پہنچ گیا جہاں اُسے پرانے قلعے میں مہاجرین کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا، اس کے ذہن پر فسادات کی دہشت ابھی تک موجود ہے۔ اس نے سخت محنت کرکے خود ہی اپنی زندگی بنائی ہے اور اب وہ ایک شان دار مکتبے کا مالک ہے ___

پانچ بجے شام کو قتیل شفائی نے اپنے گھر غالب کالونی میں مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں میرے ساتھ آغا سہیل بھی گئے۔ قتیل شفائی سے ۱۹۵۲ء میں چاندنی چوک دہلی میں اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس ایک ملاقات کے نقوش ہم دونوں کے پاس محفوظ تھے۔ وہ بڑی محبت سے ملے۔ اپنی بیگم، بچوں اور اپنے داماد سے بھی ملوایا۔ اس کے گھر پر اس وقت اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ کیونکہ اس کا بڑا بیٹا اچانک کہیں چل دیا تھا۔ شاید کراچی یا بمبئی کی طرف۔ (بعد میں کچھ روز کے بعد وہ کراچی سے ہی لوٹ آیا تھا) اس محفل میں ڈاکٹر سلیم اختر، طاہر تونسوی، اختر علی خاں، منشور حسین یاد بھی موجود تھے۔ قتیل صاحب نے اپنے نغموں کا ایک ایل پی ریکارڈ بھی عنایت کیا۔ وہ بنیادی طور پر گیت اور غزل کے شاعر ہیں۔ متعدد مجموعوں ہریالی، گجر، رودزن، جھومر، جل ترنگ، مطربہ، گفتگو، چھتنار وغیرہ کے مصنف ہیں۔ کسی زمانے میں پشاور سے رسالہ "سنگ میل" بھی نکالتے تھے ___

www.taemeernews.com

چھوٹی سی دُلھن تو ہے بڑے باپ کی بیٹی
اللہ کرے تیرے بھی اوصاف بڑے ہوں
سُسرال کے آنگن میں جو اترے تری ڈولی
تعظیم کو خود تیرے ہی اوصاف کھڑے ہوں
چمکیں ترے جھومر میں مقدر کے ستارے
سُکھ چین کے گجرے تری بانہوں میں پڑے ہوں
گر مانگ بھری ہو تری خوشیوں کے شفق سے
کردار کے ہیرے ترے آنچل میں جڑے ہوں

قتیل شفائی نے فلموں کے لئے بھی ہزاروں گیت لکھے ہیں۔ اُس نے چاہا کہ میں اُس کے ساتھ فلمی لوگوں کی محفل میں بھی شرکت کروں۔ جو اگلے روز ایک شادی کے سلسلے میں جمنے والی تھی۔ لیکن وقت کی کمی نے مجھے اجازت نہ دی۔ وہاں سے رخصت لے کر ہم نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کے گھر نیو مسلم ٹاؤن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں تک مجھے اور آغا سہیل کو مشکور حسین یاد نے ہی اپنی گاڑی میں پہنچایا۔ طفیل صاحب کا یہ مکان باہر اور اندر سے نقوش کی ہی طرح خوب صورت اور پُرکشش ہے۔ وہاں رات کے کھانے پر پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے بیشتر اراکین جمع تھے۔ میرزا ادیب، احمد ظفر، ناصر زیدی، ارشد میر، موجد آرٹسٹ، خالد شفیق، صلاح الدین محمود اور ان کی بیگم۔ ارشد میر پنجابی کے شاعر ہیں اور گوجرانوالہ میں ایڈووکیٹ ہیں۔ موجد کے ڈیزائن اُردو کے ہر قابل ذکر رسالے کے سرورق کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ اُن کا اپنا ایک آرٹ اسٹوڈیو بھی ہے۔ انھیں پہلی مرتبہ دیکھا اور جی خوش ہوگیا۔ ناصر زیدی ادب لطیف کے آخری دور کے ایڈیٹر ہیں۔ احمد ظفر ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے وابستہ ہیں اور ڈراما نگار و شاعر کے طور پر مشہور ہیں جن کے نام سے میں عرصے سے واقف تھا۔ وہ بھی مجھے جانتے

www.taemeernews.com

تھے۔ محمد طفیل اپنی گمبھیر اور شفیق شخصیت سے ذہن پر بے شمار نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ یوں بھی انھیں محمد نقوش کہا جاتا ہے اور ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے مجھے ندیم نامہ عنایت کیا جو احمد ندیم قاسمی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک ضخیم اعتراف نامہ ہے۔ اس میں فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، آلِ احمد سرور، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، سید عابد علی عابد، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ کے تینتیس مضامین کے علاوہ ندیم کی شاعری اور افسانوں کا ایک نمائندہ انتخاب بھی موجود ہے۔ اس محفل میں ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادیبوں فراق، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہاں سے ہم رات کو گیارہ بجے کے قریب طفیل صاحب کی گاڑی میں واپس ہوئے۔ ہمارے ساتھ صلاح الدین محمود بھی مع اپنی بیگم کے تھے، انھیں اُن کے گھر پر اتارنا تھا۔ راستے میں صلاح الدین محمود کی ایک پرانی اور مشہور نظم "اندھے آئینے کا گیت" پر بھی گفتگو چلتی رہی ؎

لو سنو ہواؤں کے بھیتر
کوئی کہتا سورج راکھ نا
میں تاروں اور نہ دیکھ سکوں
میں نابینا، میں نابینا

۲۲ فروری کی صبح گلزار دفا چودھری کی ملاقات سے شروع ہوئی۔ اُس روز جمعہ کی چھٹی تھی۔ آغا سہیل کے بیٹوں کے ساتھ دھوپ سے دُھلے ہوئے لان میں تھوڑی دیر کرکٹ بھی کھیلا اور ہر بار بنا کوئی رن بنائے آؤٹ ہوگیا۔ آغا سہیل نے صرف دو رن بنائے۔ اُن کے بیٹوں نے بیس بیس رن بنائے اور چار چوکے بھی مارے۔

ساڑھے گیارہ بجے آغا سہیل اور میں عبداللہ ملک کے گھر گئے۔ وہاں انھوں نے احتساب کے دو شمارے عنایت کئے اور ہم نے عالمی سیاست اور عالمی ادب کے بارے میں کئی گھنٹے گفتگو کی۔ لنچ بھی وہیں

www.taemeernews.com

کیا۔ عبداللہ ملک فیض اور سجاد ظہیر کے ساتھیوں میں سے ہیں اور کئی بار روس اور مشرقی یورپین ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ شام کو آغا سہیل کے بیٹے محسن سہیل نے مجھے اپنے دوستوں سے ملانے کے لئے چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ خرم اقبال، ساجد رفیق، امین احسن، مجید اصغر، رفائیل منڈے، محمد اکبر، اسامہ عباسی، احمد نصر اللہ وغیرہ نے کئی سوالات پوچھے، جن میں سے بیشتر وہ پہلے بھی پوچھ چکے تھے۔ میں سمجھتا ہوں جب تک وہ خود ہندوستان میں آکر یونی ورسٹیوں کے لڑکوں سے مل نہیں لیں گے اور ہندوستان کی فضا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے ان کی تشفی نہیں ہوگی۔ دونوں ممالک کی حکومتیں چاہیں تو نئی نسل کے گروہوں کو آنے جانے کی سہولیات دے سکتی ہیں اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور مستقبل میں ایک خوش گوار تبدیلی لائی جا سکتی ہے ——

۔ رات کا کھانا فرخندہ لودھی کے یہاں تھا۔ آغا سہیل کو اُن کی بیگم نے آج پھر دھمکی دی کہ وہ اُن کا نام راشن کارڈ سے کل ضرور کٹوا دے گی کیوں کہ اس نے میری وجہ سے گھر پر کھانا چھوڑ دیا تھا۔ محسن کے دوستوں نے ہی ہمیں اپنی گاڑی میں ایمپریس روڈ پر ریلوے کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ جب وہ چلے گئے تو آغا سہیل نے مجھے بتایا کہ اسے فرخندہ کا گھر معلوم نہیں ہے وہ بہت قریب ہی کسی کالونی میں رہتی ہیں۔ صابر لودھی ہمیں اسی آفس کے برآمدے میں مل جائیں گے۔ لیکن برآمدے میں صابر لودھی کے حلیے سے ملتا جلتا شخص کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ دو بندوق بردار ریلوے کے چوکیدار اِدھر اُدھر بڑے اطمینان سے ٹہلتے پھرتے تھے یا کچھ مسافر تھے جو اندر جا کر واپس بھی چلے گئے تھے۔ دفتر کا وہ حصہ دراصل فرسٹ کلاس کا ریزرویشن آفس تھا جو بند ہونے والا تھا۔ اس لئے وہاں اس وقت بہت کم مسافر آجا رہے تھے۔ ہم نے اندر جا کر بھی دیکھا کہ شاید صابر لودھی کسی صوفے پر انتظار کرتے کرتے سو گئے ہوں۔ لیکن سارے صوفے خالی پڑے تھے۔ صرف کاؤنٹروں

www.taemeernews.com

پر کچھ لڑکیاں بھڑک دار لباسوں میں رجسٹروں کو اُلٹ پلٹ رہی تھیں، اور ٹکٹوں سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں کو بار بار چیک کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی بہت دیر سے فون پر کسی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ــــ

باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ بجلی کے کھمبے ہلکی ہلکی روشنی پھینک رہے تھے۔ اُس نیم اندھیرے میں جو بھی شخص اُبھرتا اُس پر ہمیں صابر لودھی ہونے کا گمان ہوتا تھا لیکن اس کے قریب آتے آتے ساری امید ختم ہو جاتی۔ جب ہم اِدھر اُدھر بہت ٹہل چکے اور کاؤنٹروں والے ہال میں بھی کئی بار آ چکے تو میں نے آغا سہیل سے کہا۔ اب تو یہ بندوق بردار چوکیدار بھی ہمیں شبہے کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم پاکستان کے بالکل نئے افسانے پر گفتگو کر کے وقت کاٹیں ــــ؟

شاید آغا سہیل کی حسِ مزاح مجھ سے بھی بہتر تھی۔ جواب دیا:

"اس موضوع پر ہماری گفتگو سن کر تو وہ لوگ اور بھی چوکنے ہو جائیں گے۔"

لیکن اب تو یہ آفس بھی بند ہونے والا ہے۔ سارا اسٹاف کاؤنٹر بند کر کے باہر آ گیا ہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں فرخندہ لودھی کے یہاں جا کر کھانا کھانے کے جرم میں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ جس کی کوئی امید بھی نظر نہیں آتی ــــ"

"آپ یہاں ٹھہریے میں اُس گیٹ تک دیکھ کر آتا ہوں ــــ" اُس نے علامہ اقبال روڈ سے ملانے والے گیٹ کی طرف قدم بڑھائے تو میں نے گھبرا کر کہا "میں یہاں اکیلا نہیں کھڑا ہوں گا۔ پردیسی آدمی ہوں کوئی پوچھ بیٹھا تو تسلی بخش جواب بھی نہیں دے پاؤں گا۔ آپ کے ساتھ چلتا ہوں ــــ"

"اچھا تو یوں کرتے ہیں آپ اُس گیٹ تک جائیے، اور میں اس گیٹ تک۔ پھر لوٹ کر اسی سڑک پر مل جائیں گے ــــ"

اتفاق سے جس راستے پر میں گیا وہاں نہ صرف صابر لودھی بلکہ طاہر تونسوی، سلیم اختر، غلام الثقلین نقوی اور صدیق جاوید بھی انتظار کرتے مل گئے۔ انھوں نے کہا۔ "ہم نے تو اسی گیٹ پر آغا سہیل سے ملنے کو کہا تھا، اور ہمارا

www.taemeernews.com

گھر یہاں سے بہت قریب ہے۔ میں نے اُن کے پاس موٹر دیکھ کر پوچھا۔
"اگر گھر قریب ہے تو موٹر لے کر آنے کی کیا ضرورت تھی"۔
ہنستے ہوئے جواب دیا گیا۔ "وہاں گلی کے بچے بہت شرارتی ہیں۔ ڈر تھا ہماری غیر حاضری میں کہیں وہ موٹر کو نقصان نہ پہنچائیں ــــ"
"اور اب وہاں لے جائیں گے تو نقصان نہیں پہنچائیں گے ــــ؟"
"نہیں۔ اب تک تو وہ سو گئے ہوں گے ــ"
اتنی دیر میں آغا سہیل کو بھی دوسرے گیٹ سے لایا گیا۔ اور ہم سب ہنستے ہوئے فرخندہ لودھی کے چھوٹے سے خوب صورت گھر میں جا پہنچے۔ وہ ہماری بے چینی سے منتظر تھی۔ اس نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ اور مجھ سے میری بیوی اور بچوں کے بارے میں بھی پوچھتی رہی۔ میرے مکان کے بارے میں بھی جس کی ملکیت کے احساس سے میں ابھی تک محروم ہوں۔ اُس کے اندر بھی ہندوستان دیکھنے کی شدید خواہش موجود تھی۔ لکھنؤ کو بھی جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ بیشتر لوگوں کی لکھنؤ کے بارے میں معلومات کتابی ہیں یعنی وہ سمجھتے ہیں یہاں کے لوگ ابھی تک انگرکھے اور چوگوشیہ اور دوپلی ٹوپیاں پہنتے ہیں اور بٹیریں لڑانے کے شوقین ہیں۔ میں نے انھیں بتایا اگر کوئی آدمی تینتیس چونتیس سال تک تبدیل نہ ہو سکے تو اُسے ذہنی طور مُردہ ہی تو کہا جائے گا۔ یہی کردار شہروں کا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی اگر تبدیل نہیں ہوں گے تو رفتہ رفتہ فوسلائزڈ ہو جائیں گے۔ لکھنؤ اب صحیح معنوں میں ایک جدید شہر ہے۔ پُرانے محل اور عمارتیں کھنڈر ہو چکے ہیں۔ بہت سے امام باڑے بھی پہلے کی سی آب و تاب نہیں رکھتے۔ نئی نئی عمارتیں اور ملٹی اسٹوریز اُبھر رہی ہیں۔ پُرانے لکھنؤ کے روایتی لباس اور شوق ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ زبان میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ نوابی مزاج اگرچہ قائم ہے:
فرخندہ نے وعدہ کیا کہ وہ میری ذاتی دعوت پر فوراً لکھنؤ پہنچے گی۔
اس نے مجھے پارکر کا ایک بہت ہی خوب صورت پن تحفے کے طور پر دیا۔

www.taemeernews.com

ایک قلم کار کا دوسرے قلم کار کے لئے اس سے بہتر تحفہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ یہ میری بھی عادت بن چکی ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کو میں قلمیں یا کتابیں ہی تحفے میں دیا کرتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید کوئی ادیب یا شاعر بن جائے ــــ اگلے روز یعنی ۲۳ فروری کی صبح راولپنڈی سے مہتاب ظفر نے فون پر اطلاع دی کہ کراچی کے لئے میرا ویزا منظور ہو گیا ہے۔ پاکستان میں مہتاب ظفر کی شخصیت بھی میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی جن سے فون پر باتیں ہوتی تھیں، ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ ان ہی کی بدولت میں کراچی جا کر بے شمار دوستوں سے مل سکا۔ اس کے بعد پاسپورٹ آفس کے ڈپٹی ڈائریکٹر کا بھی فون آگیا کہ انھیں اسلام آباد سے میرا ویزا منظور ہو جانے کی اطلاع مل گئی ہے۔ میں ان کے آفس میں جا کر ویزا لے لوں۔ یہ اطلاع بھی میرے لئے بہت ہی خوش کن تھی۔ آغا سہیل کے لئے بھی۔ جس نے میرے لئے ہوائی جہاز میں ۲۶ کی رات میں ایک سیٹ رکوا رکھی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو ایرپورٹ پر بھیج کر ریزرویشن کا ٹکٹ منگوا دیا ــــ

اب ساری صورت حالات بدل گئی۔ میں نے جن لوگوں کو ۲۶ کو ہندوستان لوٹنے کی اطلاع دے رکھی تھی انھیں پھر سے مطلع کرنا پڑا۔ بارہ بجے سنگ میل پبلشرز کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا وہیں اچانک جمیل الدین کے پاس شاہد الوری کا کراچی سے فون آیا تو میں نے بھی اُن سے بات کر کے یہ درخواست کی کہ وہ کراچی میں میرے دوستوں محمد علی صدیقی، صہبا لکھنوی اور جون ایلیا کو میرے پروگرام کے بارے میں اطلاع دے دیں۔ انھیں سب کے فون نمبر بھی دے دیئے۔ شاہد الوری سے میرا پہلے سے کوئی تعارف نہیں تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ میرے نام سے بہ خوبی واقف تھے اور وہ کراچی میں میری آمد کے بارے میں اخبارات میں خبریں پڑھتے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے نقوش کے آفس میں بھی گیا اور محمد طفیل سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ اُن سے عائشہ صدیقی کے لئے نقوش کا سالنامہ بھی لیا جو ابھی تک

www.taemeernews.com

انھیں نہیں بھجوایا جا سکا تھا۔ سالنامے میں عائشہ کی ایک کہانی شایع ہوئی تھی۔ چار بجے شام کو ابصار عبدالعلی کے ساتھ ماہنامہ 'ملک' کے آفس میں گیا۔ یہ ہاسپٹل روڈ کے اسی آفس سے نکلتا ہے جہاں سے آزادی سے پہلے شیام سندر منوّر کا ہفتہ وار 'گورو گھنٹال' اور لالہ کرم چند کا 'پارس' نکلا کرتا تھا۔ 'ملک' کے چیف ایڈیٹر ارشاد نیاز اور جنرل منیجر رب نواز ملک نے 'ملک' کے کئی گزشتہ اور تازہ شمارے عنایت کئے۔ یہ رسالہ ہفتہ وار رسالوں کے سائز پر آفسٹ پر کئی رنگین تصاویر کے ساتھ شایع ہوتا ہے جس میں عام دلچسپی مثلاً کرکٹ، فلم، فیشن، انٹرویوز وغیرہ، ایسے موضوعات شامل ہیں۔ وہاں سے 'امروز' کے دفتر میں لکھنؤ کے ہارون سعد سے ملنے کے لئے گئے جو امروز کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ امروز کا دفتر بہت بڑا ہے اور جرنلسٹوں کے لئے الگ الگ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہارون صاحب کبھی 'قومی آواز' میں بھی کام کر چکے ہیں۔ عشرت علی صدیقی صاحب نے اُن کے لئے ایک خط بھجوایا تھا۔ وہ بڑی محبت سے ملے اور ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب میں نے پاکستان میں اپنی ملوں کی کمی اور غیر ملکی مصنوعات کی درآمدات کی کثرت کا ذکر کیا تو مجھے اُن کا جواب سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے کہا اگر ہمیں باہر سے سستی چیزیں مل جاتی ہیں تو انھیں منگانے میں کیا حرج ہے۔ میرا خیال ہے پاکستان نے اپنے کارخانے لگانے کی طرف توجہ دی ہوتی تو وہاں مزدوروں کو اگرچہ ہندوستان کی طرح کم ہی اجرتیں ملتیں۔ لیکن ٹریڈ یونین ازم کو جو فروغ حاصل ہوا ہوتا اس سے وہاں جمہوریت کے قیام کو بھی خاصی تقویت حاصل ہو گئی ہوتی۔ موجودہ صورت حال میں پاکستان کے بیشتر مزدور اور کاریگر عرب ممالک میں جا کر کام کر رہے ہیں اور ان لوگوں

www.taemeernews.com

روپیہ غیر ملکی زرمبادلہ کے طور پر اپنے ملک کو بھیج رہے ہیں اس لئے وہاں کی معیشت پر خاصا خوشگوار اثر نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال کب تک قائم رہ سکتی ہے، یہ تو وقت ہی بتا سکے گا ـــــ

ڈھر

www.taemeernews.com

ایک یادگار پنجابی مشاعرہ

(۱۱)

۲۲ر فروری کی شام کو تھوڑی دیر کے لئے ابصار عبدالعلی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں پہلی مرتبہ گیا تو مجھے ایک صدمہ سا محسوس ہوا۔ ایک عرصے سے پاک ٹی ہاؤس کی شہرت سُن رہا تھا کہ وہاں لاہور کے ادیبوں اور جرنلسٹوں کا ہر وقت جمگھٹ رہتا ہے اور اُردو ادب کی اب ساری تحریکیں وہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اور 'مشرق' 'نوائے وقت' 'امروز' وغیرہ روزناموں کے کالموں کے لئے ساری فقرے بازی کا مواد وہیں سے حاصل

www.taemeernews.com

کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے جذباتی صدمے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے پاک ٹی ہاؤس کے بارے میں ایک بہت بڑے کشادہ ہال والے ریسٹوراں کا امیج بنا رکھا تھا جس طرح کا کافی ہاؤس ہمارے لکھنؤ میں ، یا دہلی میں ہے۔ پاک ٹی ہاؤس ایک چھوٹے سے ہال میں سکڑا سمٹا ہوا سا نظر آیا جہاں دس بارہ ادیب اور جرنلسٹ مختلف میزوں پر سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے اپنے مسائل حل کر رہے تھے، یا انھیں اُلجھا رہے تھے۔ ایک گروپ میں شہرت بخاری اور مسعود اشعر کے ساتھ ہیلو ہیلو ہوئی اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں اچانک ایک ادھیڑ عمر کا شخص ایک میز سے اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا اور اپنا نام مبارک احمد بتا کر بولا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا تھا، آپ سے بہت سی باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو مسئلہ کشمیر پر، دوسرے ہندوستان و پاکستان کے موجودہ اُردو ادب پر۔ کیوں کہ میں حلقۂ اربابِ ذوق کے امورِ تنظیم نو کا جنرل سکریٹری ہوں اور اب تک اوکاڑہ، جہلم، ملتان، خانیوال، شیخوپورہ، گجرات، گوجرخان، رحیم یار خان وغیرہ میں نئی شاخیں قائم کر چکا ہوں۔ لیکن پہلے یہ بتائیے آپ موسیقی سننے میں بھی کچھ دلچسپی رکھتے ہیں؟ —"

میں نے اُس کی طرف حیران ہو کر دیکھا اور اتنے سارے سوالات کے جواب میں صرف یہ پوچھا:۔

"آپ کی دلچسپیوں کی پوری تعداد کتنی ہے؟ —"

بولا — "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اگر آپ کو موسیقی سننے میں دلچسپی ہے تو ابھی میرے ساتھ چلئے —"

میں نے عرض کیا۔ "بدقسمتی سے میں اس شوق سے محروم ہی رہ گیا ہوں کیوں کہ جب جوان ہوا تو کوٹھوں کی بساط اُجڑ چکی تھی اور حکومتِ ہند نے اُن پر مکمل پابندی لگا دی تھی۔ لیکن پاکستان میں تو مارشل لا نافذ ہے اور پھر اسلامی قوانین بھی ہیں۔"

www.taemeernews.com

بولا ــــ" میں آپ کو مرد موسیقاروں کی محفل میں لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ خیر اس موضوع کو چھوڑ یئے۔ میرا ایک کام کریں گے؟ میرے پاس ہیما مالنی کے نام ایک نظم ہے جو میں اُس تک کسی معتبر بندے کے ہاتھ پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ بمبئی جا کر یہ نظم اُس کو دے دیں گے؟ ورنہ مجھے خود ہندوستان آنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے بیگ میں سے ایک طویل نظم نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ جس کا عنوان تھا 'گیتوں کا گیت' ــــ،

ہیما مالنی!
تم جو کوئی بھی ہو
میں پنجابی ہوں
اور تم سے مخاطب
چناب کنارے گجرات میرا شہر ہے
اور راوی کنارے لاہور بھی

میں نے پوری نظم پڑھے بغیر کہا ــــ" اس سے پہلے کوئی اور پاکستانی شاعر بھی ہیما مالنی سے ملنے کے لئے بمبئی گیا تھا جب وہ اُسے نہیں ملی تو اُس نے خودکشی کر لی تھی اور وہ وصیت کر گیا تھا کہ اُس کی آنکھیں نکال کر اور ایک پلیٹ میں سجا کر ہیما مالنی کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔ اُس کی وصیت کے مطابق جب اُس کی آنکھیں ہیما مالنی کے سامنے لے جائی گئیں تو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی اور ایک ہفتے تک ہوش میں نہ آسکی۔ کہیں آپ کو بھی وہاں جا کر خودکشی نہ کرنی پڑے ــــ"

اُس نے گھبرا کر جواب دیا ــــ" تو پھر آپ ہی میری نظم لے جائیے اور میری یہ تصویر بھی۔ کہیئے گا آپ کے ایک پاکستانی پرستار نے یہ بھیجی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کسی اور مسئلے پر گفتگو چھیڑتا میں اُٹھ کر باہر آگیا۔ مجھے اتنی جلدی وہاں سے نکلتا دیکھ کر شہرت بخاری اور مسعود اشعر نے

www.taemeernews.com

پوچھا ــــ "بیٹھیے۔ آپ کے ساتھ باتیں کریں گے ــ"

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "باتوں کا نمونہ دیکھ لیا ہے اب چلتا ہوں ــــ"

ساڑھے سات بجے گلزار وفا چوہدری نے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اور انھوں نے میرے لیا پر کچھ پنجابی شاعروں کو بھی سنوانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آغا سہیل کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا تو اس وقت تک جتنے لوگ آچکے تھے ٹی وی پر امجد اسلام امجد کے ڈرامے 'وارث' کی تازہ قسط دیکھنے میں مصروف تھے۔ یہ پروگرام ختم ہوتے ہوتے نو بج گئے' تو طے پایا کہ مشاعرہ شروع کرنے سے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔ کھانے پر احمد ندیم قاسمی' صلاح الدین محمود، منیر نیازی، اشفاق نقوی، امجد اسلام امجد، شہزاد احمد' عارف عبدالمتین، انصار عبدالعلی، آغا سہیل، ستار سید، محمد اجمل نیازی' ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی، قائم نقوی، قیوم زاہد، یونس فاخر حنیف' پادری ڈیوڈ، بیدار سرمدی، چوہدری شریف، تحسین فراقی، نیاز حسین لکھویرا، انعام الحق جاوید، احمد حسن حامد، علی اکبر عباس، سلطان عارف وغیرہ مدعو تھے۔ ان میں سے بیشتر اُردو کے ہی شاعر اور دانش ور تھے۔ لیکن وہ سب کے سب پنجابی کے بھی شاعر اور ادیب تھے۔ قاسمی صاحب نے ابھی تک پنجابی زبان میں شاعری نہیں کی تھی۔ گفتگو وہ ضرور پنجابی میں کر رہے تھے۔ پنجاب نے پنجابی ادب کو اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے مقابل لے آنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام اصنافِ ادب، خصوصاً شاعری نے ایک عالمی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن پنجاب اُردو کے بارے میں ہمیشہ احساس کمتری کا بھی شکار رہا ہے۔ منیر احمد شیخ نے اپنے ایک پنجابی مضمون 'میرا مسئلہ' میں اس بات کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے ــــ "ہمارے ذہنوں میں یہ بات گھسی ہوئی ہے کہ پنجابی میں کوئی بڑی اور سنجیدہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ سنجیدہ ہونے

www.taemeernews.com

کے لئے پنجابیوں کو دوسری زبانوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ تو اس طرح ہوا کہ گھر کے اندر تو ہم سب ایک دوسرے کو مسخرے سمجھتے رہیں اور باہر سڑک پر آتے ہی فلاسفر اور عالم بن جائیں۔ انھوں نے پنجابی اور دوسری زبانوں کے حوالے سے انسان کی ذات کے دو حصّے ہو جانے کے بارے میں لکھا ہے ــــ" ہمارا ظاہر اور باطن دو الگ الگ صورتیں بن کر رہ گیا ہے اور ان کا ایک دوسرے کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ذات کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا بھی ممکن ہوتا ہے جب آدمی کا اپنی زمین اور اپنی زبان پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ کوشش شروع ہو جاتی ہے کہ معاشرے میں عزّت و احترام حاصل کرنے کے لئے اپنی ذات کے اُوپر دوسرے خول چڑھا لئے جائیں۔ اس دوغلے پن میں اصل آدمی کہیں بیچ میں ہی مار دیا جاتا ہے۔ اس کی اپنی ذات کی کوئی خوشبو باقی نہیں رہتی۔"

ہمارے ملک میں بعض علاقائی زبانیں جن کے ادیبوں نے صرف ایک ہی زبان کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اس قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہ صرف دونوں ممالک کے پنجاب میں ہو رہا ہے کہ وہاں کے پنجابی ادیب اُردو یا ہندی میں بھی تخلیقات پیش کرنے کے شوق میں اپنی مادری زبان کو کمتر سمجھنے کے احساس میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن یہ صرف احساس ہی احساس ہے۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ اعلیٰ درجے کی ہی رہتی ہے۔ میرے لئے گلزار دفا چوہدری نے جن شعرا کو اپنے یہاں جمع کر لیا تھا ان کے پنجابی کلام کے چیدہ چیدہ اشعار کو مع ترجمہ پیش کر رہا ہوں جس سے اندازہ ہو گا کہ عصری فکر کے اعتبار سے پنجابی شاعری کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمائی تھی اور انھوں نے پہلی بار اس محفل میں اپنا پنجابی کلام بھی سنایا جس کی وجہ سے وہ محفل ایک لحاظ سے تاریخی اہمیت کی حامل ہو گئی ــــ

www.taemeernews.com

ستار سید

چہرہ چہرہ اُنوں دیکھاں منظر منظر اُنوں تکاں
پر ہالے دی مکیا ناہیں پینڈا اکھ نمانڑی دا
(چہرے چہرے میں اُسے دیکھوں، منظر منظر میں اُسے تاکوں لیکن ابھی تک بچاری آنکھ کا فاصلہ ختم نہیں ہوا ہے)

چیت دی مٹھڑی وا دے وانگوں اُس دے شہروں لنگھدے رہیے
نا کوئی اپنا پیر ا چھڈیا نا کوئی حرف نشانڑی دا
(چیت کی میٹھی ہوا کی طرح اس کے شہر سے گذرتے رہے، نہ اپنے پیر کا کوئی نشان، نہ ہی یادگار کے طور پر کوئی حرف ہی پیچھے چھوڑ آئے)

نزاکت

خورے کیڑیاں جُواں دے وِچ رُت بدل دی رہندی اے
ساڈے نال تاں ٹریا آوے اکو موسم سالاں توں
(پتہ نہیں کون سے زمانے میں رُت بدلا کرتی ہے۔ ہمارے ساتھ تو برسوں سے ایک ہی موسم چلا آرہا ہے)

محمد اجمل نیازی

پچھلے پہر لہو وِچ رلیا نور شہادت والا
مرن توں پہلے مرن دی رُت وِچ اساں منائیاں راتاں
(پچھلے پہر میں شہادت کا نور بھی شامل ہو گیا، ہم نے مرنے سے پہلے ہی مرنے کی رُت کا سوگ منالیا)

بیدار سرمدی

میں دی اُتراں پار ہک دن نال گزار
صدیاں دا اے پندھ دو انکھیاں وِچکار
(ایک دن میرے ساتھ گزار تو میں بھی پار اُتر جاؤں۔ ہماری

www.taemeernews.com

آنکھوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے)

قائم نقوی

اُس دے جان مگروں (نظم)

نہ خواباں وچ ٹرنا ہویا
نہ کوئی واج نہ چیک
نہ کوئی حرف کاغذ تے لکھیا
نہ کوئی ماری لیک
بُھلدا جاواں کیڑا دن ہے
کی ہے اج تریک
صبر پیالہ رکھ لیاں تے
لائی اِکو ڈیک

(اُس کے جانے کے بعد ـــ نہ خوابوں میں چلا، نہ کوئی آواز نہ چیخ، نہ کوئی حرف کاغذ پہ لکھا، نہ کوئی لکیر کھینچی، بھولتا جا رہا ہوں، کون سا دن، آج کون سی تاریخ ہے، ہونٹوں پہ صبر کا پیالہ رکھ کر ایک ہی سانس میں پی گیا)

گلزار وفا چوہدری

جتھے اکھراکھاں کھولن ڈریاں ڈریاں
کاغذ میتھوں گلاں منگن کھریاں کھریاں

(جہاں الفاظ سہمی سہمی آنکھیں کھولتے ہیں، وہاں کاغذ مجھ سے کھری کھری باتیں سننا چاہتے ہیں)

اکھاں پتھر پتھر، سینے خالی خالی،
ساڈے کم نہ آئیاں بانہواں بھریاں بھریاں

(آنکھیں پتھرائی ہوئی سی ہیں اور سینے خالی خالی ہیں۔ بھری

www.taemeernews.com

بھری بانہیں بھی ہمارے کام نہ آ سکیں)

دھرتی دھرتی سچ دا چانن بجھ نہ جاوے ،
سوں نہ جاون جیبھاں منہ وچ دھریاں دھریاں
(اس دھرتی پر سچائی کی روشنی بجھ نہ جائے، منہ میں زبانیں ہوتے ہوئے بھی سو نہ جائیں)

تحسین فراقی

ڈیلے ہتھ نیاں دی ڈور پھڑاون والے
تیرے نال دی ڈیلے نے ہتھ کر جاناں اے
(وقت کے ہاتھ میں انصاف کی باگ ڈور پکڑوانے والے
وقت تیرے ساتھ بھی تو دھوکا کر سکتا ہے)

اشفاق نقوی

جو تارے رمزاں کردے نے جو واواں کن وچ کندیاں نے
نادان نے سن کے کی لینا میں ہشیار نوں دسو کی دسیے؟
(تارے جو اشارے کر رہے ہیں، ہوائیں جو کان میں کچھ کہہ رہی ہیں اسے نادان سن کر کیا کرے گا۔ اب بتائیے ہوش مند کو ہم کیا بتائیں ؟)

شہزاد احمد شہزاد

جیوندا جاگدا ہوئے اے شہر مرا، سوہنے چہریاں دا ایتھے کال دی نئیں
عشق عام جہی کڑی دے نال ہویا، تکھے نقش وی نئیں لمے وال دی نئیں
(یہ میرا شہر جیتا جاگتا رہے یہاں خوب صورت چہروں کا کال بھی نہیں ہے۔ مجھے ایک عام سی لڑکی کے ساتھ عشق ہو گیا ہے جس کے نہ تو تیکھے نقوش ہیں نہ ہی لمبے بال ہیں)

پہلاں اگ سی اکھاں نوں ساڑدی سی، ہوئی ہولی اد برف دا ڈھیر ہوئی
برف ہویاں دی اُس نوں دیر ہوئی ہُن تے بلاں تے کوئی سوال دی نئیں

www.taemeernews.com

(پہلے ہی آگ ہوتی تھی جو تنکوں کو جلا دیتی تھی، رفتہ رفتہ وہ برف کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ اُسے برف بنے بھی دیر ہو گئی ہے اب تو ہونٹوں پر کوئی سوال بھی نہیں ہے)

ادھری روح نوں پتہ نہیں کی ہویا ہتھ رہ گیا ہے میرے ہتھ دے وچ
اوتاں راہواں دے وچ گواچ گئی ہے، اپنے کول دی نئیں تیرناں دی نئیں

(اُس کے جوش و خروش کو پتہ نہیں کیا ہوا، ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ وہ تو راستوں میں کہیں کھو گئی ہے نہ تو اپنے پاس ہے نہ ہی میرے ساتھ ہے)

عطاء الحق قاسمی

میریا ربا ایناں نوں گلزار بنا
میرے چار چوفیرے بھانبڑ بلدے نے

(میرے خدایا، انھیں گلزار بنا دے، میرے چاروں طرف آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہیں)

عارف عبدالمتین

اپڑیں ہتھی کشتی توڑی جپو سٹے مرضی نال
ہن جد ڈبن ویلا آیا دس خاں میں پچھتاواں کیوں

(اپنے ہاتھوں سے کشتی توڑ دی تھی اپنی ہی مرضی سے چپو پھینک دیئے تھے۔ اب کیوں پچھتاؤں جب ڈوبنے کا وقت آگیا ہے)

میں عاشق سورج چن دا، کرناں دا، رُشنائی دا
پھردا اے میرے اگے پچھے میرا ای پرچھاواں کیوں

(میں جب سورج، چاند، کرنوں اور روشنی کا عاشق ہوں تو میرا ہی سایہ میرے آگے پیچھے کیوں پھرتا رہتا ہے)

منیر نیازی

حرف حجاب دے پردے اندر

www.taemeernews.com

حرف اِک دو جے حرف دا پردہ
میتھوں قیاس نہ ہو یا
ساری حیاتی حرف لکھے
پر حرف شناس نہ ہو یا

(حرف حجاب کے پردے میں ہوتا ہے۔ ہر ایک حرف دوسرے حرف کا ایک پردہ ہوتا ہے۔ یہ میں کبھی نہ سمجھ پایا۔ زندگی بھر حرف لکھتا رہا لیکن حرف شناس نہ بن سکا)

اج دا دن وی ایوں لنگھیا
کوئی دی کم نہ ہو یا
پورب دلوں چڑھیا سورج، پچھم آن کھلو یا
نہ میں ملیا میں خلقت نوں نہ یاد خدا نوں کیتا
نہ میں پڑھی نماز تے نہ میں جام شراب دا پیتا
خوشی نہ غم کوئی کول نہ آیا
نہ ہنسیا نہ رو یا
اج دا دن وی ایویں لنگھیا

(آج کا دن بھی یوں ہی بیت گیا، کوئی بھی کام نہ ہو پایا۔ سورج پورب سے نکل کر پچھم میں آ پہنچا۔ نہ میں خلقت سے ملا نہ ہی خدا کو یاد کیا۔ نہ میں نے نماز پڑھی نہ ہی شراب کا جام پیا۔ خوشی یا غم کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔ نہ میں ہنسا نہ ہی رو یا۔ آج کا دن بھی یوں ہی بیت گیا)

ہونی دے حیلے (نظم)
کس دا دوش سی کس دا نئیں سی
ایہہ گلاں ہُن کرن دیاں نئیں
ویلے لنگھ گئے توبہ والے

www.taemeernews.com

راتاں ہو کے بھرن دیاں نیئں
جو ہویا ایہہ ہونا ایں سی
تے ہونی رُکدیاں رکدی نیئں
اک واری جد دن شروع ہو جاوے
گل فِر ایویں مُکدی نیئں

(ہونی کے چیلے۔ کس کا دوش تھا کس کا نہیں تھا اب یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ توبہ کرنے والا وقت گذر گیا ہے یہ راتیں آہیں بھرنے والی نہیں ہیں۔ جو ہوا ہے وہ تو ہونا ہی تھا۔ ہونی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو پھر بات اپنے آپ ختم نہیں ہوتی)

کجھ اُنج دی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک دی ظالم سن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

(کچھ یوں بھی راستے دشوار تھے کچھ میرے گلے میں غم کا طوق پڑا ہوا تھا۔ کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے اور کچھ مجھے بھی مرنے کا شوق تھا)

احمد ندیم قاسمی

لمیاں راتاں (نظم)

کِنیاں لمیاں راتاں نیں
کِنیاں انہیاں راتاں نیں
کِنیاں ڈونگیاں چُپاں نیں
بدلاں نے اسماناں تے جیویں جھاڑو پھیرا اے
نہ چن اے نہ تارے نیں

www.taemeernews.com

جیویں بھوتاں دھرتی تے رج کے ڈاکے مارے نیں
لوہے وانگ ہنیرا اے
سرہا روتاں وجدا اے
بند نیں تالے ہونٹاں تے
اندروں دل پیا گجدا اے
ہتھ نوں ہتھ دی سُجدا نئیں
پر میرا دل کی شے اے
کسے خیالے رجدا نئیں
صدی صدی دیاں راتاں نیں
پر اے دیوا بُجھدا نئیں

لمبی راتیں ـــ کتنی لمبی راتیں ہیں، کتنی اندھی راتیں ہیں، کتنی گہری خاموشیاں ہیں جیسے بادلوں نے آسمانوں پر جھاڑو پھیر دیا ہے۔ نہ چاند ہے نہ تارے ہیں جیسے بھوتوں نے دھرتی پر جی بھر کے ڈاکے مارے ہیں۔ لوہے جیسا اندھیرا ہے سر ٹکراؤ تو بج اُٹھتا ہے۔ ہونٹوں کے تالے بند ہیں۔ دل اندر ہی اندر گرج رہا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ پر میرا دل کیا شے ہے کہ کسی بھی خیال سے نہیں بہلتا۔ رات صدیوں پر پھیل گئی ہے لیکن یہ دیا پھر بھی نہیں بجھتا۔)

دوہڑہ

www.taemeernews.com

میں تو ذہنی خندق سے نکل آیا ہوں

(۱۲)

۲۴ فروری کی شام کو انتظار حسین ملنے کے لئے آئے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا نیا ناول 'بستی' بھی لائے تھے جو اُن دنوں اُردو اور انگریزی کے روزناموں میں زیرِ بحث تھا۔ ایک کاپی میرے لئے اور دو کاپیاں دلّی کے دوستوں کے لئے۔ اُسی شام کو میں اور آغا سہیل چائے پر طاہر رضا بخاری کے یہاں مدعو تھے۔ چائے کے علاوہ اُنھوں نے مجھے ہندوستان کے پُرانے موسیقاروں کے ریکارڈ سنوانے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ وہاں ہم انتظار حسین کو بھی ساتھ لے گئے

www.taemeernews.com

ہمیں ایف سی کالج سے لے جانے کے لئے زیدی صاحب نے اپنی گاڑی بھجوا دی تھی۔ اُن کے گھر پر پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر وقار احمد صاحب بھی موجود تھے۔ طاہر رضا زیدی نے اپنے گھر کا ایک کمرہ موسیقی کے ریکارڈوں، ٹیپ مشینوں اور کتابوں کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ انھوں نے ہمیں جوتھیکا رائے کے سی ڈے اور سہگل کے متعدد گانے سنوائے۔ ان کے علاوہ منی بیگم، ناہید اختر، امانت علی، غلام علی، مہدی حسن اور ایم کلیم کی گائی ہوئی غزلیں بھی سنوائیں۔ ناہید اختر کی آواز میں مصطفیٰ زیدی کا کلام سن کر لطف آگیا۔ زیدی صاحب کے پاس میرا بائی کے بھجنوں کے کئی درجن ریکارڈ ہیں۔

ساڑھے چھ بجے ہمیں اشفاق نقوی کے یہاں پہنچنا تھا۔ اس روز ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ اسی شام کو ملتان سے مجاہد علی کی آمد بھی متوقع تھی اس لئے مجبوراً ڈاکٹر قریشی سے صبح سے ہی معذرت کر لی تھی۔ لیکن مجاہد علی کے نہ آسکنے کی وجہ سے وہ شام اشفاق نقوی اور منیر نیازی کے ساتھ گذارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اشفاق نقوی کے یہاں منیر نیازی، اظہر جاوید، مظہر الاسلام، بیدار سرمدی، حامد اختر، گلزار وفا چوہدری، انعام الحق، اصغر مہدی، قیوم حجازی وغیرہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے، ماحول خاصا خوش گوار تھا اور کوکا کولا کی بوتلیں ہر میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ کوکا کولا بھی اپنا ایک نشہ رکھتا ہے۔ منیر نیازی نے اس صورتِ حال پر ایک شعر سنایا تو سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے ؎

شراب دل کی طلب تھی شرع کے پہرے میں
ہم اتنی تنگی میں اس کو شراب کیا دیتے

منیر نیازی کی شاعری میں جو انا اور محبوبیت ہے وہ اس کی شخصیت میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ پاکستان کے شاعر اُس کی شخصیت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اظہر جاوید اگرچہ فقرے بازی اور قہقہہ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا لیکن اس وقت وہ بھی مرعوب سا نظر آرہا تھا

www.taemeernews.com

اور اشفاق نقوی نے زندگی میں صرف منیر نیازی سے ہی عشق کیا ہے اس لئے اس نے بڑی محبت اور عقیدت سے منیر کو اس کے اشعار یاد دلائے اور وہ کوکا کولا پی پی کر شعر سناتا رہا ؎

میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اُس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا!
پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اُس نے کیا

پتہ نہیں ہماری باتوں میں جون ایلیا کا ذکر کہاں سے نکل آیا کہ منیر نے اچانک ہنستے ہوئے کہا۔ "یار جون کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ بے بی پنگوڑے میں لیٹے لیٹے جوان ہو گیا ہے۔" اور پھر جب اس نے یہ شعر سنایا:

کچھ وقت بعد اُس سے جو نفرت ہوئی مجھے
اس سے نئی طرح کی مسرت ہوئی مجھے

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور معلوم ہوا کہ کوئی اسلام آباد سے منیر نیازی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ منیر نیازی کو ری ڈور میں جا کر کئی منٹ تک محو گفتگو رہا پھر اس نے مجھے بھی بلا لیا اور کہا۔ "مسز سرفراز اقبال سے بات کرو۔"

میں انھیں نہیں جانتا تھا۔ لیکن پاکستان میں اُردو ادب ہی نامعلوم علاقوں سے مجھے نئے نئے دوست مہیا کر رہا تھا۔ مسز سرفراز اقبال نے بہت اصرار سے کہا کہ میں اسلام آباد ضرور آؤں۔ مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور میں اُنھیں کے یہاں ٹھہروں گا۔ میں نے مسز سرفراز اقبال کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کراچی سے لوٹ کر ہی آنے کی کوشش کروں گا، اور منیر نیازی و اشفاق نقوی کے ہی ساتھ آؤں گا۔ اشفاق اور منیر نیازی میرے پاس ہی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ منیر میرے ہاتھ سے فون لے کر مسز سرفراز اقبال کے ساتھ پھر باتیں کرنے لگا اور اشفاق نقوی مجھے منیر کی ایک مشہور نظم شکر پڑیاں کی پہاڑی پر ایک نظم سناتا رہا۔ جس کا آخری شعر ہے ؎

www.taemeernews.com

میں ہوں اور سحر سفر ہے اور رستوں کی ہوا سرفراز اقبال ہے اور اس کی باتوں کے شجر

اسی وقت اشفاق احمد کا بھی فون آگیا جو اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار رہیں۔ اُردو ادب کے حلقے انھیں ابھی تک "گڈریا" افسانے کے حوالے سے جانتے ہیں، اور ان کا ایک اور حوالہ 'داستان گو' رسالہ بھی ہے، جو برسوں تک لاہور سے بڑی شان سے نکلتا رہا ہے۔ اُن سے تھوڑی سی گفتگو میری بھی ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ میں اشفاق احمد نے ہندوستانی بمبار طیاروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے لاہور ریڈیو سے کرشن چندر و بیدی کو اور مجھے بھی نام لے کر پکارا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اس وقت ایک خندق میں اپنے بچے کو سینے سے لگائے سمٹا بیٹھا ہے۔ اس زمانے میں جب پاکستانی بمبار طیارے سرگودھا یا کسی اور ہوائی اڈے سے پرواز کر کے ہندوستانی اڈوں کی طرف روانہ ہوتے تھے تو راڈر پر اطلاع ملتے ہی ہندوستان کے سارے شہروں میں خطرے کے سائرن بج اٹھتے تھے اور دم بھر میں بالکل بلیک آوٹ ہو جاتا تھا اور اندھیرا اور بھی گہرا اور سنگین ہو جایا کرتا تھا۔ ایسے لمحوں میں مجھے کئی بار ریلوے پلیٹوں میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے تھے سیڑھیوں کے درمیان ہی بیٹھ کر آل کلیئر کا سائرن سننے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اشفاق احمد کو فون پر بتایا ــــ "میں اب اپنی ذہنی خندق سے نکل آیا ہوں۔ تم بھی باہر آجاؤ اور مجھ سے آکر ملو ــــ" اُس نے کہا میں ابھی آرہا ہوں، اور ہم سب پھر سے ڈرائنگ روم میں واپس آگئے۔ اتفاق سے میری نظر پہلی بار سامنے دیوار پر ٹنگے ہوئے قائد اعظم کے ایک پورٹریٹ پر پڑی۔ پورٹریٹ اس قدر شاندار بنایا گیا تھا کہ میں اُسے قریب سے دیکھنے کے لئے اس کی طرف بے اختیار بڑھتا چلا گیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے حیرت زدہ ہو کر میری طرف بڑھ آئے۔ میں نے پورٹریٹ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ــــ "ان کے ساتھ میرے سارے اختلافات ختم ہو چکے ہیں۔

www.taemeernews.com

اب ہم دائمی امن میں ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں ـــــ" یہ سُن کر ہر شخص نے آمین کہا اور میرے گلے سے لپٹ لپٹ گئے۔

جب اشفاق احمد کافی انتظار کرنے کے بعد بھی نہ پہنچا تو ہم موٹر میں لدکر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا تھا میں اشفاق سے ملے بغیر لاہور سے واپس نہیں جاؤں گا۔ اس وقت میرے ہم راہ منیر نیازی، اشفاق نقوی، آغا سہیل اور قیوم حجازی بھی تھے۔ قیوم حجازی وہی تھے جنھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کا اس قدر شان دار پوٹریٹ بنایا تھا اور منیر کے شعری مجموعہ 'چھ رنگین دروازے' کا سرورق بھی بنایا تھا۔ جب اسے میرے سفرنامہ پاکستان لکھنے کا ارادہ معلوم ہوا تو اس نے اس کا بھی سرورق بنا دینے کا وعدہ کر لیا ـــــ

ہمارے لئے دروازہ بانو قدسیہ نے کھولا جو اشفاق احمد کی بیوی ہے، اور ایک مشہور افسانہ نگار و ناول نگار ہے۔ اس نے بتایا وہ اور اشفاق کار میں کافی دیر تک ماڈل ٹاؤن میں بھٹکتے رہے۔ لیکن اشفاق نقوی کا مکان A-98 تلاش نہ کر سکے تو واپس آ گئے۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اشفاق کو بھی جگا کر لے آئی۔ ہم سب اشفاق سے گلے ملے اور باتیں کرنے لگے۔ اشفاق احمد ریڈیو کے لئے اپنے گھر پر ڈرامے تیار کر لیتے ہیں۔ اُن کے پاس ساؤنڈ پروف کمرہ اور ریکارڈنگ کا سارا ساز و سامان موجود ہے۔ بانو قدسیہ ہمیں کینو چھیل چھیل کر کھلاتی رہیں۔ منیر نیازی نے مجھے اپنی جو کتابیں دی تھیں اُن میں سے 'رستہ دسن والے تارے' پر بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے بھی اپنے دستخط کر دیئے اور اس طرح ۲۴ فروری کی رات کو جو ۲۵ تاریخ میں داخل ہو گئی تھی ایک یادگار بنا دیا ـــــ

۲۵ فروری کا سارا دن بے حد مصروفیت میں گزرا۔ صبح دس بجے کالا باغ کے ایک اسٹوڈنٹ دوست عبدالمالک کے ساتھ جا کر میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آفس میں اپنی کراچی کے لئے روانگی درج کرائی۔ پولیس کے دفتر

www.taemeernews.com

میں کچھ خواتین بھی کام کرتی ہیں وہ پولیس کی خاکی وردی کے بجائے بہت ہی شوخ رنگ لباس میں تھیں اور بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان ہی کی موجودگی کی وجہ سے پولیس کی دہشت کم ہو گئی تھی۔ اسی دفتر میں صوفوں پر کئی قومیتوں کے لوگ اپنے اپنے پاسپورٹ لئے بیٹھے تھے۔ ان میں سے بیشتر افغان اور پٹھان ہی تھے جو برصغیر کے ممالک میں گھومتے رہتے ہیں۔ اپنے روایتی لباسوں میں پاکستانی پولیس کے چہروں پر خاموشی ہی نمایاں تھی۔ لیکن اُسے کسی قسم کی سرد مہری یا سختی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت زیادہ سوالات بھی نہیں پوچھتے تھے۔

بارہ بجے تک ملتان سے سید مجاہد علی اور اُن کے چھوٹے بھائی شاہد علی سید آ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے میانوالی سے فاروق روکھڑی، فضل رحمان، پروفیسر شمیم احمد خاں، محمد ایوب نیازی، پروفیسر سلیم احسن نیازی اور موسیقار امیر حسین بھی آ گئے۔ محمد اجمل نیازی جو کچھ روز پہلے سے آئے ہوئے تھے اور ستار سید جو لاہور ریڈیو اسٹیشن پر اُردو کے پروڈیوسر ہیں، کے علاوہ پروفیسر حسن رضوی اور اُردو کے مشہور شاعر اقبال ساجد بھی آ گئے۔ وہ سب مجھے اپنے پروگرام کے مطابق ۲۶ فروری کو امرت سر کے لئے الوداع کہنے آئے تھے۔ لاہور کے بعض اخبارات میں بھی یہی خبر چھپ گئی تھی۔ لیکن اب تو میں کراچی کے لئے روانہ ہونے والا تھا ــــ

دوپہر میں سنگ میل ناشرین کی طرف سے نیاز احمد صاحب نے میرے لئے پھر ایک لنچ کا اہتمام کر لیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرے مذکورہ بالا کچھ دوستوں کے علاوہ ابصار عبدالعلی، طاہر تونسوی، سلیم اختر، تبسم کاشمیری، اور کچھ اور اہل قلم کو بھی شریک کیا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پروفیسر سلیم اختر نے پاکستان اور بھارت کے ادیبوں کے درمیان اُردو کو ہی نقطۂ وحدت قرار دیا اور کہا ــــ "ہم اسی حوالے سے ایک دوسرے کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں ــ"

تین بجے مکتبۂ عالیہ میں مجھے جمیل النبی صاحب سے ملنا تھا۔ وہاں میرے

www.taemeernews.com

ساتھ طاہر تونسوی، سیّد مجاہد علی، شاہد علی سیّد اور فضل رحمان تھے۔ مجاہد علی میرے یورپ کے سفرنامے (خواب خواب سفر) کا مسودہ لے کر آئے تھے، جو اُن کے پاس ناروے میں رکھا ہوا تھا۔ اسے مکتبۂ عالیہ کے حوالے کیا گیا اور ہم سب ایک تانگے میں بیٹھ کر شیراز ان ہوٹل گئے جہاں ماہ نامہ 'سورج' کے مدیر تسلیم احمد تصوّر نے ایک شان دار عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں میرے میانوالی سے آئے ہوئے دوستوں کے علاوہ منیر نیازی، اشفاق نقوی اور دو درجن کے قریب اور بھی اہلِ قلم موجود تھے۔ فرخندہ لودھی نے اپنے افسانوں کا ایک اور مجموعہ 'آرسی'، مجھے وہیں عنایت کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے افسانوں کے کرداروں کو دھرتی کے ساتھ جڑا ہوا بتاتے ہیں۔ بانو قدسیہ انھیں بڑی اُداس روح کہتی ہیں اور اسی کے حوالے سے اُن کے افسانوں کو خوب صورت سمجھتی ہیں۔ مظفرّ محمد علی بالکل نئے افسانہ نگار ہیں۔ اُنھوں نے صرف چار برس کے تخلیقی سفر کے بعد اپنا پہلا مجموعہ 'قسطوں میں موت کے بعد' پیش کیا ہے۔ ایک جلد مجھے بھی عنایت ہوئی۔ ایک اور نئے افسانہ نگار محمود احمد قاضی کا مجموعہ 'ہوا' بھی ملا۔ ملتان سے اکرام اللہ کا ناولٹ 'گرگ شب'، مسعود اشعر لے آئے تھے۔ جسے میں لکھنؤ میں ہی پڑھ چکا تھا۔ انھوں نے پاکستان کے نئے معاشرے پر ایک نئے انداز سے نگاہ ڈالی ہے۔ دیکھنا ہے کہ نئے افسانہ نگار اپنے نئے ساتھیوں کو اپنی صف میں گھُسنے دیتے ہیں کہ نہیں۔ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ نئی نسل جو پرانی نسل کے وجود سے ہی انکار کرتی ہے، وہ اپنے بعد آنے والوں کے ساتھ اس سے زیادہ بے رحمی سے پیش آرہی ہے، اور وہ صرف خود کو ہی نئے رجحانات کا جنم داتا قرار دیتی ہے۔ میرا خیال ہے جب یہ نو واردانِ ادب جوان ہو جائیں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ یہی سلوک کریں گے ہندوستان میں قمراحسن وغیرہ نے مین را اور سریندر پرکاش کو اب ماضی کے ساتھ وابستہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ محمد خالد اختر کا ناول 'چاکی واڑہ'، اور علی اکبر عباس کا مجموعۂ کلام 'بر آبِ نیل'، اور پرتو روہیلہ کا مجموعۂ کلام 'رین بسیرا' بھی وہیں ملے۔

www.taemeernews.com

علی اکبر عباس کا ذہنی پس منظر سرائیکی کا علاقہ ہے اور وہ سرائیکی زبان میں بھی شاعری کرتا ہے لیکن اُردو کی جدید شاعری میں بھی اُس کی آواز بڑی توجہ سے سُنی جا رہی ہے ؎

کانوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے گم کھڑا رہا　　آندھی کے بعد چڑیوں کا ماتم نہ سُن سکا

پھیلتا جاتا ہے اِک سرطان تیرے جسم میں　　نشتروں کے خوف سے مت اُلہ یہ بیماری نہیں

پرتو روہیلہ نے 'رین بسیرا' کا آغاز ایک پرارتھنا سے کیا ہے ؎

تم ہی پربھو سوچ کے پنچھی تم ہی سوچ کی دھیا　　تم ہی میرے جیون ماجھی تم ہی میری نیا
تو ہی سب کا راکھا پربھو تو ہی سب کا داتا　　تیرے بھروسے پاس ہمارے روکڑ ہے نا کھاتا
تو ہی میرے من کی دھڑکن تو ہی سوچ کا مان　　تیری آس پہ جیتے ہیں، ہو تیری دیا بھگوان

اور ایک نظم 'آیا ہے رمضان' کے کچھ اشعار ؎

اچھے اچھے کھانے ہوں گے پکیں گے کیا پکوان
خوب کریں گے تن کی سیوا آیا ہے رمضان
رشوت لیں گے اور پڑھیں گے مسجد میں قرآن
برت رکھیں گے پاپ کریں گے آیا ہے رمضان
پاپ کے پیسوں سے مسجد میں لوگ کریں پُن دان
اپنے آپ کو دھوکہ دیویں ایشور پر احسان
تین درخت کا ایک میں کھا کر بھجائیں شیطان
رب پر پھر احسان ہے لوگو آیا ہے رمضان

پرتو روہیلہ بنیادی طور پر دوہے کا شاعر ہے۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ "دوہا ایک ایسی تہذیب کا عکاس ہے جو ہمیشہ سے ثنویت کے احساس پر قائم رہی ہے اور جس میں درویشی اور دنیاداری، وابستگی اور انقطاع، روحانی رفعت اور جسمانی لذت ساتھ ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ اس تہذیب کا کلچرل ہیرو کرشن ہے جو بیک وقت ایک اوتار بھی ہے اور ایک عاشق بھی

www.taemeernews.com

اور اس کا دیوتا شیو ہے جو ایک طرف تو کیلاش کی چوٹی پر بیٹھ کر گیان دھیان میں مستغرق رہتا ہے اور دوسری طرف نٹ راج کے روپ میں درشن دیتا ہے، دوہے میں یہ دونوں پہلو ابھرے ہیں"۔ ڈاکٹر جمیل جالبی دوہے کی تعریف میں لکھتے ہیں ــــ "زندگی کا تجربہ جب شعری تجربہ بنتا ہے اور دوہے کے روپ میں ڈھلتا ہے تو شعری فضا میں دبی دبی سی پُراسراریت اور فقیرانہ لہجہ اس میں رس بھر دیتا ہے۔ ایسا لہجہ جس میں بے نیازی بھی ہے اور اعتماد بھی۔ لہجہ کا یہی سُبھاؤ لفظوں کو میٹھا اور نرم بنا کر دوہے میں رنگ و نور پیدا کر دیتا ہے اور دوہا جگنو کی طرح چمکنے لگتا ہے ؎

ساگر سے جب کوئی بھاگن بوند الگ ہو جائے
سورج تاپے، بھاپ بنے، پھر برسے تب بل پائے
گوری تیرا جوبن من میں نیسی جوت جگائے
پھول کنول پہ تتلی میٹھی دھوپ میں پر پھیلائے

اُسی اجتماع میں عاصم صحرائی سے بھی ملاقات ہو گئی جو کبھی اوسلو (ناروے) میں رہا کرتے تھے اور ۱۹۷۸ء میں میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی لاہور جا چکے تھے۔ اُنھوں نے نارویجین لڑکیوں اور وہاں کی فضا پر کچھ بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ تسلیم احمد تصوّر نے مجھے ایک بھاری بھرکم تحفے سے بالکل لاد ہی دیا۔ ہم وہاں سے بڑی مشکل سے سات بجے تک نکل پائے اور سیدھے نیشنل میوزیم گئے، جہاں اُردو کے مشہور و معروف شاعر، محقق، نقّاد اور مورّخ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ اُن کا انتقال ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو شیخوپورہ کی ایک مجلس میں مرثیہ پڑھتے وقت اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ اُن کی زبان پر اُس وقت یہ مصرع تھا ؏

معجزے دو بخشے محمدؐ کے علیؑ اور قرآں

اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کی۔ اُن کی شخصیت اور مہرست پر شریف کنجاہی، شہرت بخاری، سجاد باقر رضوی، سلیم اختر اور آغا سہیل

www.taemeernews.com

نے مضامین اور مقالات پڑھے۔

رات کو ستار سید نے اپنے گھر واقع انگوری باغ میں کھانے پر بلا رکھا تھا۔ اُس محفل میں میانوالی کے محمد اجمل نیازی، فاروق روکھڑی، محمد سلیم احسن نیازی، شمیم احمد، محمد ایوب نیازی، امیر حسین، فضل رحمان، مسعود ملک شریک تھے اور اس طرح لاہور کے ایک کونے میں اچانک ایک چھوٹی سی میانوالی آباد ہو گئی تھی۔ ان کے علاوہ اس میں اقبال ساجد، حسن رضوی اور علی اصغر عباس بھی شریک تھے۔ امیر حسین کی دھنوں پر نوجوان گلوکار ایوب نیازی نے فاروق روکھڑی اور سلیم احسن کے متعدد گیت سُنائے جو سرائیکی زبان میں تھے ان گیتوں کا ہر ایک لفظ میانوالی کی مٹی، اور آب و ہوا کی خوشبو میں رچا ہوا تھا۔ اپنی دھرتی اور اپنی زبان ہر انسان کی کمزوری بنی رہی ہیں۔ ان سے پیار کر کے ہی انسان اپنے کردار اور ذہن کی تکمیل کرتا ہے، اور اس فضا سے باہر آ کر بھی اپنی شناخت کو اس لئے قائم رکھتا ہے کہ اس کے بغیر وہ ادھورا اور اجنبی بن جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ گیتوں کی لے پر ہم سب بوڑھے اور جوان بار بار اُٹھ کر ناچنے لگ جاتے تھے۔ دنیا کے بیشتر قومیں اسی طرح اپنی دھرتی کے گیتوں کی لے پر ناچتی اور وجد میں آجاتی ہیں۔ الفاظ اور لے مل کر جیسے ان کے خون کی گردش میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس محفل میں صرف اقبال ساجد ہی اجنبی بنا رہا۔ بڑی خاموشی سے ہم سب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا تعلق اُتر پردیش سے ہے۔ وہ گزشتہ تینتیس سال سے پنجاب میں رہتے ہوئے بھی اُس دھرتی کی ثقافتی وارفتگی کے ساتھ نہیں جُڑ پایا۔ شاید اُس کے بچے جو وہاں کی گلیوں کی بو باس سونگھ سونگھ کر بڑے ہو رہے ہیں۔ اس طرح بے گانہ نہ رہ سکیں گے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ دو بجے کے قریب ہم لوگ گلے مل کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک مرتبہ پھر میانوالی سے جدا ہو رہا ہوں۔ مجھے حسن رضوی نے آغا سہیل کے گھر تک پہنچایا۔

۲۶ فروری کی صبح ایک رسالہ خوشبو میز پر رکھا ہوا ملا۔ یہ ماہنامہ

www.taemeernews.com

لاہور کے اسٹوڈنٹس نے اپنی کوششوں سے نکالا ہے جس میں زیادہ تر زیر تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کے ہی مضامین، انٹرویو اور مسائل ہیں اور خاصے دلچسپ ہیں۔ 'غم اگرچہ جاں گسل ہے' عنوان کے تحت پاک ٹی وی اور امرت سر ٹی وی کے غیر معیاری پروگراموں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ عابدہ ناہید اور مبارک مشہدی نے اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایک سوال "آج کل کے نوجوان، لڑکیوں کو بے وفا کیوں کہتے ہیں؟" کے جواب میں شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کی ناصرہ بانو نے لکھا ہے — "پاگل ہیں، ان کی جیبیں ہی خالی ہوں تو اس میں لڑکیوں کا کیا قصور۔؟" اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی فرخندہ جبیں نے لکھا ہے۔ "ہم سے چوٹ کھا کر ہی ہمیں بے وفا کہتے ہیں۔" اظہر بابر کے انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہ آپ نے کبھی شادی کے بارے میں سوچا، گورنمنٹ کالج لاہور کی ایم ایس سی باٹنی کی ایک طالبہ فرزانہ رزاق نے جواب دیا ہے — شادی کے بارے میں سوچنا بالکل فضول ہے، اس معاشرے میں اگر آپ شادی نہ کرنا چاہیں تو لوگ پکڑ دھکڑ کر شادی کر دیتے ہیں۔ اور اس سوال کے جواب میں کہ آپ اپنے خاوند میں کون سی خصوصیات دیکھنا پسند کریں گی۔ فرزانہ نے کہا۔ خوب صورت نہ ہو، زیادہ امیر بھی نہ ہو اور زیادہ ذہین نہ ہو۔ ایک طالب علم اقبال نواز کی جو اسی رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں، غزل کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

پتے گالوں کو چھپا لیتے ہیں کیوں کر سرد ہاتھ
جب خیالوں میں اتر آتے ہیں بوسوں کے نقوش

'کبھی کبھی خیال آتا ہے' کے عنوان کے تحت شعبۂ زولاجی کی طالبہ وحیدہ اظہر نے لکھا ہے — لنڈا بازار بند کرا دوں تاکہ لڑکے جینز کی پینٹ اور جیکٹ نہ پہن سکیں۔ سارا رسالہ لڑکے لڑکیوں کی تصاویر سے بھی مزین ہے۔ لگتا ہے پاکستان کا معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ حد درجہ مشرقیت اور حد درجہ روشن خیالی میں۔ یہ دونوں طبقے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور ایک دوسرے پر برابر اثر انداز ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

روزنامہ مشرق نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ "اگر آپ ادیب ہوتے" اس کے تحت احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب سے سوال کیا جاچکا ہے۔ ۱۹ر فروری کے ادبی اڈیشن میں محمد حسن عسکری کے بارے میں انتظار حسین کا ایک مضمون ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی انگریزی میں چھپی ہوئی نظموں کے مجموعے پر تبصرہ کیا گیا ہے ــــ

پولیس پوسٹ گلمرگ میں جاکر اپنی روانگی لکھوائی۔ سہ پہر میں تھوڑی دیر کے لئے ڈاکٹر اعجاز نقوی آئے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ وہ میرے لئے اُس ضیافت کی رنگین تصادیر لے کر آئے تھے جو اُنھوں نے مجھے اپنے گھر پر دی تھی۔ شام کو فضل رحمان اور شمیم احمد بھی آگئے اور میری کراچی کے لئے روانگی تک ساتھ رہے۔ میری فلائٹ رات سوا نو بجے کی تھی۔ طاہر رضا زیدی، آغا سہیل اور میں آٹھ بجے ایرپورٹ پر پہنچ گئے جہاں بہت بھیڑ تھی۔ لاہور میں اندرونی پروازیں ہر پندرہ منٹ کے بعد مل جاتی ہیں۔ کراچی، ملتان، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ، فیصل آباد، حیدرآباد، سکھر وغیرہ اہم مقامات کے لئے۔ عمان، سعودی عربیہ، دوبئی، مسقط، کویت وغیرہ کو جانے والوں کی بھی بھیڑ تھی۔ چیکنگ بس ایک منٹ سے زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ سب کام خود کار مشین کے سامنے سے گزر کر ہی ہو گیا۔ لاونج میں آرام دہ صوفوں پر بہت سے لوگ، عورتیں اور بچے اپنی اپنی فلائٹ کا اعلان سننے کے منتظر بیٹھے تھے، میں جب اپنی فلائٹ کا اعلان سن کر جہاز کی طرف جانے کے لئے اُٹھا تو اچانک ایک لڑکا جینز پہنے ہوئے بھاگتا ہوا میرے پاس آگیا اور بولا "انکل میں آپ کو یہاں لے آنے کے لئے اپنی گاڑی لے آیا تھا، لیکن آپ پانچ منٹ پہلے نکل آئے، کراچی پہنچ کر فون ضرور کیجئے گا اور آنے سے پہلے بھی اطلاع دیجئے گا۔ اچھا خدا حافظ وِش یو ہیپی جرنی ـ"

وہ خرم تھا ــ محسن سہیل کا دوست..... محسن سہیل تھی ایرپورٹ کے ایک جنگلے کے پیچھے بہت دور کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا اور آوازیں دے رہا تھا۔ انکل!! انکل گڈ بائی۔ خدا حافظ!

٭٭٭

www.taemeernews.com

کراچی میں آمد

(۱۳)

لاہور سے کراچی کی فلائٹ نمبر ۳۴۱ دراصل ایک ہوائی بس تھی۔ اُس میں ساری سیٹیں فُل تھیں۔ میرے لئے درمیان کی قطار میں چار سیٹوں میں سے ایک سیٹ بُک تھی۔ میرے بائیں طرف لاہور کی سبزی منڈی کا ایک نوجوان تاجر محمد طاہر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے مال کی رقم وصول کرنے کے لئے کراچی جا رہا تھا، اُس نے ہندوستان کے ساتھ سبزی کی تجارت کے بارے میں کہا "اگر یہ سمجھوتا ہو جائے تو ہم لاکھوں روپے کا مال ہر مہینے دہلی، بمبئی اور کلکتہ تک بھجوا سکتے ہیں اور

www.taemeernews.com

اتنی ہی قیمت کا مال وہاں سے منگوا لیا کریں گے"۔ مجھے ریلوے ملازمت کی وجہ سے ہندوستان کی بڑی بڑی سبزی منڈیوں میں گھومنے کا کچھ تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سبزی کے بیوپاری کس طرح ٹرکوں اور ریلوں سے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں اپنا تازہ مال پہنچانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سے مہینے میں کہاں کس قسم کی سبزی کی کھپت کی جا سکتی ہے، یا وہاں سے منگائی جا سکتی ہے۔ شاید اس قسم کے نقل و حمل کا علم ہمارے ادیبوں کو نہ ہو، وہ غیر شعوری طور پر متاثر ضرور ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن اثرات کو ادب میں تلاش کرنا مشکل ہوگا جو خارجی اور داخلی دونوں طرح کی صورت حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔

پی آئی اے کے خوب صورت لباس والی خوش شکل اور چھریرے بدن کی فضائی حسیناؤں نے ہمیں جس خوش خلقی اور پھرتی سے کھانا کھلایا اس سے سفر اور بھی خوش گوار ہو گیا۔ ان ہی میں سے ایک حسینہ جب اُس روز کے شام کے تازہ اخبارات کی ٹرالی لے کر گزری تو میں نے جسارت اخبار اُٹھا لیا، اور اچانک میری نظریں ایک خبر پر رُکی سی رہ گئیں۔ "رام لعل مسلمان ہے"۔ اخبار کے مبصر نے غالباً یہ تاثر میرے سابق وطن اور پاکستانی عوام سے میری دوستی کے جذبے کو محسوس کر کے قائم کر لیا تھا۔ محمد طاہر نے مجھے صبح کے ڈان میں چھپی ہوئی ایک خبر دکھائی۔ "آج رام لعل کی کراچی میں آمد!" پاکستان کے قومی پریس نے خبروں اور کالموں کے ذریعے مجھے اپنے ملک کے عوام کے قریب تر رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مشرق۔ امروز۔ نوائے وقت۔ جنگ۔ حریت، ڈان، پاکستان ٹائمز اور دی مسلم وغیرہ میں ہر دوسرے تیسرے روز کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا تھا۔ میں جہاں جہاں جاتا تھا جس محفل میں بیٹھتا تھا اُس کا تذکرہ کسی نہ کسی انداز میں ضرور ہوتا رہتا تھا۔ بعض اخبارات میں تو محض سُنی سُنائی باتوں کی بنا پر خبریں بنائی جاتی تھیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ریڈیو پاکستان سے بھی میرے دورے کی ایک خبر نشر کی جا چکی تھی۔ مجھے یہ سب

www.taemeernews.com

دیکھ کر اور سُن سُن کر حیرت بھی ہوتی تھی کیوں کہ میں نے خود کو کبھی اس قدر اہم نہیں سمجھا ہے اور نہ ہی اس طرح کی پبلسٹی دیکھ کر خود کو اہم سمجھ رہا تھا۔ بس یہی خیال بار بار آتا تھا کہ یہ کوئی دوسرا شخص ہے جو میری ذات سے یقیناً زیادہ اہم ہے۔ میری ذات تو ایک بہت ہی معمولی اور عام انسان سے عبارت ہے جو زندگی میں ادب اور ثقافت کی ایک خاموش مگر مسلسل لڑائی لڑ رہا ہے۔ اخبارات میں اپنا نام دیکھ کر خوشی تو ہوتی ہے۔ لیکن اس سے ایک اُداسی بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی سوچ سوچ کر کہ اپنی ذات کو بھی اُسی قدر اہم بنا سکتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اپنی خواہش سے انسان نہ تو آسودہ بن سکتا ہے نہ ہمیشہ خوش ہی رہ سکتا ہے۔ اُس کے لئے تو اس قسم کا پوز بنانا بھی مشکل ہو جاتا ہے ــــ

ہماری فلائٹ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ گئی۔ اوپر سے کراچی شہر کی بے شمار روشنیاں دیکھ کر میں پھر سے اپنے خول سے باہر آگیا اور اُن دوستوں کے بارے میں سوچنے لگا جو کراچی میں بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جن کے ناموں سے میں برسوں سے آشنا ہوں اور جن میں سے بیشتر کے ساتھ میری برسوں سے خط و کتابت ہے۔ ہوائی جہاز نیچے پہنچ گیا اور میں بس میں بیٹھ کر لگیج بیلٹ والے ہال تک پہنچ گیا تو میری آنکھیں گیٹ کے اُس پار شناسا چہروں کو تلاش کرنے لگیں۔ اچانک میں نے بھیڑ میں سے جون ایلیا کی چمکتی اور مسکراتی ہوئی آنکھیں پہچان لیں اور تصاویر میں بارہا دیکھے ہوئے ایک دھان پان جسم کو بھی پہچان گیا، جو یقیناً صہبا لکھنوی کا تھا۔ اچانک راحت سعید اُس بھیڑ میں سے سرک کر میرے پاس آگیا۔ وہ پی آئی اے کے میکینکل شعبے میں ایک اعلیٰ افسر ہے۔ اُس سے لاہور میں ۸ فروری کو ملاقات ہو چکی تھی۔ ہم لوگ لگیج بیلٹ سے سوٹ کیس اُٹھا کر باہر آئے تو جون ایلیا اور صہبا لکھنوی نے دوستوں کی طرف اشارا کر کے اور یہ کہہ کر مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ "انھیں پہچانو تو جانیں ــــ!"

www.taemeernews.com

محمد علی صدیقی اور زاہدہ حنا کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی کیوں کہ اُن کی تصاویر میں رسالوں میں دیکھ چکا تھا۔ حسن عابد کے مسرور اور پُرجوش چہرے میں مجھے چھبیس برس پہلے لکھنؤ یونیورسٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے نوعمر شاعر احمر سیتاپوری کو تلاش کرنے میں بس چند سکنڈ کا وقفہ لگا اور اسے بے اختیار گلے سے لپٹا لیا۔ اور پھر مجھے شاہد الوری اور اختر فیروز سے ملایا گیا۔ لاہور میں مکتبہ عالیہ کے دفتر میں فون پر جن صاحب سے بات ہوئی تھی وہ شاہد الوری ہی تھے۔ ہم لوگ تین گاڑیوں میں سوار ہو کر ناظم آباد میں محمد علی صدیقی کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں میرے میزبان صہبا لکھنوی صاحب نے میرے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ ویسے محمد علی صدیقی سے ایک عرصے سے خط و کتابت تھی، اور مجھے ہر وہ انتظام اچھا لگتا ہے جو اچھے اور مخلص دوستوں کے درمیان طے پا جائے۔ اُردو کے منفرد نقاد اور ڈان کے مشہور کالم نگار (جو ایرٹیل کے قلمی نام سے لکھتے ہیں) نے اپنی محنت اور حلال کی کمائی سے ایک چھوٹا سا مگر بہت ہی خوب صورت دو منزلہ مکان بنوا رکھا ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ پاکستان کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ذاتی مکان بنوا لئے تھے۔ محمد علی کی بیگم ثریا، اُن کے چھوٹے بھائی آصف اور اس کی دُلہن سیما سے بھی گھر پہنچتے ہی ملاقات کرا دی گئی۔ ہم سب اوپر کی منزل پر ایک کشادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور میں ابھی تک گرم سوٹ میں تھا جو لاہور سے پہن کر چلا تھا جب کہ کراچی کا موسم بالکل دوسرا تھا۔ بمبئی جیسا۔ اور میں اب گرمی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور ہم چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ہنس ہنس کر۔ سب لوگ لاہور کے ادیبوں اور وہاں کی ادبی فضا کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ وہاں رہنا مجھے کیسا لگا اور ہندوستان اور لکھنؤ، دلی، بمبئی اور حیدرآباد کی باتیں اور بے شمار ادیبوں کی خیر خیریت اُن کے نام لے لے کر پوچھی گئی۔ جو بھی جس کو جانتا تھا۔ ہند و پاک کے سارے ادیب ایک بہت بڑے خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی کئی شاخیں ہیں،

www.taemeernews.com

کئی افراد ہیں۔ رات کے ڈیڑھ بجے کے بعد سارے دوست رخصت ہو گئے، وہ سب کئی کئی میل دور سے آئے تھے۔ بمبئی کی طرح کراچی کے بھی بہت فاصلے ہیں۔

جب محمد علی اور میں تنہا رہ گئے تو اُس نے گذشتہ قریباً بیس روز کے پاکستان میں میرے قیام کا جائزہ لیا۔ مجھے ہر کہیں محبت اور بے پناہ خلوص مل رہا تھا۔ میں نہ تو سرکاری دورے پر تھا نہ ہی کسی جگہ سرکاری مہمان بنایا گیا تھا۔ تقریبات کے سارے اجتماع بھی غیر سرکاری یعنی دوستوں کے ذاتی پیار کے جان تھے۔ اور مجھے اس بات سے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ مجھے ادیبوں اور قارئین، سب ہی سے آزادانہ ملنے کے مواقع مل رہے تھے۔ ان کے علاوہ اُن عام آدمیوں سے بھی جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ میرے نام سے تو کیا اپنے ملک کے ادیبوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے۔ اُن کے مسائل کو میں کسی قسم کے سوالات پوچھے بغیر ہی سمجھ لیتا تھا۔ جب وہ بڑی سادگی سے باتیں کرتے تھے، اور میں خوش تھا کہ جس طرح لاہور میں مجھے آغا سہیل جیسے ذہین افسانہ نگار کا مہمان بننے کا موقع ملا تھا اور وہاں بالکل گھر جیسا ماحول نصیب ہوا تھا اُسی طرح کراچی میں بھی مجھے محمد علی صدیقی جیسے بالغ نظر نقاد اور انسان دوست کا ساتھ مل گیا تھا۔ اُن کی تحریریں میری نظر سے گذرتی رہی تھیں۔ اُن کے تنقیدی مضامین، ماہنامہ افکار کے بہ طور مہمان مدیر لکھے ہوئے اداریے، اور ڈان میں اپریل کے نام سے لکھے ہوئے کالم میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم انھیں سید احتشام حسین مرحوم اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی روایت کا ایک جدید سلسلہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ انھیں ترقی پسند نقادوں کی ملائیت سے الگ بھی سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں محمد علی صدیقی ترقی پسند تحریک کے تاریخی دور کے بعد تنقید کے اس صحت مند رجحان سے تعلق رکھتے ہیں جو ادب کو جدیدیت کے منفی اور فیشن پسند دھارے سے بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ کروچے اور

www.taemeernews.com

مارٹن ہائیڈیگر اُن کے محبوب مفکرین میں سے ہیں۔ کرشن چندر اور اختر الایمان پر انگریزی میں اُنھوں نے معرکہ آرا مضامین لکھے ہیں۔ ہم اُن کے کئی مضامین پر باتیں کرتے کرتے نہ جانے رات کے کون سے پہر میں تھک کر سو گئے۔

صبح چھ بجے ثریا بھابھی نے چائے لاکر رکھ دی اور انھوں نے محمد علی کو اور مجھے جگا دیا۔ چائے اس قدر فرحت بخش تھی کہ نیند کی کمی کی وجہ سے بدن میں جو تھکن محسوس ہو رہی تھی آناً فاناً دور ہو گئی۔ گرم پانی سے غسل کر لینے سے بھی بہت راحت ملی۔ آٹھ بجے تک جون ایلیا، زاہدہ حنا اور حسن عابد بھی آ گئے۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ بے حد پر تکلف تھا۔ پاکستان کی انتہا سے بڑھی ہوئی مہمان نوازی دیکھ کر بار بار یہی احساس پیدا ہوتا تھا کہ مہمان ہونا بھی ایک امتحان ہوتا ہے۔ میزبان تکلف کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگر مہمان اپنی ضرورت بھر کے مطابق کھانا چاہے تو اُسے ایسا نہیں کرنے دیا جاتا، طے یہ ہوا کہ میرا سب سے پہلا کام پولیس آفس میں جا کر اپنی آمد کی رپورٹ درج کرانا ہوگا، اور اس کام میں رہنمائی کے لئے کل رات کو ہی صبا لکھنوی نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ حسن عابد محمد علی صدیقی کو اپنی گاڑی میں لے کر 'ڈان' کے دفتر چلے گئے تاکہ وہاں تھوڑا سا کام دیکھ کر افکار کے دفتر میں آ جائیں۔ مجھے اور جون ایلیا کو زاہدہ حنا اپنی گاڑی میں لے کر افکار کے دفتر واقع رابسن روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں اُن کی گاڑی میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی جسے ایک سروس اسٹیشن پر رُک کر ٹھیک کرایا گیا۔ زاہدہ جون ایلیا کی ایک مکمل رفیقۂ حیات ہے۔ وہ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی مدیرہ (عالمی ڈائجسٹ کی) اور ایک ذہین اور جرأت مند جدید افسانہ نگار بھی ہے۔ جون کو زاہدہ نہ ملی ہوتی تو اُس کا حشر مجاز اور اختر شیرانی جیسا ہو چکا ہوتا۔ ایک خوبی جان ایلیا میں بھی ہے کہ وہ اپنی بیوی پر بھروسہ کرتا ہے۔

افکار کے دفتر میں صہبا صاحب صبح سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں شہزاد منظر سے بھی ملاقات ہو گئی اور ملتان سے آئے ہوئے مشہور

www.taemeernews.com

مشہور شاعر مقصود زاہدی صاحب سے بھی ۔ اُن سے ملتان میں ملاقات نہ ہو سکی تھی ۔ انھیں بھی میری آمد کا علم وہاں سے چلے آنے کے بعد ہوا تھا، اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی ماہ طلعت بھی تھی ۔ جو نئی شاعرہ ہے اور بہت اچھی غزلیں اور نظمیں لکھ رہی ہے ۔

نیندیں جم گئیں چہرے پر ۔ آنسو جذب ہیں آنچل میں
پیاس کے صحرا میں کانٹے ۔ یاد کا پانی چھپا گل میں

کھانے میں جانے کے لئے دفتر سے نکلتے نکلتے صہبا صاحب نے کوئی دو درجن فون ملائے ہوں گے ۔ اور اتنے ہی باہر سے آنے والے فون سُنے ہوں گے، وہ بہت جلدی جلدی بولتے ہیں اور اُسی تیزی سے چلتے بھی ہیں ۔ شاید دنیا میں صرف اُن ہی کو سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہے کہ زندگی بہت مختصر ہے اس لئے جتنی جلدی سارے کام نپٹا لئے جائیں اور جتنے زیادہ لوگوں سے فون پر گفتگو کر لی جائے اچھا ہو گا ورنہ ہاتھ ملتے رہ جانا ہو گا ۔ سکندر اعظم تو ہاتھ ملتے ہوئے نہیں ۔ خالی ہاتھ کفن سے باہر نکالے ہوئے دنیا سے لوٹ گیا تھا ۔ صہبا صاحب کا قد چھوٹا ہے اور چھوٹے قد والوں کے بارے میں میرا اعتقاد ہے کہ دنیا میں صرف ان ہی میں انرجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے ۔ طویل قامت لوگوں میں انرجی بٹ جاتی ہے ۔

وہاں سے نکلنے لگے تو صہبا صاحب کو ایک اور کال سُننی پڑ گئی، لیکن اتفاق سے وہ میرے لئے تھی ۔ اُدھر سے کسی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا ۔ کیا میں ڈاکٹر کھیڑا کو جانتا ہوں ؟ ۔ میں خاصا چکرا گیا ۔ لیکن یہ عقدہ بھی جلدی کھل گیا کہ ڈاکٹر ہنس راج کھیڑہ میری دادی مرحومہ کے عزیز تھے ۔ جن سے میں ۱۹۴۳ء کے بعد نہیں مل سکا تھا ۔ اب وہ پٹھان کوٹ سے اپنے ایک دوست کے والد ڈاکٹر عبدالکریم سے ملنے کے لئے مع اپنی بیگم کے آئے ہوئے تھے ۔ ڈاکٹر کھیڑا نے ڈان میں میری

www.taemeernews.com

کراچی میں آمد کی خبر پڑھ کر مجھے کئی جگہ فون کرنے کے بعد بالآخر افکار کے ہی دفتر میں تلاش کر لیا۔ اُن کے ساتھ اگلے روز سہام مرزا کے آفس میں ملنے کا وقت مقرر کر کے ہم لوگ کراچی کے سنٹرل پولیس آفس گئے، اب گاڑی صہبا لکھنوی کی تھی۔ جسے وہ خود ہی بلا خوف و خطر اسی طرح تیز باتیں کرتے ہوئے اور بار بار ہماری طرف دیکھتے ہوئے چلا رہے تھے۔

پولیس اسٹیشن پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس حامد علی خاں صاحب نے پہلے ہم سب کو چائے پلائی۔ ناشتہ بھی کرایا اس کے بعد میری آمد کی رپورٹ درج کی۔ وہ ہندوستان سے وہاں جا کر بس گئے تھے۔ پولیس والوں سے ایسی قربت حاصل ہو جائے تو دل سے ہر قسم کا خطرہ دور ہو جاتا ہے۔ لیکن میرا ارادہ کسی قسم کے جرم میں ملوث ہونے کا ہرگز نہیں ہے۔ افکار کے دفتر میں لوٹ کر میرے نام ایک اور فون آیا۔ وہ اُردو کی مشہور و معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور تھیں۔ چاہتی تھیں میں اُنھیں کے یہاں قیام کروں، لیکن میں اب ڈیرے ڈال چکا تھا۔ محمد علی صدیقی کا مکان چھوڑنا اب میرے امکان میں نہیں تھا۔ ہاجرہ مسرور نے لکھنؤ کے تعلق سے اپنا خلوص دکھایا تھا جس کے لئے اُن شکریہ ادا کر کے اُن سے جلد ملنے کا وعدہ کیا ــــــ

افکار کے دفتر میں ادیبوں اور شاعروں کی ہر وقت آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ جب کہ وہاں بیٹھنے کے لئے بہ مشکل پانچ چھ آدمیوں کی جگہ ہے۔ آدھے سے زیادہ دفتر کتابوں اور رسالوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ صہبا صاحب کم سے کم جسامت کے مالک ہیں ورنہ اُن کے لئے بھی جگہ نہ نکل پاتی۔ افکار ہندو پاک میں دو چار اچھے رسالوں میں سے ایک ہے جو آزادی سے پہلے سے بڑی باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ اور بلاشبہہ اعلا ادب پیش کر رہا ہے۔ افکار نے بے شمار یادگار خاص نمبر بھی نکالے ہیں۔ مثلاً جوش نمبر، مجاز نمبر، فیض نمبر، حفیظ نمبر، ندیم نمبر، غالب نمبر،

www.taemeernews.com

مصطفےٰ زیدی نمبر وغیرہ۔ دوپہر کو وہ مجھے اور کچھ دوستوں کو ساؤتھ چائنا ریسٹوراں میں لے گئے جو کراچی صدر میں واقع ہے۔ وہاں ہم نے چینی کھانا کھایا۔ اور ساتھ ساتھ کرکٹ کی کمنٹری بھی سنتے رہے۔ کراچی میں اُسی روز پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان میچ شروع ہوا تھا۔ میں لکھنؤ میں ہوتا تو پورے پانچ روز کی کمنٹری بڑے اطمینان سے سنتا۔ لیکن اس سفر میں چلتے چلتے کسی ٹرانزسٹر بردار کو روک کر ہی پوچھ سکتا تھا۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ ٹرانزسٹر اُٹھائے اُٹھائے پھرنے والے دوسروں کو اسکور بتا کر اس طرح مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے اُنھوں نے حاجت مندوں کی ضرورت پوری کر کے اپنے خدا کو بھی خوش کر لیا ہو ــــ

تین بجے بعد سہ پہر افکار کے ہی آفس میں انجم اعظمی سے ایک طویل مدّت کے بعد ملاقات ہو گئی۔ آخری بار ہم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۵۹ء میں ملے تھے جب وہ وہاں خلیل الرحمان اعظمی، علی حماد عباسی، صغیر احمد صوفی اور جاوید کمال کے ساتھ ایم۔ اے کر رہے تھے۔ میرا وہاں اکثر جانا ہوتا تھا۔ اور ہم رات کو بارہ بارہ بجے تک میرس روڈ اور یونی ورسٹی کے دوسرے علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔ ان ہی لوگوں کو میں نے یارانِ نجد کہہ کر اپنی ایک کتاب کا انتساب بھی اُن کے نام کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان علی گڑھ کی یادوں کو تازہ کرنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کے مالک سہام مرزا اور اس کی ایڈیٹر عنا فاروقی بھی وہیں آ گئے۔ سہام مرزا حیدرآباد دکن کے ہیں۔ ان کا رسالہ ہر ماہ میرے پاس باقاعدگی سے آتا ہے۔ ان کی بیگم رخسانہ سہام مرزا نے ایک بار لکھا تھا کہ میں جب بھی کراچی آؤں اُن ہی کے یہاں قیام کروں۔ اب تو وہاں قیام کا مسئلہ درپیش نہیں تھا، بلکہ یہ تھا کہ کس کس سے معافی مانگوں۔ وہاں ہر شخص کا دل خلوص و محبت سے بھرا ہوا تھا اور میرے لئے ہر گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عنا فاروقی رسالے کی ادارت کے علاوہ ہر ماہ تین چار تین کہانیاں بھی باقاعدگی سے

www.taemeernews.com

لکھتی ہیں۔ جنھیں وہ چاہیں تو ذرا سی اور محنت کرکے تین ناولٹوں میں بدل سکتی ہیں۔

ہم لوگ ٹھیک پانچ بجے آرٹ کونسل کے لئے روانہ ہو گئے جہاں شبنم رومانی کے مجموعۂ کلام 'جزیرے' کی رسم اجرا تھی۔ پروگرام میں میری شرکت کا بھی اعلان کیا جا چکا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہال کے باہر مجھے کئی لوگ مل گئے۔ پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، جو اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ محسن بھوپالی، حمید کاشمیری جن کے ساتھ برسوں پہلے خط و کتابت رہا کرتی تھی۔ رضیہ فصیح احمد، سلطانہ مہر، جمیل جالبی، نسیم درانی، عبید اللہ علیم، قمر ہاشمی، ذکی شیرازی، کمانڈر سید انور، مجنوں گورکھپوری، مختار زمن، صہبا اختر، اظہر سعید خاں، زاہدہ حنا، جون ایلیا، علی حیدر ملک، محمود واجد، احمد سلیم، تنویر بخاری، عزیز کارٹونسٹ، راحت سعید، عالم تاب تشنہ وغیرہ۔ محمد علی صدیقی اور حسن عابد بھی اپنے آفس سے وہیں آ گئے تھے۔ یہ سارے ادیب و شاعر اور نقاد ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہجرت کرکے کراچی میں جمع ہو گئے تھے، مجھے ایسا لگا جیسے میں ہندوستان کے ہی کسی بڑے شہر میں ہوں۔ میں قریب قریب سب ہی لوگوں کے نام سے واقف تھا۔ اُن کی تخلیقات پڑھتا رہتا تھا۔ پاکستان کے بیشتر رسالے ملتے رہنے کی وجہ سے اُن سب کے ساتھ میرا ذہنی رشتہ برقرار تھا۔ اور میں بھی اپنے افسانوں کی پاکستان میں مسلسل اشاعت کی وجہ سے اُن کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ان میں سے کئی ایک کے ساتھ میری ملاقاتیں علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد اور بمبئی میں ہو چکی تھیں۔

آرٹ کونسل کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے ڈائس پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ مجنوں گورکھپوری۔ سحر انصاری۔ مختار زمن، ممتاز حسین اور انجم اعظمی کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ شبنم رومانی کے بارے میں کئی مقالات پڑھے گئے۔ مختار زمن، سحر انصاری، انجم اعظمی، جاذب قریشی، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر منظور حسین شور، مولانا حنیف اسعدی وغیرہ نے مجنوں گورکھپوری

www.taemeernews.com

اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (صدر جلسہ) نے تقریریں کیں۔ اس تقریب کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مقالہ نگاروں اور مقررین نے شبنم رومانی کے نام کے ساتھ لفظ 'رومانی' کی وابستگی پر نہ صرف خاصا زور دیا بلکہ اس کی شاعری میں رومانیت کے عناصر تلاش کرنے میں کافی وقت صرف کر دیا۔ چنانچہ یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ جو شخص لفظ کے پردے میں معنی، جسم کے پردے میں روح اور کائنات کے پردے میں ایک جہان دیگر کا نظارہ کرنے کا متمنی رہتا ہے اُسے اختر شیرانی کی رومانویت کے ساتھ وابستہ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ لفظ رومانویت دراصل اطالوی زبان کے Romanticism سے لیا گیا ہے جس کے لغوی معنی شجاعت سے بھرپور کارنامے کے ہیں۔ لیکن اُردو میں یہ لفظ عشق و محبت کے مضامین کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ ناروجین زبان میں رومان ناول کے لئے مستعمل ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے شبنم رومانی کی فکری توانائی کو جو زندگی سے اثبات کرتی ہے انسانی ارتقا کی راہ میں حائل ہونے والی ہر قدیم کی نفی کرنے والی شاعری قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اُن کی شاعری کو ایک تخلیقی تجسس کہا ہے جو کسی صوفیانہ روش کا غماز ہے لیکن انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شبنم اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے کائنات اور زندگی کے پردوں اور نقابوں کے پیچھے کی دنیا پر ایک نظر ڈالنے اور پھر اُسے متشکل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اصلاً ایک صوفیانہ نہیں بلکہ ایک جمالیاتی رویہ ہے۔ محمد علی صدیقی شبنم رومانی کی شاعری کو مافی الضمیر کے حوالے سے سمجھتے ہیں کہ ہر زبان کی بحث میں عجز کے سارے اتہامات صاحب معاملہ فن کار کو اپنے سر لے لینا چاہئیں۔ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہم انا پرستی کے اس دور میں اپنے عجز کو واہمہ سمجھیں اور زبان کے عجز کو حقیقت ثانیہ۔ قدما اور ہم میں سب سے بڑا فرق یہی نظر آتا ہے کہ وہ تکمیلیت پسندی کے چکر میں اپنی فکر اور اس کے اظہار کے درمیان کا فاصلہ منطق کی سیڑھی پر چڑھ کر کاٹنا چاہتے ہیں اور اُن میں سے نابغہ روزگار شخصیات بسا اوقات اس فاصلے کو وجدان کی زقند مار کر طے

www.taemeernews.com

کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں ؎

خار ہیں ایڑیوں کے پار پھول پلک پلک پہ ہیں
پاؤں مرے زمین پر ہاتھ مرے فلک پہ ہیں

گماں قوی ہے کچھ اتنا یقین ہو جیسے
یہ آسمان بھی اپنی زمین ہو جیسے

جاں، اک لمحۂ گریزاں ہے مڑ کے دیکھوں کہ سامنے دیکھوں
تجھ کو چھونے بڑھوں تو ہاتھ اپنے پتھروں میں دبے ہوئے دیکھوں
میرا چہرہ بھی اب نہیں میرا اب کن آنکھوں سے میں تجھے دیکھوں

درج ہے تاریخِ وصل و ہجر اک اک شاخ پر بات جو ہم تم نہ کہہ پائے شجر کہنے لگے
بستیوں کو بانٹنے والا جو خط کھینچا گیا خط کشیدہ لوگ اس کو رہ گزر کہنے لگے

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں ایک ایسی تقریب میں موجود تھا۔ جہاں شبنم رومانی کے بارے میں کئی اہلِ قلم کے خیالات معلوم ہوئے۔ میں خود بھی اُن کے اشعار دیکھتا رہا۔ بے شمار دوستوں سے بھی ایک ہی جگہ ملاقات ہو گئی۔ ایم۔ اے عزیز کارٹونسٹ نے سامعین کے درمیان بیٹھے بیٹھے میرا ایک کارٹون بنا کر مجھے عنایت کر دیا۔ کئی دوستوں نے میری ڈائری میں اپنے پروگرام لکھے اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیئے۔ میں انھیں محمد علی صدیقی سے بھی مشورہ کر لینے کے لئے کہتا رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے پروگرام کسی اور کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ شاید زندگی میں پھر ایک ایسا لمحہ آگیا تھا کہ میں ہجومِ دوستاں میں کسی کے ساتھ بھی اطمینان سے بات نہیں کر پا رہا تھا۔ جمیل جالبی کئی بار میرے قریب آئے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر الگ لے جانا چاہا لیکن پھر کسی اور کے بازوؤں میں جا نکلا۔ وہیں اچانک ایک اور چہرہ ــ مسکراتا ہوا مہربان چہرہ میرے سامنے اُبھر آیا۔ پوچھنے لگا ــ "مجھے پہچانتے ہو؟"۔

www.taemeernews.com

علی گڑھ، شاہ جہاں پور، لکھنؤ، بریلی، ڈھاکہ، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد، ناسک، دہلی وغیرہ کے بے شمار چہروں کے درمیان اچانک ایک اور چہرہ! میں فوراً نہ پہچان سکا تو وہ خود ہی بول اُٹھے ـــــ "میں اسرار مسعود ہوں۔ بھوپال سے آیا ہوں۔ میرے بچے باہر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" لیکن پھر وہ چہرہ بھی کہیں پیچھے چلا گیا اور نئے چہرے سامنے آگئے۔ جی چاہا میں اپنے آپ کو چھوڑ کر سب سے پیچھے چلا جاؤں۔ دور ہٹ کر اُس شخص کا تماشا دیکھوں جو اچانک محبت کرنے والوں کے ہجوم میں گھر گیا ہو۔ وہ ہر ایک سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن کسی کے ساتھ پوری بات نہیں کر پاتا تھا۔ میں درحقیقت اس پر ہنسنا بھی چاہتا تھا، خوش بھی ہونا چاہتا تھا۔ وہ اسی محبت کی تلاش میں تو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا اس سے کہوں لے پہچان اب اپنے آپ کو! اتنے اتنے سارے لوگوں کی خلوص سے چمکتی ہوئی، آئینوں کی مانند جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی آنکھوں میں اپنے آپ کو روک لے۔ ایک جگہ۔ کسی ایک دل میں کسی ایک کی آنکھوں میں۔ اور ایک لمحے کی طرح منجمد ہو جا، اس لمحے کی طرح جسے دو ملکوں کی سیاست اچانک صرف ایک یا دو بیانات سے آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ اور انسان۔ یہی انسان خلا میں خالی خالی آنکھوں سے تاکتے رہ جاتے ہیں۔ شاید میں اپنے آپ کو وہیں چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا۔ جب زاہدہ حنا مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی اور کار میں میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے جون ایلیا کے پاس لے جا کر بٹھا دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی میں بڑی اُداسی سے کھڑکی میں سے ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا جو کسی کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ دھیرے دھیرے بکھرتے جا رہے تھے مختلف سمتوں میں روانہ ہو رہے تھے۔ اور اسی شام کو کراچی کی بے شمار لمبی لمبی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا میں نے اپنی ایک دوست زیبا علوی کی بوڑھی ماں کو اور اس کے بھائی اور بھابھی اور دو بہنوں کو بھی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تلاش کر لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے

www.taemeernews.com

اور خوشی کی جھلک بھی۔ انھیں بھی ڈان اخبار سے میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی، اور وہ ہر لمحہ میرے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس گھر سے میرے ساتھ صرف فریدہ ہی آسکی اور پھر ہم سب محمد علی صدیقی کے یہاں رات کے ڈنر پر پہنچ گئے جہاں بہت سے لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے، راحت سعید، خنق عابد، انجم اعظمی، صہبا لکھنوی، محمد علی کی بیگم ثریا، آصف اور اُس کی بیوی سیما اور چھوٹے چھوٹے بچے جن کے ساتھ کرکٹ کے اسکور پر بحث کرنے میں بہت لطف آیا۔۔۔

دُکھ

آدمی ناقابلِ تقسیم اکائی ہے

۱۴

۲۸ فروری کو صبح جاگا تو محمد علی صدیقی کمرے میں موجود نہیں تھے۔ وہ ذرا جلدی اُٹھے اور مکان کے زیریں حصے میں چلے گئے تھے۔ میں کھڑکی کھول کر اُن پہاڑیوں کو دیکھنے لگا جن کے دامن میں نارتھ ناظم آباد کا علاقہ بسایا گیا تھا۔ دھوپ بہت آہستہ آہستہ سُرخ و سفید مٹیلی پہاڑیوں اور سیمنٹ کے دو منزلہ، سہ منزلہ مکانوں کی چھتوں پر اُتر رہی تھی۔ ٹی وی کے انٹینا چمک رہے تھے اور سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آ رہی تھی۔ بندھ

www.taemeernews.com

کا یہی وہ شہر تھا جو پاکستان کو عربیبین ساگر اور ایران و عرب کے ممالک سے ملاتا ہے۔ صدیوں پہلے اسی راستے سے سکندر اعظم بیمار ہو کر واپس ہوتے ہوئے راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ اسی شہر میں اُس علاقے کی وہ ساری فضا اور بو باس موجود تھی، جو محمد بن قاسم کے ساتھیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں اور عرب سوداگروں کی زبان، قصوں اور حکایتوں سے صدیوں پہلے آشنا ہوئی اور ہندوستان کے ماضی کی تاریخ، موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے دور سے نکل کر رفتہ رفتہ عربوں، ایرانیوں اور مغلوں کی تاریخ کا حصہ بن گئی۔ میرے کانوں نے سندھ کے حاکم دودو کی وہ عوامی داستان بھی سُنی جس کا ایک چھوٹا بھائی چنیسر تھا اور وہ اُس کی جگہ خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے اُس نے علاء الدین خلجی کے ساتھ مل کر سازش کی اور سالار خاں کے ساتھ سندھ پر حملہ آور ہوا۔ جنگ سے پہلے علاء الدین خلجی نے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر دودو نے اپنی بہن بھاگی کو اس کے نکاح میں دے دیا اور چنیسر کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو وہ حملہ نہیں کرے گا، لیکن دودو نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا تھا اور وہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ دودو کے آخری الفاظ کو فہمیدہ ریاض نے شیخ ایاز کے سندھی کلام سے اُردو میں اس طرح منتقل کیا ہے۔ وہ اپنے بھائی چنیسر سے کہتا ہے ؎

کچھ کہہ لے، میں نہیں مروں گا
بھیس بدل کر پھر لوٹوں گا
تو بھی چنیسر، جو کچھ چاہے
لوٹے گا مجھ سے بھی پہلے
نام نئے سے بھیس بدل کے
تیری میری جنگ ازل سے
جاری ہے اور رہے گی جاری

صبح کی چائے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کے سابق مدیر

www.taemeernews.com

پروفیسر شجاع احمد زیبا بھی مدعو تھے۔ وہ اب کراچی میں گورنمنٹ سراج الدولہ کالج کے پرنسپل ہیں۔ اور محمد علی صدیقی کے چھوٹے بھائی آصف کے خسر ہیں۔ اُن کے ساتھ علی گڑھ کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں اور خلیل الرحمان عظمی کی یادیں بھی تازہ ہوگئیں۔ ٹھیک دس بجے سہام مرزا کا ڈرائیور شاہ جی گاڑی لے کر آگیا۔ جو زیبا صاحب کو اُن کے کالج اور محمد علی صدیقی کو ڈان کی بلڈنگ میں اتار کر مجھے سہام مرزا کے گھر لے گیا۔ وہاں سہام مرزا، اُن کی بیگم رخسانہ سہام، اُن کے دو پیارے پیارے بچے اور 'دوشیزہ' کی مدیرہ رعنا فاروقی میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم سب کراچی کے ایک شان دار ہوٹل شیزان میں لنچ کے لئے گئے۔ وہیں رعنا فاروقی نے فریدہ کو بھی آنے کے لئے کہہ رکھا تھا۔ جو تبت سنٹر میں اے ٹی فوڈز انڈسٹریز کے آفس میں ملازم تھی۔ وہ بھی ٹھیک ایک بجے وہاں پہنچ گئی۔ کھانے کی میز پر رعنا فاروقی مجھ سے کرید کرید کر باتیں پوچھتی رہی، لاہور اور میاں والی کے سفر کے بارے میں، اس کی زیادہ تر دلچسپی میرے میاں والی کے گھر سے تھی کہ میں وہاں اپنے بچپن کے زمانے میں کیسے رہتا تھا، کس کس کی گود میں کھیلتا رہا، میری یادداشت کا سفر کس عمر سے شروع ہوتا ہے، مجھے سب سے پرانا واقعہ کون سا یاد ہے۔ میں نے نوعمری کا زمانہ کون کون سی لڑکیوں کے ساتھ گزارا۔ کسی کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا ہوا تھا کہ نہیں؟ میں شرارتی واقع ہوا تھا یا شرمیلا۔ کیا کبھی لڑکیوں کو چھیڑنے کی بنا پر کسی بزرگ کے ہاتھ پٹا تھا؟ میری ماں اور دادی کی شکلیں کیسی تھیں۔ اپنے گھر سے میں نے جب مٹی اُٹھائی اور دادی پر دادی کے وقتوں کا ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا چکی کا پاٹ دیکھا جو اب وہاں کسی کے مصرف کا نہیں تھا تو میرے دل کی کیفیت کیا تھی؟ اور کیا میں اپنے علاقائی دیہاتی رویّوں کو خود بھی اتنے عرصے کے بعد پہچان سکتا ہوں جو اب بھی میری کہانیوں میں کبھی کبھی لاشعوری طور پر در آتے ہیں — ؟

www.taemeernews.com

ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے، باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ فریدہ بیگم سہام مرزا کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھی اور سہام مرزا اپنے دونوں بچوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے کہ وہ کوئی پلیٹ یا گلاس نہ توڑ دیں۔ رعنا فاروقی جس قدر خوش شکل ہے اُسی طرح خوش گفتار بھی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نظریں چرانا مشکل ہو جاتا ہے —

ڈھائی بجے دوشیزہ کے آفس میں ہی ڈاکٹر ہنس راج کھیڑہ سے ملنے کا وقت مقرر ہو چکا تھا، ہم جب وہاں پہنچے تو ڈاکٹر کھیڑا، اُن کی پتنی سدرشن، امان اللہ سردار اور اُن کی بیگم وہاں پہلے ہی آ چکے تھے۔ کسی کو چوالیس سال کے بعد دیکھنا اور دیکھتے ہی پہچان لینا ایک دلچسپ تجربے سے کم نہیں ہوتا۔ وہ مجھ سے چند برس بڑے تھے۔ میں نے انھیں ۱۹۳۶ء میں آخری بار دیکھا تھا جب وہ ڈاکٹری پڑھنے کے لئے میانوالی سے لدھیانہ چلے گئے تھے۔ دوسری عالمی جنگ میں وہ فوج میں بھرتی ہو کر یورپ کے کسی محاذ پر مقیم تھے کہ جرمنوں کی قید میں پہنچ گئے۔ وہاں اُن کے ساتھ پاکستان کے سابق صدر جنرل یحییٰ خاں بھی قید تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی ہو گئی تھی۔ جب یحییٰ خاں پاکستان کے صدر بنے تو ڈاکٹر ہنس راج نے انھیں ہندوستان سے مبارک باد کا خط لکھا جسے ہندوستانی سنسر بورڈ نے خفیہ پولیس کے حوالے کر دیا اور ڈاکٹر کھیڑا کی خاصی پوچھ گچھ ہوئی، اب وہ پٹھان کوٹ سے اپنے ایک فوجی ساتھی کے والد ڈاکٹر کریم الدین سے ملنے کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے۔ امان اللہ سردار ان ہی ڈاکٹر کریم الدین کے داماد ہیں۔ ڈاکٹر ہنس راج کی بیوی نے مجھے بتایا کہ وہ میری بیوی کے ساتھ پڑھا کرتی تھیں اور وہ میرے ایک ہم جماعت ہریش چندر نکڑا کی چھوٹی بہن ہیں۔ ہریش چندر کو میں نے چند سال پہلے دہلی میں میانوالی کانفرنس میں دیکھا تھا، وہ وہاں کسی بنک کے برانچ منیجر ہیں۔ مسز کھیڑا مجھے بس ذرا ذرا سی ہی یاد آ سکیں کیوں کہ میں نے انھیں

www.taemeernews.com

بچپن میں ایک دو بار دکھا تھا، بڑھاپے نے اُن کے بچپن کے سارے نقوش مٹا دیئے تھے ــــ

دوشیزہ کے آفس میں شاہین مرزا، محبوب احمد خاں، اشفاق ادر شہاب الدین کے علاوہ سید محمود خادر سے بھی مل کر بہت خوشی ہوئی جو کئی سال پہلے تک حیدرآباد دکن سے ہفتہ وار برگ آوارہ نکالتے رہے تھے، اب وہ دوشیزہ ڈائجسٹ کے ساتھ منسلک ہیں۔ چار بجے مجھے ریڈیو اسٹیشن پہنچنا تھا۔ اور یہ طے ہوا تھا کہ سہام مرزا صاحب مجھے افکار کے دفتر میں وقت سے پہلے پہنچا دیں گے وہاں سے صہبا لکھنوی مجھے ریڈیو اسٹیشن لے جائیں گے، سہام مرزا کی گاڑی مجھے ساڑھے چار بجے رابسن روڈ پر لے گئی۔ دونوں لڑکیاں رعنا فاروقی اور فریدہ راستے بھر جھجھاتی رہیں۔ افکار کے دفتر میں صہبا لکھنوی کے علاوہ انجم اعظمی اور شہزاد منظر بھی میرے منتظر تھے۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر صہبا نے جملہ کسا ہندوستان میں جو سلوک عمران خاں کے ساتھ ہوا تھا اُس کا انتقام اب تم سے یہاں لیا جا رہا ہے۔ بات قہقہوں میں اُڑ گئی۔ ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو گیٹ میں داخل ہوتے ہی شکیل احمد کی بھاری بھرکم آواز کانوں میں گونج گونج گئی جو 'یہ ریڈیو پاکستان ہے' کہہ کر خبریں سُنایا کرتے تھے۔ اب اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ڈراما پروڈیوسر دینا ناتھ نے 'یہ جھوٹستان ہے' کے سیریز پروگرام میں شکیل احمد کی آواز کی اتنی کامیاب نقل پیش کی تھی کہ جنگ بندی کے زمانے میں جنگ بندی لائن کے اُس پار بیٹھے ہوئے پاکستانی فوجیوں نے بھی ہمارے فوجیوں کے سامنے اس نقلی آواز کی بارہا تعریف کی تھی۔ (۱۹۷۱ء کی جنگ میں پورے ہندوستان نے پاکستانی ریڈیو کے ایک نقال دادو لوہار کی تعریف کی تھی)۔

ریڈیو اسٹیشن پر ذکی شیرازی۔ اُن کی بیگم فاطمہ شیرازی۔ عالمی سروس کے انچارج پروڈیوسر اور اُردو کے مشہور افسانہ نگار جمیل زبیری اور عالمی

www.taemeernews.com

سرور کے یادر جعفری سے ملاقات ہوئی جو لکھنؤ یونی ورسٹی کے سابق اسٹوڈنٹ ہیں۔ ذکی شیرازی اور فاطمہ شیرازی کا تعلق بھی لکھنؤ یونی ورسٹی سے رہا ہے۔ اُن دونوں کا عشق لکھنؤ سے شروع ہوا تھا اور وہیں اُن کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ فاطمہ شیرازی کراچی میں ہندی سیکشن کی انچارج ہیں۔ جمیل زبیری کے افسانے سیدھے سادے، بیانیہ انداز کے اور بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ 'زرد پتے' شایع ہوچکا ہے جس کے بارے میں قسیلم احمد جیسے نقاد نے لکھا ہے کہ جمیل زبیری باشعور انسان ہیں اور اپنے زمانے کے انسانوں کی نفسیات اُن کے ماحول اور معاشرتی اثرات اور اپنے گردوپیش کی دنیا کے حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر کام کرنے والے مرد اور آرٹسٹ بھی ملے۔ اُن میں سے ایک نے مجھے یاد دلایا کہ اس نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے میرے کسی ڈرامے میں کام کرکے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ ذکی شیرازی نے میری کہانی 'ایک ہزار بچوں کی ماں' ریکارڈ کی اور صہبا لکھنوی نے مجھ سے انٹرویو لیا۔ اُن کے سوالات میری افسانہ نگاری کی ابتدا اور تصنیفات اور ۱۹۷۲ء میں لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا غیر مسلم اُردو مصنّفین کانفرنس کے علاوہ اُردو رسم خط اور اُردو زبان کے ہندوستان میں مستقبل کے بارے میں تھے۔

آٹھ بجے علی حیدر ملک کے گھر پر کراچی کے نوجوان افسانہ نگاروں اور نقادوں کی ایک نشست رکھی گئی تھی وہاں میرے ساتھ صہبا لکھنوی اور انجم اعظمی بھی گئے۔ علی حیدر ملک ایک نئے افسانہ نگار ہیں۔ اس نشست میں محمد علی صدیقی، شہزاد منظر، قمر ہاشمی، رحمٰن شریف، اسے خیام، ممتاز احمد خاں، منظر تپش اور مظفر الہدیٰ بھی شریک ہوئے۔ پوری گفتگو جو ٹیپ کی گئی تھی اُردو رسالوں کے مستقبل اور اُردو افسانے میں جدیدیت کے گرد گھومتی رہی۔ اُردو رسالوں کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انھیں ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہونا چاہیئے۔ صرف اسی طریقے سے ادیب اور

www.taemeernews.com

قاری کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔

رات کا کھانا 'حریت' کے ایڈیٹر انور خلیل صاحب کے گھر پر تھا۔ جس میں میرے علاوہ محمد علی صدیقی، صہبا لکھنوی اور انجم اعظمی شریک تھے۔ اور ہم بڑے سکون سے ہندوستان اور پاکستان کے ادب، صحافت اور عوام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہندوستان کی طرح وہاں بھی بجلی نے دھوکا دیا۔ اور ہم نے سارا وقت موم بتیوں کی روشنی میں گزارا۔ خلیل صاحب ایک مدت سے ہندوستان نہیں آسکے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ کبھی دہلی اور دوسرے شہروں میں آئیں۔ انھوں نے ہندوستان کے روزنامہ اُردو اخبارات کے ساتھ تبادلے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ دونوں ملکوں میں شرحِ ڈاک اس قدر زیادہ اور ڈاک کی ترسیل کا سلسلہ اتنا ناقص ہے کہ اس سے صحافی برادری کو ایک دوسرے کے خیالات جاننے میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔

کراچی میں یہ تجربہ پہلی بار ہوا کہ محمد علی صدیقی اور میں آدھی رات کے وقت ٹیکسی کی تلاش میں کافی دور تک پیدل چلتے چلے گئے۔ سڑکیں بہت چوڑی تھیں۔ بیچوں بیچ ڈوائڈر بنے ہوئے تھے۔ بجلی کی بے شمار نیون لائٹس نے دن کا سا سماں بنا رکھا تھا۔ دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ دو منزلہ، سہ منزلہ اور کئی کئی تو اس سے بھی زیادہ منزلوں کی۔ بڑی بڑی رہائشی بلڈنگوں کے نیچے بزنس اسٹور بھی بنا دیئے گئے تھے جو اس وقت بند تھے۔ صرف رہائشی فلیٹوں کی کسی کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی اور کہیں کہیں سے میوزک کی آواز آرہی تھی۔ بمبئی کی طرح اس شہر کی بلند و بالا عمارتوں پر بھی بڑے بڑے بنکوں، کارخانہ داروں اور تاجروں کی اجارہ داری ہے۔ یہاں بھی بسوں، موٹروں اور بھاری سازو سامان سے لدے پھندے ٹرکوں کی ریل پیل رہتی ہے۔ انجم اعظمی نے اسی شہر کے سمندر کی لہروں کی مانند رواں دواں عوام، یونی ورسٹی، کالجوں،

www.taemeernews.com

اسکولوں، دفاتر، ریڈیو اسٹیشن اور سائنس کی جدید ترین ایجادات کے حوالے سے کراچی کی حیثیت متعین کرتے ہوئے اپنے عہد کی مختلف قوموں اور معاشروں کی تصویر کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس نے اپنے اس اعتماد کا بھی برملا اظہار کیا ہے کہ آدمی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے جو قوموں، طبقوں اور ملتوں میں بٹ نہیں سکتا ــــ "زمانہ اسے قطع کرتا ہوا نہیں گزرتا ہے بلکہ وقت کی اضافیت نے اس ناقابلِ تقسیم اکائی کو نامیاتی حقیقت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ میں جب قوموں کی چالاکی اور خود غرضی دیکھتا ہوں جن کا معیار انسان کی بنیادی قدر کے بجائے جسموں کی موت سے متعین ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بحیثیت فردِ حقیر کیڑے کی طرح زمین پر رینگتا ہوا محسوس کرتا ہوں جو رینگ رینگ کر اپنے عہد کی پیمائش کرتا ہے اور جسم کی موت کے شدید دکھ سے ردّ و قبول کی منزلوں سے بھی گزرتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے اندر اس آدمی کی جھلک پاتا ہوں جو ابدی ہے تو مجھے اپنی ذات میں پورا معاشرہ آباد نظر آتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے جسم و جاں سے نکال کر زمین پر آباد کر دوں ــــ"

ہم سگرٹیں پھونکتے اور خاموشی سے سوچتے ہوئے دو میل اور آگے چلے گئے۔ لیکن کراچی شہر کا انت ابھی کئی میل اور دور تھا۔ وہاں تک ہمیں پہنچنا بھی نہیں تھا۔ راستے میں ہی کہیں ایک کالونی تک جانا تھا۔ اور راستے میں کچھ یک منزلہ اور دو منزلہ کوٹھیاں روشنیوں سے سجی ہوئی نظر آئیں۔ باہر لانوں میں خیمے اور کرسیاں اور صوفے بھی ایک گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہاں ہر چیز خاموش تھی۔ انسان کی کوئی جھلک تک نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا وہاں کے سارے مکین اپنی قہقہے مارتی ہوئی رنگ و بو کی دنیا کو چھوڑ کر اچانک کہیں اور چل دیئے ہوں۔ میں نے اس سکوت کا سبب پوچھا تو محمد علی صدیقی نے بتایا ــــ "یہ شادی گھر ہیں یہاں ہر چیز کرائے پر مل جاتی ہے۔ کرسیاں، صوفے، خیمے، ہال، کمرے

www.taemeernews.com

اور کھانے کا سارا ساز و سامان وغیرہ۔ یہ شادی گھر مولوی صاحبان تک کا انتظام کر دیتے ہیں۔ رہا سوال باقی انتظامات کا تو صرف آرڈر دینا ہوتا ہے اور مہمانوں کی تعداد بتانی ہوتی ہے جس کے لئے الگ الگ ریٹ لگا کر کرایہ وصول کر لیا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ خرچہ برداشت نہیں کر سکتے چپکے سے کچہری چلے جاتے ہیں اور رسول میرج کر لیتے ہیں اور ضرورت سمجھتے ہیں تو کسی اخبار کے کالم میں ایک چھوٹی سی خبر شایع کرا دیتے ہیں، فلاں کا فلاں کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا! اخباروں میں بھی مقررہ نرخ ناموں کے شادی، پیدائش اور موت کے اعلانات کے کالم مقرر ہیں۔"

ایک چوراہے پر کئی تیز رفتار اور مسافروں سے بھری ہوئی منی بسیں آئیں اور لانڈھی، کورنگی، ڈرگ روڈ، مہران وغیرہ کی طرف نکل گئیں، کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں منگھوپیر کی طرف جانے والی مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس مل گئی جس نے ہمیں ناظم آباد کے ایک چوراہے پر اتار دیا۔

۲۹ فروری کی صبح کو ناشتے کے لئے امان اللہ سردار نے مدعو کر رکھا تھا۔ جب گھر سے نکلنے لگے تو فریدہ علوی، قیوم راہی اور زیبا صاحب آ گئے۔ امان اللہ سردار صاحب خود ہی گاڑی لے کر آئے تھے۔ وہ مجھے، محمد علی صدیقی، فریدہ علوی اور قیوم راہی کو اپنے ساتھ لے کر اپنے مکان واقع ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں لے گئے۔ وہاں اُن کی بیگم، اُن کے معمر خسر ڈاکٹر عبدالکریم اور میرے ہندوستانی بزرگ ڈاکٹر ہنس راج کھیڑا اور اُن کی دھرم پتنی جو اُن ہی کے مہمان تھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ امان اللہ سردار آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے شعبۂ تعلقات عامہ کے سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم کا بیٹا بھی ڈاکٹر تھا جو ڈاکٹر ہنس راج کھیڑا کے ساتھ جرمنی میں قیدی بنا رہا تھا۔ ڈاکٹر کھیڑا اُسی

www.taemeernews.com

رفاقت کا حق ادا کرنے کے لئے اُس کے والد سے ملنے پٹھان کوٹ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ قیوم راہی اُردو کے معروف افسانہ نگار ہیں اُن کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ برسوں پہلے ہندوستان اور اُس کے بعد لاہور میں رہتے تھے۔ ناشتے کی ٹیبل پر ہم سب کسی نہ کسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سب باتوں کی ایک سمت یقیناً متعین تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خوش گوار بنے رہنے چاہئیں۔ اور یہ خواہش ہم سب کے اندر سے بے اختیار پھوٹ کر نکلتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا اس خواہش کے پورا نہ ہو پانے کے لئے کوئی اور ذمہ دار ہے۔

بزرگ ڈاکٹر عبدالکریم بات کرتے کرتے اچانک گلوگیر ہو جاتے تھے۔ اور اُن کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ اور وہ چُپ ہو جاتے تھے۔ اُنھوں نے عمر کا بیشتر حصّہ لاہور میں ایمپریس روڈ پر پریکٹس کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اب وہ اپنی بیٹی کے پاس کراچی میں مقیم ہیں۔ ہم لوگ وہاں سے نکل کر جب تک ڈاکٹر عبدالکریم کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر ہماری خیریت کی دعائیں مانگتے رہے۔ ایسے مشفق اور نیک بزرگ کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آتا رہا کہ وہ اپنی نسل کے آخری نمایندہ ہیں۔

ایک بجے اُردو کے مشہور دانش ور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مکان پر لنچ کے لئے مدعو کر رکھا تھا۔ ہمیں وہاں تک لے جانے کے لئے صہبا لکھنوی اور جون ایلیا آ گئے تھے۔ زاہدہ بخار میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے نہیں آ سکی تھی۔ وہاں میری ملاقات اُردو کے بزرگ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی، غلام عبّاس، رضیہ فصیح احمد، تقی حسین خسرو، کامل القادری، ابن الحسن اور اُن کی بہن نکہت حسن۔ مشہور محقق مشفق خواجہ، حسن عابد، انجم اعظمی، ریاض صدیقی، سید انور، نذر الحسن صدیقی۔ خالدہ سراج کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی بیگم اور اُن کے بچّوں سے بھی

www.taemeernews.com

ہوئی۔ ابوالفضل صدیقی صاحب کا تعلق بدایوں سے ہے۔ اُنھوں نے لاتعداد افسانے لکھے ہیں اور صاحب طرز افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہوئے ہیں، اس وقت وہ پینسٹھ سال سے اوپر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کے چہرے پر بے پناہ جذباتیت نمایاں ہوگئی اور اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں کیونکہ میں اُن کے سابق وطن اُتر پردیش میں رہتا ہوں۔ میں جتنی دیر اُن کے پاس بیٹھا رہا وہ بدایوں، بریلی اور لکھنؤ کا ہی ذکر کرتے رہے۔ اُن کا قد خاصا لمبا ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح سفید ریشمی شیروانی، سفید ٹوپی، آدھے ارض کا کڑکڑاتا ہوا پاجامہ اور پاؤں میں کالے پمپ شو پہنے ہوئے تھے۔ جس کا ذکر وہ اپنی خود نوشت داستان میں بھی کر چکے ہیں۔ غلام عبّاس صاحب بھی پینسٹھ سال کے ہو چکے ہیں۔ درمیانہ قد، بشرٹ اور پینٹس پہنے ہوئے چہرے پر شفیق مسکراہٹ اور اس اعتماد کی جھلک بھی کہ وہ اُردو کو ایک لازوال افسانہ "آنندی" دے چکے ہیں۔ جس کا برصغیر کی متعدد زبانوں کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے لیکن اُنھوں نے اس کے علاوہ بھی کئی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ جن میں "اوورکوٹ" قابل ذکر ہے۔ ان کے دو ایک افسانوی مجموعے ہندوستان میں اُن کی اجازت کے بغیر شائع ہو چکے ہیں جن کے بارے میں وہ مجھ سے پوچھتے رہے۔

رضیہ فصیح احمد کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "آبلہ پا" اُن کا مشہور ناول ہے جس پر رائٹرز گلڈ نے آدم جی پرائز دیا تھا۔ "یاسمین"، "اک جہاں اور بھی ہے"، "انتظار موسم گل"، "متاعِ درد"، "آزارِ عشق"، "تیتی چھاؤں"۔ اُن کے دوسرے ناول ہیں۔ انھوں نے ش۔ ف۔ خ کے سفر نامہ "نئی دنیا پرانی دنیا" کا بہت ہی خوب صورت دیباچہ لکھا ہے۔ پاکستان میں سفر نامہ نگاری اس وقت اپنے عروج پر ہے، اس کو باقاعدہ صنفِ ادب بنانے اور اس میں کمال حاصل کرنے کی

www.taemeernews.com

کوشش میں ہر وہ شخص مصروف نظر آتا ہے جسے بیرونِ پاکستان یا اندرونِ پاکستان بھی گھومنے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین، مستنصر حسین تارڑ، ابن انشا، جمیل الدین عالی، محمد کاظم، ڈاکٹر محمد اجمل، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، عطاء الحق قاسمی، شریف فاروق، فضل حق شیدا، احسان بی اے، عبداللہ ملک، حمزہ فاروقی، محمد اختر مونکا، رضیہ فصیح احمد، محمود شام، منو بھائی، ذوالفقار احمد تابش، حسین شاہد، پرتو روہیلہ، وغیرہ اہلِ قلم نے اس میدان میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ان سے پہلے بھی کئی ادیب سفرنامے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان میں جدید دور میں اس سلسلے میں صرف احتشام حسین مرحوم کے 'ساحل اور سمندر' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس صنف کو سیاحت نامہ اور افسانے کی ملاوٹ قرار دیتے ہیں۔ میرزا ادیب اسے واقعاتی نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ افسانوی ڈھنگ کی قلب کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی ایک ایک لمحے کی روئیداد کا نام دیتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی کے نزدیک سیاحت نامے میں مصنف کے مشاہدات و تجربات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کی ذات بھی شامل رہنی چاہیئے، عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں کہانی نگار ایک وسیع تر آزادی میں اپنا ہنر دکھاتا ہے اس کے کردار اور وہ منظر جس میں وہ حرکت کرتے ہیں، سب کچھ اس کے تخیل سے حقیقت بنتے ہیں، جب کہ سفرنامہ نگاری ایک گہرے احساسِ توازن کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈاکٹر انور سدید سفرنامے کی ادبی حیثیت کو اس طرح متعین کرتے ہیں۔ کہ اس کا شمار ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے اور اس میں آپ بیتی کا وافر عنصر شامل ہے۔ سفرنامے میں چوں کہ چشم دید واقعات اور دیکھے ہوئے مناظر پیش کیے جاتے ہیں اس لئے سفر اس کی ایک اساسی شرط ہے، سفر کے ساتھ اَن جانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے، اس لئے سفرنامے میں تحیر کا عنصر

www.taemeernews.com

فطری طور پر شامل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے کے حوالے سے اس حقیقت کی بھی نشاں دہی کی ہے کہ بیسویں صدی میں سفرنامہ صرف مشاہدات اور واقعات کا بیانیہ نہیں رہا، بلکہ یہ کسی حد تک سفرنامہ نگار کے ذاتی رجحانات کا آئینہ دار بھی بن گیا۔ اور یوں سفرنامے نے ترقی کی طرف ایک ایسا قدم بڑھایا جس سے اس صنف میں تنوع، گوناگونی اور رنگی پیدا ہو گئی ـــ

ش۔ فرخ کے سفرنامے میں لندن کی روایت پسندی، اور امریکی زندگی کا جدید میکانکی رویہ اور ان کے ساتھ ساتھ دونوں دنیاؤں کے بے شمار کردار اپنی اپنی کہانیاں لئے ہوئے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن ان میں ایک دلچسپ کہانی خود مصنفہ کی بھی ہے جب اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو لاکاساگرانڈے کے قلعے میں دیکھ کر ایک سیاح پوچھ بیٹھتا ہے ـــ "کیا آپ دہلی سے آئے ہیں؟" تو بہ قول مصنفہ۔ "ہماری پارٹی کے افراد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اُن کی ہتک کر دی ہو۔" ہم سب تنک کر بولے ـــ "جی نہیں ہم پاکستانی ہیں"۔ پاکستانیوں کی عالمی سطح پر اپنی شناخت کا مسئلہ آزادی سے لے کر اب تک زندہ ہے اور زیر بحث چلا آتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم نے ہمیں ایک الگ ملک کا شہری تو بنا دیا، لیکن مشترکہ لباس، زبان اور شکل و صورت پر کوئی واضح لکیر ابھی تک نہیں کھینچی جا سکی، جو کسی غیر ملکی کو اپنے آپ پہلی ہی نظر میں دکھائی دے جائے، خیر۔ میں ش۔ فرخ کے ہتک کے اس احساس کو ایک نئی قوم کی شدید جذباتیت پر بھی محمول کر سکتا ہوں جو سیاسی نفرت کے نتیجے کے طور پر وجود میں آئی تھی اور تینتیس سال گزر جانے کے بعد اب بھی کسی موقع پر اچانک باہر نکل آتی ہے ـــ

جمیل جالبی کے یہاں لنچ پر ابن الحسن سے بہت کم باتیں ہو سکیں۔ وہ اور اُن کی بہن دونوں بے حد کم گو اور سنجیدہ مگر پُروقار نظر آئے۔

www.taemeernews.com

ابن الحسن اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو ماضی اور حال دونوں پر گہری نظر اور فنی گرفت رکھتے ہوئے ہیں۔ 'بڑی بہو بیگم' اُن کا ایک ایسا افسانہ ہے جو یوپی کے جاگیرداروں کے نہ صرف کھوئے ہوئے اقتدار بلکہ اُن کے معاشرے کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی بڑی کامیابی سے احاطہ کرتا ہے اور 'ایک معمولی واقعہ' اور 'ایک اور' جیسے افسانوں میں پاکستان کے نئے معاشرے میں انسان کی بے حسی اور دفتری زندگی کی بے اطمینانی کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ تقی حسین خسرو اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جو پاکستان کے نچلے متوسط طبقے کے کلرک پیشہ لوگوں کی روزمرہ کی زندگی پر جدید حسیت کے ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق۔ ادب میں کیا کہا گیا' کی اہمیت مسلم مگر 'کیسے کہا گیا' ہی سے ادیب کا تشخص ممکن ہے تقی حسین خسرو نے تجسم، علامت اور حرفِ مکرر جیسے افسانے بالکل نئے انداز سے لکھے ہیں اور انھیں بجا طور پر دفتری بابوؤں کے طرزِ فکر کا نباض کہا جا سکتا ہے۔ اُردو کے جدید نقاد محمد علی صدیقی نے بھی اُنھیں نئے دور کا ادیب قرار دیا ہے۔

اُس ماحول میں دیوار پر ایک معمر خاتون کا ایک بہت ہی خوب صورت پورٹریٹ آویزاں تھا جس کی طرف میری نظریں بار بار اُٹھ جاتی تھیں اور جب میں اچانک اُٹھ کر اُس پورٹریٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تو جمیل جالبی بھی اپنے ساتھ ایک ہرے رنگ کی قمیص شلوار اور دوپٹے والی ایک خاتون کو

www.taemeernews.com

لے آئے اور بولے — "یہ ہیں اِس پینٹنگ کی مصوّرہ خالدہ سراج!" اور اُسے دیکھ کر مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ کیوں کہ مجھے تجربہ تھا کہ اچھی پینٹنگز کے خالق عموماً ایسی ہی سنجیدہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں —

دہر

www.taemeernews.com

ذہنی ہجرت — نظریاتی اساس

(۱۵)

جمیل جالبی کے یہاں ایک بات مجھ پر یہ منکشف ہوئی کہ دوری کے کارن رشتے ٹوٹتے نہیں بلکہ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ کراچی میں میری زیادہ تر ملاقاتیں ہندوستان کے مہاجروں سے ہو رہی تھیں۔ ہر محفل ہر اجتماع میں وہی ملتے تھے۔ بلکہ ساری تقریبات کا اہتمام کرنے والے وہی ہوتے تھے۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کے ہر علاقے سے جا جا کر وہاں بس گئے ہیں۔ لیکن میرے لئے پنجاب کی فضا اجنبی ثابت ہوئی نہ ہی کراچی

www.taemeernews.com

کی. مغربی پنجاب میں جا کر بسنے والے بیشتر مہاجر مشرقی پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں. یہ تعلق سراسر جذباتی ہے اور بے حد فطری بھی. لیکن وہ سب اب ایک نئی مملکت کے شہری ہیں. نئی مملکت نے اُن کے سامنے نظریاتی. سیاسی، جغرافیائی، مذہبی اور ثقافتی شناخت کے مسائل پیدا کر دیئے ہیں. لیکن یہ مسائل شدید قسم کی کشمکش کے حامل نہیں ہیں. صرف دانش و رائے غور و فکر اور ایک نئی نظریاتی اساس بنانے کے لئے ہیں. پاکستان سے ہندوستان آ کر بسنے والے تارکین وطن کے مقابلے میں اُن مہاجرین کے مسائل زیادہ سنجیدہ ہیں اور اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے بہ قول انتظار حسین ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو بارہ بجنے کا اعلان ہوتے ہی جسمانی ہجرت نہیں بلکہ صرف ذہنی ہجرت کر لی تھی. ان سب لوگوں کے سامنے نظریاتی و ثقافتی اساس کی تلاش و جستجو کا سلسلہ اسی لمحے سے شروع ہو گیا تھا جب پاکستان وجود میں آ گیا تھا. اس قسم کے مسائل میں میری دلچسپی اس وجہ سے ہے کہ میں اپنے سابق وطن کو ایک ٹھوس نظریاتی چٹان پر کھڑا دیکھنا چاہتا ہوں. میں اپنے ملک کے ان ہزاروں لوگوں کی طرح سطحی انداز سے سوچنے کا حامی نہیں ہوں جو پاکستان کے اس قسم کے مسائل کو طنزیہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی بن چکے ہیں. یہ انداز نظر احترام اور انسان دوستی کے جذبے سے یک سر خالی ہوتا ہے، جس روحانی اور جذباتی تجربے سے ہمارے کل کے ہم وطن گذر رہے ہیں اُسی تجربے سے ہمارے آباؤ اجداد بھی صدیوں پہلے گذرے تھے، لیکن ہم اُس ماضی کو یک سر فراموش کر چکے ہیں. درحقیقت اپنے ماضی سے برتی جانے والی یہی سرد مہری ہمارے اندر ایک نئے تجربے کو فوری طور پر قبول کر لینے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

جمیل جالبی نے "پاکستانی کلچر" کی تلاش پر ۱۹۶۴ء میں ایک کتاب چھپوائی تھی. حال ہی میں اُس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے. اس

www.taemeernews.com

کتاب پر مختلف رسالوں اور اخبارات میں کئی بحثیں چھپ چکی ہیں۔ جمیل جالبی آزادی، تہذیبی مسائل اور تضاد کے باب میں رقم طراز ہیں:۔

"آزادی کے بعد ہم سب نے محسوس کیا کہ ہمارے پاس کوئی تہذیبی سرمایہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم اس چیلنج کو قبول کر سکیں جو آزادی اپنے ساتھ لائی ہے۔ "مروّجہ" مذہب کا اخلاقی و تہذیبی سرمایہ بہ ظاہر ہمارا ساتھ دینے کے باوجود اپنی چمک دمک گنوا رہا ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے سارے جذبات "اجتماعی" تھے۔ آزادی کے بعد اجتماعی جذبات کا رنگ روپ اُڑنے لگا۔ اور معاشرے کی ہر سطح پر یہ احساس شدّت کے ساتھ اُبھرنے لگا کہ آخر وہ کون سے عناصر ہیں جن کے ذریعے ہم یک جہتی اور حقیقی اتحاد حاصل کر کے ایک قوم بن سکتے ہیں۔ ہمارا تہذیبی سرمایہ کیا ہے؟ ہماری فکر اور ہمارے خیال کے کون سے راستے ہیں؟۔ تہذیبی اعتبار سے پاکستان ایک خلا کے ساتھ وجود میں آیا تھا۔ سنہ سینتالیس تہذیبی اعتبار سے ایک ایسے واضح خط کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں سے ہمیں اپنے مسائل و افکار پر پھر سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

'کلچر کیا ہے' کے باب میں وہ کہتے ہیں ــــ "کلچر کا لفظ مختلف موقعوں پر آتے مختلف معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ کہ اس لفظ کے ساتھ ہر معاشرے کے اتنے بہت سے بنیادی مسائل وابستہ ہیں کہ اس لفظ کے معنی ہی مبہم ہو گئے ہیں ــــ اسے آپ خوشبو کی طرح سونگھ سکتے ہیں، ہوا کی طرح محسوس کر سکتے ہیں، لیکن اشیا کی طرح اس کی کوئی تصویر نہیں بنا سکتے ــــ کلچر کے سلسلے میں اب تک ہمارے ہاں دو لفظ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ان میں ایک لفظ 'تہذیب' ہے اور دوسرا لفظ "ثقافت" ہے۔ تہذیب کا لفظ صدیوں سے نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی و فارسی میں مستعمل ہے۔ عربی زبان

www.taemeernews.com

میں لفظ تہذیب کے لغوی معنی ہیں درخت تراشنا، کاٹنا اور اس کی اصلاح کرنا۔ فارسی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں، آراستن و پیراستن، پاک و درست و اصلاح نمودن۔ یہ لفظ مجازی معنی میں شائستگی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار، اور کردار کی شائستگی شامل ہے ـــ کلچر اس ذہنی، مادی، خارجی طرز عمل کے اظہار کا نام ہے جو باضابطگی کے ساتھ معاشرے کے افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ کلچر کے ذیل میں انسانی سرگرمیوں کے سارے بنیادی ادارے مثلاً مذہب، سیاست، معیشت، فنون، سائنس، تعلیم اور زبان وغیرہ آجاتے ہیں ـــ کلچر کے ذریعے انسان اپنے طرز عمل کا اظہار کرتا ہے، لیکن زندگی میں اس نوع کے طرز عمل کا اظہار ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں مثلاً خیالات، افکار، تجربات اور معیار وغیرہ ایسی ہیں، جنھیں ہم صرف طرز عمل کے ذیل میں نہیں لا سکتے۔ وضاحت کے لئے مذہب ہی کو لیجئے۔ مذہب میں ایک طرف عقائد شامل ہیں اور ساتھ ساتھ مذہبی تجربات اور مذہبی رسوم بھی اور پھر سائنس میں علم بھی شامل ہے اور ساتھ ساتھ وہ سرگرمیاں بھی جو اس علم کو حاصل کرنے کا وسیلہ بنتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے طرز عمل سے نہیں، بلکہ ہمارے طرز احساس اور طرز فکر سے تعلق رکھتی ہیں ـــ"

تاریخ کے تناظر میں جمیل جالبی اکبر کے دور کو کلچر کے پھیلنے اور بڑھنے کا دور کہتے ہیں۔ جہاں گیر کے عہد میں خیال کے ارتقا کو اور زیادہ واضح پاتے ہیں۔ شاہ جہاں کے زمانے میں خیال کو صیقل شدہ شکل میں اپنے عروج پر پہنچا ہوا پاتے ہیں۔ لیکن ادب، آداب، رسم و رواج، ضرب اوقات، علم و سائنس، لباس وغیرہ میں جو ہر طبقے نے ایک ہی ڈھنگ سے اپنا لئے تھے، رُکا ہوا اور یکسانیت کا حامل بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد اورنگ زیب کے آتے آتے خیال کو نئی نئی شکلیں بنانے سے عاری مان

www.taemeernews.com

لیتے ہیں کیوں کہ وہ خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ جمیل جالبی پاکستانی قومیت کی ایک شخصیت نہ بن سکنے کی ذمہ داری اس کے اپنے عدم اعتماد پر ڈال دیتے ہیں اور اس کے لیے امریکہ سے اتحاد اور اپنی ذات پر بھروسا نہ کرنے کی بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امریکی امداد نے ہماری قومی شخصیت کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ ہمارے اندر یہ احساس مر گیا کہ قومی مسائل مشترکہ کوشش سے ہی حل ہو سکتے ہیں۔"

پاکستان کا ایک اور دانش ور منیر احمد شیخ اپنی کتاب "تہذیبی رویے" کے ایک باب "ثقافتی ورثے کی اہمیت" میں وہیلر کی کتاب 'پاکستان کے پانچ ہزار سال' کے حوالے سے ٹیکسلا، موہن جوڈارو، ہڑپا اور کوٹ دیجی کو اپنی تاریخ کی مختلف کڑیاں سمجھتا ہے اور ان تہذیبوں کے خالقوں کو اپنے آباؤ اجداد مان کر یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ ناخن کو گوشت سے جُدا کرنا کہاں کی انسانیت ہے؟ "پہلے تو صرف ہندو اور مسلمان کلچر کا جھگڑا تھا اب یورپ اور خاص کر امریکہ چور دروازے سے اس طرح گھس آیا ہے کہ اب ہمارا اسلام تبرک کے طور پر گفت و شنید اور احترام تک محدود ہو گیا ہے۔ اور اسلام کے حوالے سے فکر و نظر کے جو نئے پیمانے نصیب ہوئے تھے وہ عملی زندگی سے بالکل عنقا ہوتے جا رہے ہیں اور اصل کلچر تو وہی ہے جو ہماری زندگی میں سانس لیتا ہے۔ اگر میں ثقافت کی اس توجیہ کو مان لوں جو ایک خاص قسم کے مذہبی علما کی طرف سے پیش کی جاتی ہے جو ایک ایسا بندھا ٹکا تصور ہے کہ جس میں سانس بھی ناپ تول کر لینا پڑتا ہے تو اس تصور سے ہی میرا دم گھٹتا ہے۔"

سفر میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنا سفر کا مزا بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن سفر میں سنجیدگی سے نہ سوچنا بھی بہت سی چیزوں سے بالا بالا گزر جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ جب تین بجے سہ پہر کے قریب مجھے یاد دلایا گیا کہ مجھے مرزا غالب لائبریری میں بھی پہنچنا ہے تو میں نے دیکھا کہ ابوالفضل صدیقی اور غلام عباس دونوں بزرگ ادیب میرے ساتھ مصافحہ کر لینے کے باوجود

www.taemeernews.com

کوٹھی کے گیٹ کے باہر تک چلے آئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں ایک عجیب سی کیفیت سے اُداس تھیں۔ میں چاہتا تھا وہ اپنی اپنی سمت میں روانہ ہو جائیں تو میں بھی صہبا لکھنوی کی موٹر میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ لیکن ہمیں یہ منزل سر کرنے میں کافی دیر لگ گئی ــــ

غالب لائبریری میں کراچی رائٹرز گلڈ کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ جس کا اہتمام عبید اللہ علیم نے کر رکھا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اُسی جگہ مرزا ظفر الحسن صاحب کے ساتھ بھی ایک الگ میٹنگ مقرر تھی۔ جب تک مرزا صاحب آتے "نوائے وقت" کے ادبی صفحے کے ایک قلم کار سلیم فاروقی صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔ اور جلدی جلدی کچھ سوالات پوچھنے لگے۔ اُردو زبان کا تہذیبی کردار کیا ہے؟ ہندوستان میں اُردو زبان کی موجودہ قومی حیثیت۔ لکھنؤ میں اُردو کی حمایت میں ۱۹۷۳ء کی کُل ہند غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس۔ اُس میں شرکا کے نام اور قراردادیں۔ میری افسانہ نگاری کے نئے مسائل و موضوعات، ہندوستان میں اُردو افسانہ نگاری کے نئے نام، دونوں ممالک کے درمیان کتب و رسائل کے تبادلے اور خرید و فروخت کے لئے ایک تجارتی معاہدے کی ضرورت وغیرہ۔ ابھی ہماری گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ مرزا ظفر الحسن آ گئے اور مجھے اپنے دفتر میں لے جا کر بند کر دیا۔ میرے سامنے ٹیپ آن کر کے یہ کہہ گئے کہ میں تب تک اپنے بارے میں بولتا رہوں، جب تک وہ باہر سے دروازہ نہ کھولیں۔ یہ ایک بے حد صبر آزما کام تھا۔ لیکن چوں کہ باہر نکلنے کے لئے اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اپنی ذاتی زندگی، شروع کی ادبی جد و جہد، لاہور کے آزادی سے پہلے کا ادبی ماحول اور تقسیم ہند کے بعد لکھنؤ میں اپنی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں تقریباً ایک گھنٹے تک کہیں بڑے ربط سے کہیں کہیں بڑی بے ربطی سے بولتا رہا۔ اس دوران مرزا صاحب دو ایک بار دھیرے سے اندر آئے اور میرے سامنے

www.taemeernews.com

کوکا کولا اور سگریٹ رکھ کر چلے گئے۔ یہ ریکارڈ اُن کی لائبریری میں محفوظ کر لیا گیا ہے ــــ

جب میں ہال میں داخل ہوا تو وہ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ اور اِدھر اُدھر سے بھی مزید کرسیاں لائی جا رہی تھیں۔ سامنے کی قطار میں ابوالفضل صدیقی صاحب پھر دکھائی دیئے۔ اُن کے چہرے پر اندر ہی اندر ٹوٹنے اور جُڑنے کی کیفیت ابھی تک موجود تھی۔ پروفیسر ممتاز حسین بھی تشریف لے آئے تھے جو اُردو ادب میں مارکسسٹ نقاد کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں اور تنقید و تحقیق دونوں میں اپنا سکہ منوا چکے ہیں۔ رائٹرز گلڈ کے سکریٹری عبیداللہ علیم نے اپنے مخصوص انداز میں میرا تعارف پیش کیا۔ اور صدارت کے لئے اُردو کے مشہور نقاد سلیم احمد کا نام تجویز کیا۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ میری افسانہ نگاری پر سلیم احمد کے علاوہ حمایت علی شاعر، پروفیسر انجم اعظمی، اور شوکت صدیقی نے کچھ تفصیلی باتیں کہیں۔ شوکت صدیقی اور حمایت علی شاعر سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، شوکت صدیقی میرے ہم عصر افسانہ نگار اور معروف ناول نگار ہیں۔ آزادی کے بعد اُنھوں نے لکھنؤ سے ایک رسالہ 'مندر' کے نام سے نکالا تھا جس کے سال نامے میں اُنھوں نے میرا ایک طویل افسانہ "ایک عورت تھی علاجِ غمِ دُنیا تو نہ تھی" شایع کیا تھا۔ اُن دنوں میں بنارس میں رہتا تھا۔ میں نے اُن کے اور اپنے افسانوں میں جو قدر مشترک پائی تھی وہ دونوں طرف کے مہاجرین کی آبادکاری نو کے مسائل تھے یہ پانچویں دہائی کے زمانے کی بات ہے۔ اُسی زمانے میں شوکت نے 'پھر تے ہیں میر خوار' اور 'جھونا' جیسے معرکہ آرا افسانے لکھے تھے۔ اُن کے ناول 'خدا کی بستی' پر آدم جی پرائز بھی دیا گیا تھا۔ لیکن اُسی ناول کو جب کراچی ٹی وی پر دو مرتبہ قسط وار پیش کیا گیا تو انھیں اتنا معاوضہ مل گیا جس سے وہ نارتھ ناظم آباد میں اپنا مکان تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

www.taemeernews.com

ہم ہندوستانی ادیب ابھی اس قدر معاوضے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب کہ ہمارا ملک پاکستان سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ حمایت علی شاعر میرے لئے دو نادر کتابوں کا تحفہ بھی لے آئے۔ ایک تو مجنوں گورکھ پوری کی "غالب شخص اور شاعر" تھی جس کے بارے میں خود مجنوں صاحب کا ارشاد ہے "غالب کی غیر فانی شخصیت اور ان کے اثر کی ہمیشگی کا قیاس اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ روح دہر لے کر پیدا ہوئے تھے۔ غالب کے تصور کے ساتھ ورڈسورتھ، گوئٹے، شیلی اور ڈہمین کی یاد کچھ فطری ائتلاف کے طور پر آ جاتی ہے۔ انہی متفکر شاعروں کی طرح غالب کا تخلیقی نفس انفرادی اور مقامی سے گزر کر آفاقی اور آفاقی سے گزر کر کائناتی پہنائی اور گہرائی رکھتا تھا۔ دنیا کی کسی ترقی یافتہ اور مہذب زبان میں اس زبان کے کردار اور ناموس کو قائم رکھتے ہوئے غالب کے کلام کو منتقل کر دیا جائے تو وہ اس زبان کے لئے نیا انکشاف ہوگا ـــ" دوسری کتاب فہمیدہ ریاض کی سندھی کے مشہور و معروف شاعر شیخ ایاز کے منتخب کلام کا اُردو میں منظوم ترجمہ "حلقہ مری زنجیر کا" تھی ـــ

اس جلسہ میں مَیں نے اپنی تقریر میں اپنی اس محرومی کا اعتراف کیا کہ میں اس ملک کو جو کل تک میرا وطن تھا، اب اپنا وطن نہیں کہہ سکتا۔ قانون نے یہ حق چھین لیا ہے اور اس وقت میں دور دراز سے جو سفر کر کے یہاں آیا ہوں یہ اسی دن سے جاری ہو گیا تھا جب میں یہاں سے سرحد کے پار چلا گیا تھا۔ شاید یہ سفر یہاں واپس آنے کے لئے ہی شروع ہوا تھا۔ میں اپنے شایان شان خیر مقدم کے لئے اس قدر جذباتی ہو چکا تھا کہ میری زبان سے بہ مشکل تمام وہ سب کچھ ادا ہو رہا تھا جو در اصل میرے دل میں تھا۔ اس قسم کی خیر مقدمی تقریبوں کا میں عادی بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ فطری طور پر بھیڑ بھاڑ سے گھبراہٹ محسوس کرتا ہوں۔

۔ پاکستان میں مجھے ہر جگہ دوستوں کی بھیڑ مل رہی تھی۔ میں نے اپنی

www.taemeernews.com

افسانہ نگاری پر تبصرہ کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، میں اپنے افسانے سیدھے سادے انداز میں لکھتا ہوں اور اپنی وہی زبان استعمال کرتا ہوں جو روزمرہ بول سکتا ہوں: شوکت صدیقی نے میرے افسانوں کے بارے میں ایک خبر پر مبنی یہ بات کہہ دی تھی کہ اب میں بھی علامتی افسانے لکھتا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں وضاحت کی کہ علامت تخلیق کار کا شعوری عمل نہیں ہوتی۔ یہ اپنے آپ کسی نہ کسی شکل میں کہانی میں آکر بیٹھ جاتی ہے، یہ کام دراصل قاری کا ہوتا ہے کہ وہ کس علامت سے کون سے معنی لیتا ہے۔ میں نے اعتراف کیا کہ میں خود اپنے سارے لکھے ہوئے افسانوں سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی افسانہ نگاری کا بیشتر حصہ مسترد کر دوں اور اس کام میں میرے قارئین بھی مدد کر سکتے ہیں۔ میرا تخلیقی منبع درحقیقت زندگی کی مختلف سطحوں پر مسترد ہوتے رہنے میں ہی مضمر ہے۔ کچھ چیزیں میں خود بھی مسترد کرتا رہا ہوں ــــ

اس جلسے میں مجھ سے غالب جریدے میں چھپا ہوا میرا ایک افسانہ 'تابوت' بھی سنا گیا اور جلسے کے اختتام پر مرزا ظفر الحسن کی اپیل پر غالب جریدہ کی بچی ہوئی دو ڈھائی سو کاپیاں میرے دستخطوں کے ساتھ فروخت ہو گئیں۔ میرے لئے خوشی کا ایک بڑا لمحہ یہی تھا کہ میں اسی بہانے اپنے قارئین سے براہِ راست مل رہا تھا۔ لیکن اس کام میں ایک گھنٹے کے قریب اور گذر گیا۔ اس جلسے کے بعد میرے کانوں میں کچھ لوگوں کے درمیان تلخ کلامی کی بھنک پڑی، جس کا سبب بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میرے میزبان محمد علی صدیقی نے مجھے قید کر رکھا ہے اور وہ مجھ سے کسی کو ملنے نہیں دیتے۔ یہ امر سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا۔ میرے پاس جتنا وقت تھا اسی کے اندر میں ہر ایک سے ملنے کا متمنی تھا۔ کچھ لوگ مجھے ایک ماہ کے لئے مزید ویزا دلوانے کی پیش کش کر رہے تھے۔ لیکن میرے گھریلو حالات اس کی اجازت نہیں دے

www.taemeernews.com

رہے تھے۔ اسی تقریب میں میری ملاقات کتنے ہی نئے ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی۔ یہ لمحے بھی میرے لئے بڑے مسرت افزا تھے۔ بلکہ میں انھیں لمحوں کا منتظر تھا۔ احمد ہمیش سے برسوں پہلے دہلی میں صرف چند منٹ کے لئے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا ادبی سفر شروع ہی ہوا تھا۔ اب تو وہ نئی نسل کا میر کارواں بن چکا ہے۔ اور ۱۹۴۲ء میں چھپی کرشن چندر کی کتاب 'نئے زاویے' اور ۱۹۶۷ء میں شمس الرحمان فاروقی کی کتاب 'نئے نام' کی طرز پر اُس نے بھی عہد حاضر کی بہترین کہانیاں چھاپ کر اپنے دور کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس منتخب مجموعے میں نئی ہندوستانی نسل کے دوش بہ دوش پاکستان کے انور سجاد، انتظار حسین، اسد محمد خاں، اعجاز راہی، خالدہ حسین، رشید امجد، زاہدہ حنا، طاہر مسعود، فہیم اعظمی، محمد سلیم الرحمان، مسعود اشعر، محمد عمر میمن، نگہت رضوی، نزہت رضوی اور خود احمد ہمیش کے افسانے شامل ہیں۔ کوشش اچھی ہے لیکن اگر اس میں صرف ۱۹۶۰ء کے بعد اُبھرنے والوں کے نام ہوتے تو نئے ذہن کو سمجھنے میں کام آسان ہو جاتا۔ ہندوستان میں یہ کوشش 'معیار' کے ایڈیٹر شاہد ماہلی نے بھی کی ہے اور انھوں نے ہمیں نئے شعرا کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں میں اکرام باگ، انور خاں، انیس رفیع، انور قمر، حمید سہروردی، حسین الحق، رضوان احمد، ساجد رشید، کنور سین، قمر احسن، عبدالصمد، شفق، سلام بن رزاق، شوکت حیات، مظہر الزماں خاں اور م ق خان کی تخلیقی کاوشوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ ایسے ہیں جو بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کو بھی اب ماضی کا حصہ قرار دینے لگے ہیں۔ اس محفل کے علاوہ ذکی شیرازی کے یہاں چائے پر محمد علی صدیقی، محسن بھوپالی، جمال احسانی، شکیل فاروقی، نواب بیگ طالب بھی تھے۔ میری ملاقات احمد ہمیش، ریحان صدیقی، حسن عابد وغیرہ سے بھی ہوئی۔ بعد میں امراؤ طارق اور نگار صہبائی سے بھی ملاقات ہوئی۔

www.taemeernews.com

امراؤ طارق بھی پاکستان کا نیا افسانہ نگار ہے۔ 'بدن کا طواف' اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی۔ شوکت صدیقی اور جیلانی بانو نے اُن کے افسانوں کے بارے میں قابل قدر آرا دی ہیں۔ وہ ٹوٹتی اور بنتی ہوئی اقدار کا ایک نیا اقدار شناس فن کار ہے۔ فردوس حیدر ماضی اور حال دونوں پر ایک فن کارانہ گرفت رکھتی ہیں اُن کے ذاتی مشاہدے میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے وہ خطے بھی اپنے احساسات کے دامن پھیلائے رہتے ہیں جہاں پہنچنے کے لیے انھیں آسانیاں میسر ہیں شعرا میں نگار صہبائی گیتوں کی ایک ایسی روایت کا دامن تھامے ہوئے نظر آتے ہیں جو بقول سلیم احمد بھگتی تحریک میں اسلامی روایات کو جوڑ دیتی ہیں۔ انجم اعظمی نے بھی اُن کی گیت نگاری میں عرب و عجم کی روایت کے شعور، ہند کے تہذیبی آتش کدوں، زندگی کے گہرے تجربات کی آنچ کو محسوس کیا ہے۔ یوں بھی اُردو میں دوہا نگاری اور گیت نگاری پاکستان میں آج کل زیادہ ہو رہی ہے۔ اور اس میدان میں جمیل الدین عالی، تاج سعید اور نگار صہبائی پیش پیش ہیں۔ نگار صہبائی نے اپنے گیتوں کو چنتا رس، روپ دیس، رادھا نگر، آشا دوارے اور پریم بھون جیسے مختلف ابواب میں بانٹ دیا ہے ؎

کس نے سوچے یہ کرتب نرالے
نیلی چھت ہے کھڑی بن سنبھالے
دونوں پلڑے برابر بھرے ہیں
چاند سورج سفر کر رہے ہیں
تو نے موسم بنا تو دیے ہیں
جنگلوں کے عجب راستے ہیں
کوئی سمجھے تو بس یہ ہوا ہے
ایک دیپک سے سب کچھ بنا ہے

آزادی سے پہلے احمد ندیم قاسمی نے آبگینے کے نام سے اپنے

www.taemeernews.com

قطعات کا ایک مجموعہ چھپوایا تھا جو اپنی منظوم افسانیت کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ افسانیت، مغربی پنجاب کی دہقانی زندگی، اس سے متعلق دیہاتی رومانویت اور ایک نئی حقیقت نگاری بھی تھی۔ اردو ادب کا دامن ایسی طویل نظموں سے بھی خالی نہیں، جنھیں منظوم افسانوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسے شاعروں کے اندر در اصل افسانہ نگار ہی چھپا ہوتا ہے۔ جو اپنی بات کہنے کے لئے نثر کے بجائے نظم کا سہارا لے لیتا ہے۔ اگر رجحان مختصر نگاری کی طرف مائل ہو اور اسلوب اور موضوع میں بھی ندرت ہو تو یقیناً ایک نئی بات پیدا ہو جاتی ہے۔ محسن بھوپالی درحقیقت احمد ندیم قاسمی کے ہی فن و فکر کی ایک جدید توسیع ہے جس کے بارے میں خود احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے :۔

"انھوں نے مختصر نظم کے امکانات کو اتنی ناقابلِ یقین وسعتیں دی ہیں اور یہ فن کاری دکھائی ہے کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، محض کہانی سنائی ہے۔ اور یوں پڑھنے والوں کے رگ و پے میں اترتے چلے گئے ہیں" ؎

"بلیک اینڈ وہائٹ" کتنا بور ہے ممی
انا ڈنیسر تو نہ جانے کب
کلر ڈی وی کی خوش خبری سنائے گی
ہمارے "پرسنل بینچ" میں "یا ہوا لی وی
گزشتہ سال سے بے کار رکھا ہے :

محسن بھوپالی کے ایک شعری مجموعے 'نظمانے' کے بارے میں پروفیسر سحر انصاری نے دو باتوں کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے۔ ایک تو لفظ نظمانہ یا نظمانے کے بارے میں ہے کہ انگریزی میں بھی دو الفاظ کے بعض اجزا کو ملا کر ایک نیا لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ جیسے فکشن اور کرسٹینزم کو ملا کر کرکشن (CRICTION) بنایا گیا ہے اس لئے نظم اور

www.taemeernews.com

افسانے کے امتزاج سے نظمانے کا لفظ اس نئی صنفِ شعر کے لئے مناسب رہے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نظمانہ اب اس مخصوص مختصر منظوم افسانے کے لئے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ جسے محسن بھوپالی نے ایک نئی صنف کے طور پر متعارف کرایا ہے۔

دوسری بات انھوں نے محسن بھوپالی کے زبان کے انفرادی تجربوں کے بارے میں کہی ہے کہ ان نظمانوں میں بات چیت کے لہجے سے ایک شعری آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی ان کے نظمانوں کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ انھوں نے گرد و پیش کی زندگی سے زبان اخذ کی ہے اور اس میں ایکسیڈنٹ، ٹیلی فون، ایف آئی آر، ٹی وی، انٹلکچول، ریڈیو، بیگ، فرم، باس جیسے الفاظ کی شمولیت کے ساتھ ساتھ اس فطری گفتگو کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ جو ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے ؎

انجم آیا!
ٹھیک تھا آپ کا اندازہ
"دہلی کریپ" اور اتنا سستا
— کل ہی واپس کر آؤں گی
تم کہتے تھے، فارن، کا ہے
دیکھو! اس پر کیا لکھا ہے
"میڈ ان پاکستان"!

(معیار)

پروفیسر ممتاز حسین نے غالباً کلاسیکیت کو ہی مدنظر رکھ کر شریف منور جیسے نئے شاعر کے بارے میں یہ سطور لکھی ہیں۔

"اس دور میں جس میں کوئی بڑا شاعر نہیں ہے سب ہی مائینر شاعر نظر آتے ہیں اُسے ایک کامیاب شاعر تصور کیا جائے گا جس کے کلام میں مائنی کا کوئی بڑا شاعر اپنی بزرگی کا علم بلند کرتا نظر آئے

www.taemeernews.com

اسی نسبت سے ناصر کاظمی کی شاعری کو کسی قدر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابھی شریف منوّر شاعری کی نسبت سے خورد سال ہیں، لیکن وہ بھی اسی راستے پر گام زن ہیں ؎

ایک ہی روایت ہی تجربے کی سرتھ ہیں ۔۔۔ تیری خود نمائی کی اپنی خود ستائی کی
دن کا ایک اِک لمحہ رنگتا ہوا گذرا ۔۔۔ اور ابھی تو باقی ہر رات بھی جدائی کی

عذاب رفتہ و اندیشہ ہائے آئندہ ۔۔۔ ہماری طرح کوئی اور نوجوان نہ ہو
وہ آدمی بھی کراچی میں آدمی کب ہے ۔۔۔ کہ جس کے پاس سواری نہ ہو مکان نہ ہو

جون ایلیا نے اسی شریف منوّر کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ اس عذاب زدہ نسل کے فرد ہیں جو آخری 'ہاں' اور فیصلہ کن 'نہیں' کے درمیان جاں کنی کی زندگی گذار رہی ہے"۔

زاہدہ حنا اور جون ایلیا نے رات کے کھانے پر شیخ ایاز، اقبال مہدی آرٹسٹ، احمد سلیم، محمد علی صدیقی، امراؤ طارق، فردوس حیدر، ثریا نجمی، راحت سعید، فریدہ علوی، حسن عابد اور افسانہ نگار نجم نفضی کو مدعو کر رکھا تھا۔ اقبال مہدی پاکستان کے نوجوان اور مقبول آرٹسٹ ہیں۔ اُن کی پینٹنگز میں نے کئی گھروں میں آویزاں دیکھی تھیں۔ اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔ میں صادقین سے بھی ملنا چاہتا تھا جن کا مصوّر دیوان غالب کافی عرصہ پہلے کراچی سے زاہدہ حنا نے میرے لئے بھجوایا تھا۔ ان دنوں صادقین غیر ممالک کے دورے پر تھے۔ جس وقت میں فردوس حیدر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اقبال مہدی ایک طرف بیٹھے میرا اسکیچ بنا رہے تھے۔ جو انھوں نے بعد میں مجھے عنایت بھی کر دیا۔ فردوس حیدر کی باتیں غیر ملکی سفر اور ہندوستان آنے کے آیندہ پروگرام سے متعلق تھیں۔

شیخ ایاز سندھی شاعری میں ایک قدآور شخصیت کا نام ہے

www.taemeernews.com

وہ سکھر سے خاص طور پر اسی ڈنر میں مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لے آئے تھے اور اپنے ساتھ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا منظوم ترجمہ بھی لائے تھے جو انھوں نے مجھے بڑے خلوص کے ساتھ عنایت کیا۔ یہ کتاب پانچ سو ستائیس صفحات پر سندھ یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی نے شائع کی ہے۔ وہ سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اپنی کئی سندھی نظموں کا اُردو میں منظوم ترجمہ سنایا۔ وہ بنیادی طور پر مارکسسٹ ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھٹڑی کانفرنس میں بھی انھوں نے شرکت کی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنی نظموں کا ایک پنجابی ترجمہ بھی عنایت کیا۔ اسے بھی انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی نے شایع کیا ہے اور اس کے مترجم پنجابی کے نوجوان شاعر احمد سلیم ہیں۔ اس کتاب میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے پھانسی پر چڑھنے سے پہلے کے تاثرات پر ایک منظوم ڈراما بھی ہے اور شیخ ایاز کے جیل میں بیٹھ کر لکھے ہوئے مختصر منظوم نوٹس بھی۔ ایک منظوم نوٹ کو اُردو میں پیش کرتا ہوں :۔

بھٹائی!
نہ تو کنفیوشس
اور
نہ میں ماؤزے تُنگ
سندھڑی کے اوتار!
میں نے
تیری اوتاری کے سامنے
ابھی تک جبیں جھکا رکھی ہے۔

شیخ ایاز کی سندھ اور سندھی زبان سے محبت اب پاکستان کی ثقافتی تاریخ کا ایک حصّہ بن چکی ہے۔

www.taemeernews.com

اے سندھ" اگر تو بن جائے سپنا، تو میں ہنومان کی مانند، ناگاپربت کو ہتھیلی پر دھر کر لے آؤں۔

یاد رکھنا، سندھ میں میرے بعد، اگر کسی اور کے شعر زندہ رہے تو وہ، اس طرح وجود میں آئیں گے، جس طرح، گنّوں کی ایک فصل کی کٹائی کے بعد، دوسری فصل اُس کی جڑ کے ساتھ ہی اپنے آپ اُگنے لگتی ہے ــــ

جب کراچی میں کئی برس پہلے سندھی بنام اُردو ایک فساد برپا ہو گیا تھا تو اُس موقع پر سندھی اور اُردو کے حامیوں میں سمجھوتا کرانے والے یہی شیخ ایاز تھے۔ انھوں نے بتایا اُنھیں اُردو سے بھی بے پناہ محبت ہے ــــ

ہہہ

www.taemeernews.com

بستی نہ ملی پھر اپنی جیسی

۱۶

یکم مارچ کی صبح کو بہت جلدی آنکھ کھل گئی۔ رات جون ایلیا کے گھر پر رُک گیا تھا۔ بہت دیر تک زاہدہ حنا سے اُن کے نئے افسانے سنتا رہا تھا۔ زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ برٹش ویمن میں یقین رکھتی ہے۔ عورتوں کے لئے اظہار کی آزادی کی حامی ہے۔ اور اس کے لکھے ہوئے ہر ایک لفظ کے پیچھے ایک عورت کا ہی دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عبیداللہ علیم نے بھی کہا ہے کہ جہاں جہاں

www.taemeernews.com

وہ (زاہدہ حنا) اپنے حسّی اور جنسی تجربے لکھتی ہے خوب لکھتی ہے۔
زاہدہ حنا کے دو افسانے۔ 'صرف ایک لفظ؛ ہیہات' اور 'آنکھوں کے دیدبان' مطبوعہ انکار، عورت کے اپنے وجودی احساس سے متعلق ہیں۔ اول الذکر افسانے میں وہ اس دھرتی کی ایک ازلی عورت ہے جس کو اب تک بے شمار نام دے کر اُسے اُس کی شناخت کے فریبِ مسلسل میں مبتلا رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ اپنی حقیقت سے اب باخبر ہو کر سمندر، ریت اور آشفتہ سر ہوا کے سامنے آکر بیٹھ گئی ہے۔
میں پتھر کی دیوار پر بیٹھی ہوں اور سمندر کے پار افق کی محراب کے ادھر نامعلوم کہکشاؤں میں کچھ دیکھنا چاہتی ہوں - انسان پر گذرا ہوا وقت پھیلا ہے۔ گذرے ہوئے وقت کا یہ سمندر ریت کنارے یادکی لہریں آشفتہ سر ہواؤں کی مانند جب اس سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں تو دور تک پھیلے ہوئے سمندر کے بدن میں وصال کی کپکپاہٹ دوڑ جاتی ہے۔ پھر وقت وحشی نوجوانوں کی طرح چیختا ہے۔ "آؤ کہ جہانِ بے خبراں میں بے خبرانہ رقص کریں ـــــ میں چپ چاپ سنتی رہتی ہوں۔ وقت کی دعوتِ رقص بھی اور اس کی بازگشت بھی۔ وحشیوں کی طرح شور مچاتا وقت یہ بھول گیا ہے کہ میں جہانِ بے خبراں میں رقص کرتے کرتے تھک گئی ہوں اور میرے دوسرے ناموں کو بے خبری اور خبر سری کا صلہ ہلاکت کی صورت میں ملا۔ میں بھی تھک گئی اور میرے نام بھی تھک گئے ـــــ

عبید اللہ علیم کا کہنا ہے۔ زاہدہ حنا بھی محض اندھیرے کا تیر ہے۔ نہ کوئی بڑا سوال نہ کسی جواب کی زحمت۔ ان کی کہانیاں محنت کا کام تو لگتی ہیں مگر کسی کام کی تکلیف محسوس نہیں کراتیں۔ یہ بے حسی کا عمل بہ ذاتِ خود ایک عمل ہے لہٰذا ان کی کہانیوں پر بھی بات کرنا ادب کا ایک منصب بنتا ہے۔ احمد ہمیش کہتا ہے۔ شیر شاہ سوری کا اور سہسرام

www.taemeernews.com

کی مناسبت سے زاہدہ حنا کو بے خوفی، تیزی اور طراری درثے میں ملی ہے۔ آنکھوں کے دیدبان میں زاہدہ خود گھنی ہے ـــــ " ذہن مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے (وہ اس کہانی میں بھی سمندر کے روبہ رو بیٹھی ہے) یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے، میں اور مجھ جیسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم میں اور حرکت میں ہیں۔ اور دوسری طرف خداوند خدا ہے جسے فرض کیا گیا، پھر اپنے آپ پر فضیلت دی گئی اور محرکِ اوّل قرار دے کر حرکت سے محروم کیا گیا اور اس طرح اُسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔ شاید میں اور مجھ ایسے دوسرے لوگ ایذا رسانی کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں" ـــــ

رات کو جون اور میں دیر تک حسن عابد کی شاعری کے بارے میں بھی گفتگو کرتے رہے تھے۔ وہ لکھنؤ کی گومتی اور دریائے سندھ کی لہروں پر تیرتا پھرتا ہے۔ بہ ظاہر ایک بے مایہ تنکے کی طرح۔ لیکن اس کے اندر کا حساس شاعر بہ قول محمد علی صدیقی یونانی میتھالوجی کے ایک خیال انگیز کردار بروٹس کی طرح اپنی راکھ سے دوبارہ متشکل ہوا ہے ـــــ

"حسن عابد کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یوں لگا کہ یہ شاعری روایتی بھی ہے اور جدید بھی۔ تخلی بھی ہے اور رکھ رکھاؤ دری بھی۔ ادعائی بھی ہے اور اشاراتی بھی۔ استعاروں کی جانب سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور واضح اساطیر کے سہارے علامتوں سے بھی ایجاز اور حسن بیان کا کام لیتی ہوئی ملتی ہے" ؎

میلاد ہو کہ مجلسِ غم، مبتلا ترے	آنگن میں دل کے فرش بچھائے ہوئے تو ہیں

ترے جمال نے روشن کیا چراغِ نظر	کہ جگمگانے لگے ہیں تمام ویرانے

---

www.taemeernews.com

دستِ دراز چاہیئے حاصل کے واسطے　　سب راہ کے شجر ہیں پھلوں سے لدے ہوئے

ہمارے آج کے پروگرام میں کراچی میں گھومنا، رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور ہاجرہ مسرور سے ملنا اور پھر شام کو ایک جلسے میں شرکت کرنا شامل تھا۔ زاہدہ حنا مجھے اور جون ایلیا کو کئی سڑکوں پر گھماتی ہوئی اپنے آفس میں لے گئی۔ دو سڑکیں جگر مرادآبادی اور حسرت موہانی کے نام سے موسوم نظر آئیں۔ ڈرگ روڈ کی طرف جاتی ہوئی کراچی کی لوکل ٹرین بھی دیکھی جو ڈیزل انجن سے چلتی ہے۔ دھوپ صبح سے ہی بہت تیز تھی، اور پسینہ بھی آرہا تھا۔ صبح لاہور سے آغا سہیل کے ساتھ بات ہوئی تھی، تو اس نے بتایا تھا کہ وہاں ہلکی بارش ہوئی ہے اور سردی بڑھ گئی ہے۔ قبلہ رئیس امروہوی اور سید محمد تقی دونوں بھائی گھر پر موجود تھے۔ دونوں کے ساتھ کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی ــــ رئیس صاحب کے قطعات ہندوستان کے کئی روزناموں میں نقل کئے جاتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے بعد وہی ایک ایسے بزرگ شاعر ہیں جو روزمرّہ کے سیاسی اور سماجی حالات پر فی البدیہہ قطعات کہہ سکتے ہیں اور انھیں ہر جگہ لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں ــ سید محمد تقی اردو ادب میں مارکس کے کیپٹال کا اردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں لیکن انھوں نے نہج البلاغہ کا تصورِ الوہیت اور تاریخ اور کائنات (میرا نظریہ) جیسی اہم کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف میں منطق، فلسفہ اور سائنس، روح اور فلسفہ اور ہندوستان پس منظر و پیش منظر ہیں۔ تاریخ اور کائنات کتاب میں انھوں نے نظریۂ تاریخ، مذہب تہذیبی اضافیت، تاریخ کی معاشی تعبیر، مارکسیت اور اخلاقی قدریں، تہذیب اور سماجی جبریت، منطق اور ریاضی وغیرہ پر نئے دو سو کے قریب مسائل پر اپنے نظریے سے بحث کی ہے ــــ

بارہ بجے کے قریب زاہدہ حنا جون ایلیا کو اور مجھے ہاجرہ مسرور

www.taemeernews.com

کے یہاں لے گئی، میں ہاجرہ مسرور کے افسانے آزادی سے کچھ عرصہ پہلے سے پڑھتا آرہا ہوں۔ اُن کا وطن لکھنؤ ہے۔ جھوائی ٹولے میں اُن کا مکان تھا۔ مجھے کسی نے غلط بتا دیا تھا کہ وہ کٹرہ ابوتراب کے ایک مکان میں رہتی تھیں۔ میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک کٹرہ ابوتراب میں رہتا تھا اور وہیں کے ایک مکان کو اُن کا مکان سمجھ کر دیکھ لیتا تھا۔ ہاجرہ مسرور نے خود ہی یہ غلط فہمی دور کر دی تو یہ احساس ہوا بعض اوقات انسان ایک طویل مدت تک یا زندگی بھر بھی کسی نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے اور زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا۔ ہاجرہ مسرور میرے ساتھ لکھنؤ کی گلیوں، سڑکوں اور محلوں کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ عبدالعزیز روڈ، نخاس، گنیش گنج، چار باغ کا پرانا علاقہ جہاں پہلے صرف بانس کی کھپچیوں کی بنی ہوئی پوری پراٹھے والوں کی دوکانیں ہوا کرتی تھیں اور امین آباد کی رونقیں اور قلفی ملائی اور پانی بتاشوں کی دوکانیں، ساون کے جھولے، آموں کی بہار، نیم کی نبولیاں، گلگلے، فالسے، ککڑیاں، خربوزے، بڑی بڑی کوٹھیوں کے دالانوں میں اور صاحبانِ ذوق کے گھروں میں منعقد ہونے والے مشاعرے، پھر تقسیم ملک اور وسیع پیمانے پر ہونے والے فسادات لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں اُن کا قیام اور لاہور میں مکتبۂ جدید اور نیا ادارہ کے دفاتر اور احمد ندیم قاسمی جیسے فرشتہ سیرت انسان سے ملاقات اور پھر ـــــ میں نے دیکھا کہ اُن کی آواز بھرا گئی ہے اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کے لئے بہانے سے اُٹھ کر کچن کی طرف چل دی ہیں اور وہاں سے لوٹی ہیں تو منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور پھر میرے پاس بیٹھ کر میانوالی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ وہاں کی گلیاں، اسکول، بچپن کے ہم جولی، اپنے گھر کے اندر جا کر مجھے کیسا لگا، اُس گھر سے وابستہ بچپن کا کوئی خاص واقعہ اور وہاں کے موسم اور پھل اور خاص خاص ترکاریاں ـــ زاہدہ حنا ہم

www.taemeernews.com

دونوں کی طرف ایسی حیرت سے تک رہی تھی جیسے کوئی جنوں پریوں کی داستان سُن رہی ہو۔ اجون ایلیا بڑی خاموشی سے ہماری طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا، جیسے جانتا ہو اس ملاقات میں یہی کچھ ہونا تھا۔ کھانے کی میز پر بھی وہی ذکر چلتا رہا۔ جیسے کبھی کبھی اپنے ہی زخم کُریدنے میں مزہ آنے لگتا ہے۔ موضوع بدلنے کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے ادب پر بھی گفتگو کی گئی۔ تو اس میں بھی ایسی کہانیوں کا ذکر نکل آیا جو ماضی کے احساسات سے تعلق رکھتی ہیں ——

وہاں سے ہم چار بجے کے قریب نکلے۔ ہاجرہ مسرور نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے اور تلاش کرتے ہوئے اپنے لان سے گلاب کا ایک پھول توڑ کر میری طرف بڑھا دیا اور کہا —— "سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کو اور کیا پیش کروں! اسی کو قبول کر لیجئے ——"

وہ پھول اور کچھ اور بھی پھول جو مجھے کراچی، میانوالی اور لاہور میں بڑی محبت سے دیئے گئے میرے پاس پلاسٹک کے اُسی لفافے میں محفوظ ہیں جس کے اندر ایک بیری کی ٹہنیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں ان پھولوں کو کہیں چھوڑ نہیں سکا ——

زاہدہ ہمیں کلفٹن اور دو ایک تجارتی مرکزوں پر لے گئی۔ راستے پر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی یادیں چوراہوں پر نصب کنکریٹ اور سفید اور کالے سنگ مرمر سے بنائے گئے ٹینک کے اونچے اونچے حروف دیکھے جو کہیں کہیں تو آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تلواروں کی طرح نظر آتے تھے کہیں کہیں نیزوں کی مانند۔ کلفٹن کا منظر بمبئی کے چوپاٹی یا جوہو جیسا ہی ہے۔ وہاں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر سمندر کے اندر کوئی غیر ملکی جہاز ایک مدت سے ریت کے اندر دھنسا ہوا کھڑا ہے۔ جس کا اب صرف ایک مصرف رہ گیا ہے کہ لوگ اُسے دور دور سے تاکا کریں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہندوستان اور پاکستان کے

www.taemeernews.com

مشترکہ ماضی کا ہی کوئی جہاز ہو جو سالہا سال تک دنیا کے مختلف سمندروں میں گھومتے رہنے کے بعد بمبئی اور کراچی کے درمیان بحرِ ہند کے ایک ریتیلے ٹیلے پر پہنچ کر دھنس گیا ہے۔ اب یہ کبھی غرقاب نہیں ہوگا۔ اسی طرح گڑا ہوا، بے بسی سے دونوں ملکوں کی طرف دیکھتا رہے گا۔ جب تک اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی ساری ریت کو وقت کی تیز و تند لہریں بہا کر نہیں لے جاتیں۔ اس وقت یہ نیم غرق جہاز لڑکھڑا کر ایک دو سنبھالے ضرور لے گا اور پھر اپنے سفر پر دوبارہ روانہ ہو جائے گا ــــــ

شام کو چھ بجے زاہدہ مجھے اور جون ایلیا کو رئیس امروہوی کے پاس چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔ رئیس صاحب کے پاس کنجاہ ضلع گجرات کے کوئی صاحب ذوق رئیس بیٹھے تھے جنھیں رئیس امروہوی کے سیکڑوں قطعات یاد تھے۔ رئیس صاحب خود کم اور اُن کے وہ مداح ان کا کلام زیادہ سُنا رہے تھے۔ اور اس طرح بار بار ہاتھ ملا کر داد لے لیتے تھے جیسے وہ اُن کا اپنا کلام ہو۔ رئیس صاحب اُن کی طرف کبھی گھبرائی ہوئی نظروں سے تاکتے کبھی تشکر کے جذبات کے ساتھ اور حقے کے دو چار کش لے لینے کے بعد حلم اُٹھا کر تازہ دہکتا ہوا انگارہ لے آنے کے لیے گھر کے اندر بھی چلے جاتے تھے۔ اس سارے عرصے میں میں نے سیّد محمد تقی کو بھی ایک اخبار ہاتھ میں اُٹھائے کرسیوں کے چاروں طرف بڑی بے چینی سے طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ وہاں اچانک ایک وکیل صاحب آ گئے آتے ہی اُنھوں نے دو "دھماکہ خیز" خبریں سُنا دیں۔ ایک خبر تو یہ تھی کہ اندرا گاندھی نے یہ قول اُن کی دہلوی بھابھی کے پارلیمنٹ کا الکشن پاکستان کو بالکل ختم کر دینے کا وعدہ کر کے لڑا تھا۔ دوسری خبر اُنھوں نے ایک اور وکیل کے حوالے سے یہ سُنائی کہ ہندوستان کے بمبار جنگی جہاز دن میں دو مرتبہ افغانستان کے باغیوں پر بم برسا کر ہندوستان

www.taemeernews.com

لوٹ جاتے ہیں ــــ

سید محمد تقی نے گھبرا کر میرا اُن سے تعارف کرا دیا۔ تو وہ بغلیں جھانکتے ہوئے بولے :۔

"میں تو دونوں ملکوں کے درمیان دائمی دوستی چاہتا ہوں۔ آپ ہندوستان سے کب آئے ؟ کب تک ٹھہریں گے" وغیرہ وغیرہ ــ میں نے اُن سے کہا ــ" ہندوستان میں پارلیمنٹ کا الکشن پہلی بار اس طرح لڑا گیا تھا کہ جس میں کسی قومی لیڈر نے بین الاقوامی مسائل کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس میں صرف دو ہی مسئلے عوام کے سامنے رکھے گئے تھے۔ یعنی گزشتہ جنتا گورنمنٹ کی ناکام کارکردگی اور ڈکٹیٹر اندرا کی واپسی اور آپ نے جس طرح اپنی دہلوی بھابھی اور ساتھی وکیل کے حوالے سے محض اعتماد پیدا کرنے کے لیے خبریں سُنائی ہیں، میں بھی اُسی طرح زیادہ بڑے لوگوں کے حوالے سے کئی غلط خبریں سُنا سکتا ہوں۔ در اصل دونوں ملکوں کے بیشتر لوگ اسی طرح باتیں کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، وہ گرد و پیش سے باخبر ہونے کے لئے اخبار نہیں خریدتے بلکہ اپنا ٹینشن بڑھانے کے لئے خریدتے ہیں۔ اور خبروں کو بڑھا چڑھا کر سُنا کر دوسروں کو بھی وہی ٹینشن بانٹتے ہیں۔ دوسری خبر کے بارے میں میں اتنا جانتا ہوں کہ آج صبح کے اخبارات میں ہندوستانی ہوائیہ کی مشقوں کے بارے میں جو تین سطری خبر چھپی ہے وہ مشقیں تو ہر سال کی جاتی ہیں اور یہ ہر ملک کیا کرتا ہے۔ ورنہ اس کا تعلق نہ افغانستان سے ہے نہ کسی قسم کی بمباری سے ــــ"

ہم لوگ اُن ہی وکیل صاحب کی گاڑی میں مہران رائٹرز کلچرل گلڈ اور پاک انڈیا لٹریری اکیڈمی کی مشترکہ استقبالیہ تقریب میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ جو ناظم آباد میں اظہر سجاد صاحب کے بنگلے پر منعقد کی گئی تھی۔ راستے میں وکیل صاحب نے مجھ سے کہا :۔

www.taemeernews.com

"اگر آپ پہلے ملے ہوتے تو میں آپ کو پورے کراچی کی سیر کراتا اور دکھاتا کہ ہمارے ملک نے کتنی ترقی کی ہے۔ ہمارا ملک سیکڑوں ڈائجسٹ چھاپ رہا ہے کیا آپ نے دیکھے۔؟"

میں نے جواب دیا ــــ "نہیں سب تو نہیں دیکھے۔ لیکن میں آپ کے قومی اخبارات اور ادبی رسائل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں اور اُن ہی سے عوام کی ذہنی رفعت کا اندازہ کر رہا ہوں ــــ"

اُنھوں نے کہا ــــ "اچھا آپ کیا کیا لکھتے ہیں۔ کیا آپ نے جنسی مسائل پر لکھا ہے؟ ہمارے یہاں جنسی مسائل پر بہت اچھے اچھے ڈائجسٹ نکلتے ہیں ــــ"

میں نے گھبرا کر جون ایلیا کی طرف دیکھا کہ شاید وہ میری کچھ مدد کر سکے۔ ورنہ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ دروازہ کھول کر چلتی گاڑی سے کود جاؤں ــــ

استقبالیہ تقریب میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ مشہور شاعر شان الحق حقی "قلعہ مضبوط تھا" کے مصنف انور عنایت اللہ، جدید شاعرہ نصیدہ ریاض، افسر آذر، سلطانہ مہر، قیوم راہی وغیرہ۔ محمد علی صدیقی، حسن عابد، راحت سعید بھی پہنچ چکے تھے۔ کھانے سے پہلے جس میں ایک سو کے قریب اہل قلم اور صاحبان ذوق حضرات شریک ہوئے رئیس امروہوی، سید محمد تقی، شبنم رومانی، انور عنایت اللہ، انور کیف اور اختر فیروز نے میرے بارے میں تعارفی تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں اس طویل سفر کا ذکر کیا جو میانوالی سے شروع ہو کر لاہور اور لکھنؤ تک پھیل گیا تھا۔ اور اپنی واپسی کے بارے میں کہا کہ یہ اب جذباتی ٹکڑوں کی نذر ہو چکی ہے۔ میری عقیدتوں میں دونوں ملکوں کی ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ ایسے مقبرے، مزار، باغات اور شہر تک شامل ہو گئے ہیں جن سے جُدا ہونا اس زندگی میں ممکن نہیں ہے،

www.taemeernews.com

میں جس جذباتی وابستگی سے میانوالی کے میاں زکریا کے مزار اور لاہور کے داتا کے دربار کا ذکر کیا کرتا ہوں اب اس میں ہمارا لکھنؤ کا آصف الدولہ کا امام باڑہ بھی شامل ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ لفظ 'ہمارا' بے اختیار جُڑ جاتا ہے۔ جس کا نفسیاتی تجزیہ کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا ہے، میں نے کہا شاید دنیا کی ساری مقدس اور تاریخی جگہیں کبھی نہ کبھی ہمارے شعور کا حصّہ ضرور بن جاتی ہیں، چوں کہ کچھ سوالات میری افسانہ نگاری، اُس کے تخلیقی منبعوں اور اُردو زبان کے بارے میں بھی اُٹھائے گئے تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں بھی تفصیل سے باتیں کہیں۔ اُسی وقت میزبان نے انڈین قونصل جنرل مسٹر مانی شنکر آئیر صاحب کا معذرتی پیغام بھی دیا کہ وہ عازم دہلی ہونے کی وجہ سے اس تقریب میں نہیں پہنچ سکتے۔

اسی اجتماع میں حیدرآباد دکن کے خواجہ حمید الدین شاہد سے بھی ملاقات ہو گئی جو اب کراچی سے 'سب رس' شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھے سب رس کا یادرفتگاں نمبر بھی عنایت کیا، جس میں ابراہیم جلیس، ابن انشا، محمد حسن عسکری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، سید آل رضا، سیدہ عروج مظہر اور ماہر القادری کے بارے میں بے شمار اہل قلم کے مضامین۔ انتخاب نظم و نثر اور متعدد تصاویر ہیں۔

یہ جلسہ شاہد الوری اور اختر فیروز نے کئی روز کی محنت سے منعقد کیا تھا۔ اور اس میں میری ملاقات پورے ہندوستان سے ہو گئی۔ لدھیانہ، سہارن پور، حیدرآباد، دہلی، امروہہ، لکھنؤ ہر جگہ کے لوگ بڑی محبت سے ملے۔ وہیں مجھے قیوم ملک کی ایک تالیف کی ہوئی کتاب۔ اُردو میں عربی الفاظ کا تلفظ بھی دی گئی جس میں تلفظ کے قوانین، اُردو اور عربی میں فرق، تلفظ میں اختلاف، معانی کی تحقیق وغیرہ کئی ابواب میں بڑی اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی صاحب نے بھی ایک گشتی مراسلہ ادیبوں اور شاعروں کو بھجوایا ہے کہ وہ عربی

www.taemeernews.com

الفاظ کے تلفظ کے اختلاف کا قضیہ طے کرنے کے لئے اپنی آرا کا اظہار کریں۔ جیسے اِبرار اور اَبرار، اِجلاس اور اَجلاس، اِخبار اور اَخبار، نقص اور نُقص، حُجم یا حَجم، قَلعہ یا قِلعہ، عُجلت یا عَجلت، شَرف یا شُرف، حَرکت یا حَرَکت، بَرکت یا بَرَکت، شُغل یا شَغل، مَحلّہ یا مُحلّہ، توَجّہ یا توجہ، اَہل یا اِہل (بروزن بہل) وغیرہ۔

اگلے روز یعنی ۵ مارچ کی صبح اچانک خالی ہو گئی تھی۔ اصل پروگرام کراچی یونی ورسٹی میں جا کر طلبہ سے ملنے کا تھا، لیکن اُس روز چوں کہ پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ ٹسٹ کا آخری اور اہم دن تھا اس لئے اس خدشے کے پیش نظر کہ سارے طلبا کرکٹ اسٹیڈیم میں چلے جائیں گے وہ پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔ صبح سہام مرزا آکر مجھے اپنے ساتھ اپنے انشورنس کے دفتر میں لے گئے۔ وہاں اُن کے آفس کی دو لڑکیاں فرحت اور ریحانہ میرے پاس آ بیٹھیں جو میرے افسانے پڑھتی رہتی تھیں۔ فرحت کا تعلق ہندوستان کے ہی کسی شہر سے تھا۔ اُس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "سرحدوں کے اوپر اوپر پرندے بڑی آزادی سے اُڑتے رہتے ہیں انھیں ویزا کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ قید انسانوں نے ہی خود اپنے اوپر لگا رکھی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے!—"

مجھے اٹاری ریلوے اسٹیشن کے ایک صفائی کرمچاری کا بتایا ہوا واقعہ یاد آیا کہ کچھ کتے لاہور سے امرتسر اور امرتسر سے لاہور تک بڑی باقاعدگی سے روزانہ ریلوے ٹرین کے اندر سیٹوں کے نیچے چھپ کر آتے جاتے ہیں ان پر کسی حکومت کی روک ٹوک نہیں ہے—

سہام مرزا نے ایر انڈیا کی کارکردگی کی شکایت کی اور اپنے گزشتہ سفر کے بارے میں ایک واقعہ سُنایا جو ایر انڈیا کے عملے کے ذریعے ان سے زبردستی رشوت وصول کر لینے سے متعلق تھا۔ چوں کہ مسز رخسانہ سہام مرزا فلو کی وجہ سے نہیں آسکی تھیں، اس لئے میں اُن کی عیادت

www.taemeernews.com

کے لئے اُن کے گھر گیا۔ وہ بستر میں لیٹے لیٹے اور چھینکیں مارتی ہوئی کرکٹ کا میچ ٹی وی پر دیکھنے میں مصروف تھیں اُن کے پیارے پیارے بچے بھی ایک کونے میں قالین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے وہ تماشا دیکھ رہے تھے، ایک بجے الف لیلیٰ ڈائجسٹ کے مدیر ہمایوں اقبال کے گھر پر لنچ تھا اور وہیں کرکٹ میچ کا دلچسپ ترین مرحلہ تھا۔ جس وقت میں مہام مرزا کے ڈرائیور سید اصغر شاہ کے ساتھ نارتھ ناظم آباد کی طرف بڑھ رہا تھا تو راستے میں ہی پاکستان نے وہ میچ سات وکٹ سے جیت لیا تھا۔ میں نے چلتی گاڑی میں ہاتھ بڑھا کر اصغر شاہ کو مبارک باد دی اور اس نے اپنے ملک کی شاندار جیت پر گہرے اطمینان کا اظہار محمد رفیع کا یہ کیسٹ لگا کر کیا ــــ

'بھگوان کا مندر ہے یہ انصاف کا گھر ہے'

اُس کا گھر سنبھل ضلع مراد آباد میں ہے ــــ

ہمایوں اقبال کے یہاں مجنوں گورکھپوری، سلیم احمد، شوکت صدیقی، حسن عابد، شمیم نوید، ذکی شیرازی، شور صہبائی، شکیل عادل زادہ، افسر آذر، اطہر نادر، فرید عنوی، جمیل اختر خاں اور کچھ اور اصحاب بھی مدعو تھے۔ لنچ کے بعد، اُردو افسانے کا ماضی اور حال کے موضوع پر میری ایک تقریر ٹیپ کی گئی جس پر مجنوں صاحب، سلیم احمد اور شوکت صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس محفل سے نکلتے نکلتے چھ بج گئے۔ مجھے پانچ بجے کراچی پریس کلب میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ جہاں میرے لئے ایک استقبالیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پاکستان میں منعقد کی جانے والی تقریبات میں یہ اہم ترین تقریب تھی۔ کلب کے باہر میں نے محمد علی صدیقی، جون ایلیا، صہبا لکھنوی، اور شہزاد منظر کو بڑی بے چینی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ کلب میں کراچی کے بیشتر صحافی اور ادب دوست حضرات و خواتین بڑی بھاری تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ مہمان برنا، حبیب غوری

www.taemeernews.com

ظفر رضوی، نعیم آروی، فہمیدہ ریاض، رعنا فاروقی، فریدہ علوی۔
عتیق احمد، حسن عابد، عبدالرؤف عروج، سرو ربارہ بنکوی، علی اقبال قریشی، غازی صلاح الدین، انور سین رائے، اختر پیامی، انجم اعظمی، سرشار صدیقی۔ ماہ طلعت، مقصود زاہدی، ظفر اُجن (فہمیدہ ریاض کا شوہر) داد حوصل گڈوانی، بابر اعجاز، شریف منور کے علاوہ انڈین قونصل جنرل کے آفس کے ملہوترا اور ترپاٹھی سے بھی وہیں ملاقات ہوئی۔ منہاج برنا کی صدارت میں فہمیدہ ریاض نے میرا تعارف سامعین سے کرایا۔ اور میری افسانہ نگاری کے محرکات کے بارے میں بھی کچھ باتیں کہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے ہندوستان کی ادبی فضا، میری پاکستان یاترا کے بارے میں تاثرات، اُردو زبان اور ہمارے یہاں کی سیاسی صورت حال کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی ۔

اگرچہ میں بہت تھکا ہوا تھا لیکن قریباً پون گھنٹے کی تقریر میں میں نے سوائے سیاست کے باقی سارے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی۔ سیاست کے بارے میں کچھ نہ کہنے کے لئے میں نے یہ کہہ معذرت کرلی کہ یہ میرے میدان سے پرے کی چیز ہے۔ اپنی پاکستان کی یاترا کامیاب ہونے کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ یہاں مجھے ہر جگہ بے حد محبت اور خلوص ملا تھا۔ یہ خلوص ہمارے ملک کے لئے بھی تھا۔ میں نے کہا "میں نے یہاں خلوص کا ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا دیکھا ہے جسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینا میرے لئے ناممکن ہے۔ ہمارے اور آپ کے ادیبوں نے ایک طویل مدت سے اُردو زبان و ادب کے ذریعے محبت کا جو پل تعمیر کئے رکھا ہے اُسے اسی طرح ہمیشہ قائم اور مضبوط بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے تبادلے کی بھی اشد ضرورت ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کے جذبات اور ذہنی رجحانات سے باخبر رہا کریں۔" میں نے ملک کی تقسیم کے بارے میں کہا "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے ہم تسلیم کر چکے ہیں۔ اس کے

www.taemeernews.com

بارے میں بار بار شبہے یا شکایت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس سے آپ ہی کے اعتماد کی کمی کا احساس ہوگا۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ادب پر اسی تقسیم کے گہرے اثرات پڑے ہیں، اور وہ اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اپنے ماضی سے یکسر الگ نہیں ہو سکتا۔ جس کی کئی مشترکہ خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ یہ ماضی خوابوں میں بھی ہمارا پیچھا کرتا رہے گا۔ اور ہماری تخلیقی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا رہے گا۔ اگر ہم شعوری طور پر اس کے ذکر کا ایک بھی لفظ کاٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنے بدن کا کوئی حصہ الگ کر رہے ہیں۔ لیکن ماضی کی محبت ہمیں کسی بھی نقطۂ نظر سے رجعت پسند نہیں ثابت کرتی۔ اسے جدید تخلیقی جذبوں کے ساتھ پیش کرنا بھی ہم جانتے ہیں۔ اُردو ادب کی آفاقیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "سرحدوں، خزانوں اور فوجوں کی تقسیم کے باوجود صرف اسی کی تقسیم نہیں ہو سکی ہے۔ کیوں کہ یہ بڑے انسانی احساسات کا عکاس ہے اور انسانی احساسات دنیا بھر میں ایک سے ہوتے ہیں۔ اُن میں انسانی ہمدردی کا جو عنصر ہوتا ہے وہ صدیوں تک ذہنوں اور دلوں میں محفوظ رہتا ہے دراصل یہی وہ محبت کا پُل ہے جو ایک دل سے شروع ہوتا ہے اور سیدھا دوسرے دل میں جا کر اُتر جاتا ہے ــــ"

ہندوستان میں چھپنے والے عام اُردو رسائل اور اخبارات کا میں نے تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی انفرادی اشاعت بھی آزادی کے بعد بہت بڑھی ہے جس سے اُردو قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ادبی رسائل کی دونوں ملکوں میں ایک سی حالت ہے۔ سنجیدہ تحریروں کے قارئین ہر کہیں تعداد میں کم ہیں۔ غیر مسلم اُردو ادیبوں کی اُردو کی حمایت کے سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں مَیں نے ہندوستان میں ۱۹۷۳ء میں منعقدہ کل ہند کانفرنس

www.taemeernews.com

کے بارے میں بھی بڑی تفصیل سے بتایا کہ اس سے فرقہ پرستوں کا قلعہ کچھ کمزور ہوا ہے جو اُردو کو صرف ایک طبقے کی زبان یعنی مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے اس کے جمہوری حقوق سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ بھی تقسیم کا ایک ردِعمل ہے۔ لیکن ستر کروڑ کی آبادی والے ملک میں جمہوری طریقے سے لڑائی لڑنے اور جیتنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ اور ہم مایوس نہیں ہیں، تقسیم کے اس ردِعمل سے بھی ہم اپنے اندر ایک لمبی لڑائی لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس قسم کی لسانی جنگیں یورپ کے کچھ ممالک میں بھی ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رکھی گئی ہیں جن کی کئی سطحیں ہیں اور دانش ور اور جذباتی طبقے ہمیشہ ایک دوسرے سے پرسرپیکار رہتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہی لڑائی قدیم و جدید رجحانات اور زبان کے استعمال کی سمت میں نکل جاتی ہے ——

آخر میں میں نے حکومت پاکستان کا اس بات کے لئے شکریہ ادا کیا کہ اُس نے اپنے ملک میں آنے کے لئے ہندوستانی ادیبوں کے لیے ایک کوٹہ مقرر کر دیا ہے جس کے تحت میں بھی ویزا حاصل کر سکا۔ اسی قسم کی مثال ہندوستانی حکومت کو بھی قائم کرنی چاہیئے، جلسہ ختم ہو جانے کے بعد مجھے بے شمار لوگ ملے۔ ہندوستانی قونصل جنرل کے دو نمائندوں نے بھی مجھے مبارک باد دی۔ ایک بوڑھا شخص مجھے الگ لے جا کر چاندنی چوک دہلی کی ایک گلی کا پتہ بتانے لگا جس میں اُس کے اعزہ رہتے ہیں تاکہ میں اُن کی خیریت معلوم کر کے اُسے اطلاع دے سکوں۔ لیکن وہ اُن کا نام بتانا بھول گیا۔ ایک نوعمر لڑکا جس کے ایک پاؤں پر پلاسٹر لگا تھا سیدھا اسپتال سے اُٹھ کر مجھ سے ملنے کے لئے آگیا تھا۔ اُس نے میرے سینے سے لپٹ کر کہا — "میری ماں کی قبر پر جا کر میرا سلام کہیئے گا۔ لیکن بھیڑ کے ریلے نے اُسے مجھ سے فوراً الگ کر دیا اور پھر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا اُس کی بھولی بھالی مگر مغموم شکل آج بھی میری نظروں کے سامنے موجود

www.taemeernews.com

ہے ——

رات کو راحت سعید کے یہاں کھانے پر جون ایلیا، حسن عابد اور اُس کے بچے، محمد علی صدیقی اور اس کی بیگم، انجم اعظمی، سرور بارہ بنکوی ظفر اقبال شریف منور اور فریدہ وسعیدہ دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔ اسی رات کو ہمیں شوکت صدیقی کا انتظار تھا، لیکن وہ غلط فہمی کی بنا پر کسی اور جگہ ہمارا انتظار کرتا رہا۔ لیکن شفیع عقیل اور اقبال جعفری کی صحبت نے اس شب کی مخصوص محفل کو ایک اور طرح سے یادگار بنا دیا۔ ہمارے ساتھ جو تھا آدمی محمد علی صدیقی تھا۔ ہم رات دو بجے تک فراق، بیدی، منیر نیازی، فیض، قاسمی، اور قتیل کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک بار دیویندر ستیارتھی کا بھی ذکر آیا جو کئی سال پہلے وہاں جا کر حسب معمول جم گیا تھا۔ اور اپنی کہانیاں اور ناول سُنا سُنا کر دوستوں کے معمولاتِ درہم برہم کر دیتا تھا۔ شفیع عقیل پنجابی کا مشہور شاعر، مترجم، نقاد اور محقق ہے اور کئی ملکوں میں گھوم چکا ہے، اور جنگ اخبار سے وابستہ ہے۔ اُس نے متعدد کتابیں، پنجابی لوک کہانیاں۔ پنجاب رنگ، پنجابی کے پانچ قدیم شاعر، چینی لوک کہانیاں، ڈھل گئی رات، مجید لاہوری، تیغ ستم، ایک آنسو ایک تبسم، ہماری منزل غازی یا شہید، مجید لاہوری کی حرف و حکایت، سوچاں دی زنجیر اُردو میں تصنیف کی ہیں۔ پنجابی لوک داستانوں والی کتاب پر ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، سنتوکھ سنگھ دھیر وغیرہ نے بہت اچھی رائیں دی ہیں، اور یہ کتاب جمیل الدین عالی کے نام سے معنون کی گئی ہے۔

اس کتاب میں بیس عوامی کہانیاں ہیں جنھیں شفیع عقیل نے دونوں طرف کے پنجابی علاقوں سے جمع کیا اور پنجابی سے اُردو میں منتقل کیا ہے یہ کتاب یونیسکو کے زیر اہتمام سات زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے اور اب اس کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کتاب کا

www.taemeernews.com

سب سے زیادہ قابل ذکر حصہ اس کا چھبیس صفحات پر مشتمل مبسوط دیباچہ ہے جو ایک تحقیقی مقالے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں جابہ جا ڈاکٹر گیان چند جین کی اُردو کی نثری داستانیں، مسز رچرڈ ٹمپل کی حکایات پنجاب، پروفیسر دنجارا بیدی کی پنجابی دیاں لوک کہانیاں، سنتوکھ سنگھ دھیر کی پنجابی لوک کہانیاں، انسائیکلو پیڈیا برٹینکا اور چیمبرز ٹوینٹیتھ سینچری ڈکشنری کے حوالے دے کر داستانوں کے سیاحوں بحری سوداگروں، اور مسافروں کے ذریعے کئے گئے نہ صرف آواگون کو ثابت کیا گیا ہے بلکہ ہر ملک کے ہر دور کے ادب پر پڑنے والے فکری اور ثقافتی اثرات پر بھی ایک دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ رات کو بارہ بجے پر یعنی تین مارچ شروع ہوتے ہی مجھے میرے جنم دن پر مبارک باد دی گئی۔

سوچاں دی زنجیر شفیع عقیل کا پنجابی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دے دیا گیا ہے۔ ایک نظم 'آخر کار' اس طرح ہے ؎

میں کب تک تنہا بیٹھا تیری یادیں آہیں بھرتا رہتا
آخر میں نے اپنا مقدر خود بنا لیا
دیکھ تیرے پیار کی ساری زنجیریں
آج میں نے توڑ کر پھینک دی ہیں۔

رات کو بارہ بجے پر یعنی تین مارچ شروع ہوتے ہی مجھے میرے جنم دن پر مبارک باد دی گئی۔

صبح کے کئی اخبارات چائے کے ساتھ ملے۔ اور محمد علی صدیقی ایک ایک اخبار میں کل کی کراچی پریس کلب کی استقبالیہ تقریب کی چھپی ہوئی خبریں دکھاتا رہا۔ ڈان۔ مارننگ نیوز، پاکستان ٹائمز۔ جنگ۔ حریت۔ نوائے وقت، اعلان وغیرہ نے میری تقریر اور تصاویر کو بڑے سلیقے سے شائع کیا تھا۔ لیکن میں ایک ضبط آمیز خاموشی کے ساتھ

www.taemeernews.com

ایک ایک سطر دیکھتا رہا۔ کہیں ایک بھی غلط لفظ نہیں چھپا تھا۔ میں اندر ہی اندر خوش بھی ہوتا رہا کہ ایک دوسرے ملک میں آکر میں نے جو کچھ کہا تھا پوری ذمہ داری سے کہا تھا۔ اور اخبارات نے اسی ذمہ داری سے من وعن شایع کیا تھا۔ اگرچہ میرا یہ سفر سراسر نجی تھا لیکن پاکستان کے قومی پریس نے مجھے میرے ملک کا ایک اہم نمایندہ بنا کر اپنے عوام کے سامنے پیش کیا تھا ــــ

تین مارچ کی رات کو مجھے کراچی سے ہوائی جہاز سے لاہور واپس ہونا تھا۔ دن بھر بے پناہ مصروفیت میں گزرا۔ صبح دس بجے صہبا لکھنوی، محمد علی صدیقی اور حسن عابد کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹرز گیا۔ اپنی روانگی کی رپورٹ درج کرانے کے لئے۔ وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس حامد علی خاں صاحب نے یہ کام آناً فاناً کر دیا اور میرا جنم دن بھی اسی تھانے میں منایا۔ پھول چائے اور ناشتہ منگایا۔ میں ان کی محبت کا قیدی بنا ہوا دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ واپسی پر افکار کے دفتر میں بہت سے دوستوں کے علاوہ (جن سے میں پہلے بھی مل چکا تھا) جدید افسانہ نگار اعجاز راہی، اور ہمدرد وقف کے مسعود احمد برکاتی سے بھی ملاقات ہو گئی، جو اردو کے مشہور ادیب اور بچوں کے بلند پایہ رسالہ "ہمدرد نونہال" کے مدیر ہیں۔ انھوں نے کئی رسالے عنایت کئے ــــ

اعجاز راہی کا ایک بہت ہی خوب صورت مجموعہ تیسری ہجرت ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے ہم عمر افسانہ نگاروں کا ایک انتخاب گواہی بھی شایع کیا ہے۔ لکھنؤ کے ایک سابق شہری ساحل قریشی صاحب بھی اپنا شعری مجموعہ 'داغ داغ اجالا' عنایت کر گئے۔ ان کا یہ شعر ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے ــ

www.taemeernews.com

یہ بھی ہے دستورِ گلستاں
جیسا قیدی ویسا زنداں

صہبا لکھنوی نے افکار کا ضخیم جوبلی نمبر میرے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا جو ۱۹۷۰ء کے دورِ آشوب میں شایع ہوا تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس نمبر میں ہندو پاک کے قریب قریب سارے ہی اہم قلم کار شریک ہیں۔ اس قدر ضخیم نمبر دیکھ کر میں نے بڑی حیرت سے صہبا لکھنوی کی طرف دیکھا اور سوچا کہ اگر درجن بھر صہبا لکھنویوں کو بھی ایک بنڈل میں باندھ دیا جائے تب بھی یہ جوبلی نمبر ضخامت کا وقار نہیں کھو سکتا۔

افکار ہی غالباً پاکستان کا واحد ادبی رسالہ ہے جو بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ شایع ہوتا ہے اور نقوش، اوراق وغیرہ کی روایات کے مطابق اپنے ضخیم نمبر بھی شایع کرتا رہتا ہے۔

ساڑھے بارہ بجے لطف اللہ خاں صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میرے ساتھ انجم اعظمی بھی تھے۔ لطف اللہ صاحب کے پاس اُردو کے قریب قریب سارے ہی ادیبوں، مذہبی عالموں اور تاریخ دانوں کے علاوہ موسیقاروں کی آوازیں اور رنگین ٹرانس پیرنسیز کا لاکھوں روپے کا قیمتی و نادر خزانہ محفوظ ہے۔ اُنھوں نے میری کہانی 'ایک ہزار بچوں والی ماں' ریکارڈ کی اور فوٹو گرافی کے جدید آلات کی مدد سے تصاویر بھی اُتاریں۔ اس کام میں اُن کی بیٹی اُن کی مدد کرتی رہی۔ اُنھوں نے بھی ہمیں لنچ دے کر میرا جنم دن منایا۔ یہ اس سلسلے کی تیسری تقریب تھی۔ شام کو چار بجے محمد علی صدیقی اور حسن عابد آ گئے جو مجھے اور انجم اعظمی کو اپنے گھر لے گئے۔ اُن کے گھر پر کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ راحت سعید، صمصام مرزا، زاہدہ حنا، جون ایلیا، سردربارہ بنکوی سعیدہ اور فریدہ دونوں علوی بہنیں۔ محمد علی صدیقی کے چھوٹے بھائی آصف

www.taemeernews.com

اچانک بیمار پڑ گئے تھے۔ میرے آرام کی خاطر کئی روز سے اُنھوں نے اپنی نیند حرام کر رکھی تھی۔ حسن عابد انھیں اپنی گاڑی میں ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے لے گئے۔ آصف نے جاتے جاتے یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کر دیا کہ وہ میری خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے۔ میرا سامان مع کتابوں کے جو کراچی کے دوستوں نے تحفتاً دی تھیں، دو سوٹ کیسوں میں پیک کرنے کی ذمہ داری زاہدہ خانم نے نبھائی، تب تک میں مکان کے نچلے حصّے میں محمد علی صدیقی کی امروہہ والی ممانی سے جا کر مل لیا۔ بیگم محمد علی کے چہرے پر بے پناہ تھکن کے آثار تھے ــــ میرے قیام کے دوران اُنھوں نے نہ صرف میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی، بلکہ مجھ سے ملنے آنے والوں کو بھی ویسی ہی عزّت و تکریم سے نوازا تھا۔ اُن کے سارے ہی چھوٹے چھوٹے بچے آج کھیلنے کے لئے کہیں نہیں گئے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ ہر کمرے میں آ جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ کرکٹ کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اچانک فون پر بھی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ تو الوداعی تھیں کچھ دوسری۔ اُردو کی نئی افسانہ نگار رخسانہ صولت جو راولپنڈی میں رہتی ہیں اور جنگ اخبار سے وابستہ ہیں۔ اسی روز کراچی پہنچی تھیں۔ اُنھوں نے کراچی کے اخبارات میں میری روانگی کی خبر میں پڑھ کر مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ حیدرآباد دکن کی کوثر رفعت جو میرے افسانوں کی قاری ہے اور مجھے بڑی باقاعدگی سے خطوط لکھا کرتی ہے۔ ان دنوں کراچی میں مقیم تھی۔ وہیں اس کی شادی ہوئی تھی اور اس سے میری ملاقات اچانک غالب لائبریری کے جلسے میں ہو گئی تھی۔ اب وہ ڈوبی جا رہی تھی۔ اس نے بھی میرے سفر سے واپسی کے بارے میں کلماتِ خیر کہے۔ لاہور سے آغا سہیل نے فون کیا۔ وہ اسی رات کو لاہور میں میری واپسی کے منتظر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ پشاور سے مجھ سے ملنے کے لئے تاج سعید، ان کی افسانہ نگار بیوی زیتون بانو اور

www.taemeernews.com

مشہور اُردو شاعر فارغ بخاری آئے تھے۔ لیکن مایوس ہوکر لوٹ گئے۔
تاج سعید میرے لئے اپنا شعری مجموعہ 'سوچ سمندر' اور زیتون بانو اپنے پشتو افسانوں کا اُردو ترجمہ شیشم کا پتا چھوڑ گئے تھے۔ 'سوچ سمندر' کا مطالعہ میں ۱۹۷۸ء میں ناروے کی ایک لائبریری میں کرچکا تھا۔ اور وہیں اخبار جہاں میں اس پر تبصرہ بھی پڑھا تھا۔ تاج سعید بنیادی طور پر دوہوں اور گیتوں کا شاعر ہے۔ لیکن اس نے غزلیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں، اور ادبی مجلہ قند کی برسوں تک ادارت کی ہے ؎

جس کا سایہ من بھایا تھا　　پیڑ وہی اب کٹا پڑا ہے
تاریکی ہے گھیرا ڈالے　　سورج رستہ بھول گیا ہے

سوچ میں تھا وہ گم صم ایسا　　جیسے اس کو گیان ہوا تھا

کتنا ہمت شکن ہے جہاں کا چلن　　آدمی آدمی سے پریشان ہے

محمد علی صدیقی نے تاج کے بارے میں لکھا ہے وہ محبت کی وارفتگیوں کا شاعر ہے وہ ایک مدّت سے اپنا منفرد نغمہ الاپ رہا ہے۔

کراچی ایرپورٹ پر وہ سارے ہی دوست جمع تھے جو اتنے روز تک میرے ساتھ ساتھ ہنستے پھرتے تھے اور اب وہ اُداس تھے۔ محمد علی صدیقی، حسن عابد، راحت سعید، سہام مرزا، فریدہ اور سعیدہ اور سرور بارہ بنکوی۔ سرور نے اپنا مجموعہ سنگ آفتاب ایرپورٹ پر ہی جوش ملیح آبادی کے اس شعر کے ساتھ عنایت کیا ؎

آج تک وہ لکھنؤ کی رنگ ریاں دل میں ہیں
پہلے جو زیر قدم تھیں اب وہ گلیاں دل میں ہیں

مجھے یہ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ سرور کے ساتھ یہ میری آخری ملاقات ہوگی۔ لکھنؤ واپس آکر ہی ایک روز یہ خبر "قومی آواز" میں پڑھی کہ اُن کا

www.taemeernews.com

ڈھاکہ میں جاکر انتقال ہوگیا۔ ایک خوش فکر اور خوش شکل دوست سے یوں بچھڑ جانے کی یاد میرے اس سفر کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوگئی ہے ؎

ہے اُفق سے ایک سنگِ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات
پا بہ جولاں اپنے شانوں پر لئے اپنی صلیب
میں صفیرِ حق ہوں لیکن نرغۂ باطل میں ہوں،

بہ وقتِ رخصت دوستوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک دیکھی تو جی چاہا سفر ملتوی کردوں۔ یہ چھ روزہ قیام واقعی بہت مختصر تھا پھر بھی کراچی نے مجھے محبت کا جو ایک نیا شعور عطا کر دیا تھا اسے میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ میں خود کو بے حد بدلا بدلا سا محسوس کر رہا تھا۔ یہ فضا وہی تھی جس کا میں ہمیشہ گرویدہ و متلاشی رہا ہوں۔ اس میں مذہب، ملت، کلچر یا سیاست کی دیواریں نہیں تھیں۔ صرف انسان دوستی اور ادب دوستی کی مضبوط چٹانیں تھیں۔ جو ہم سب کے پاؤں کے نیچے موجود تھیں اور ہمارے اوپر کھلے ذہن کی طرح ایک نیل گوں اور من بھاونا آکاش تھا۔ ایسے ماحول کی محبت میں گرفتار ہوجانا مجھے اچھا ہی لگا۔ جس کی تعمیر و تشکیل میں محمد علی صدیقی کا بڑا حصہ ہے ان ہی لمحوں میں اسلام آباد کے مہتاب ظفر بھی بہت یاد آئے، جنھوں نے مجھے کراچی کا دورہ دلانے میں ایک نمایاں کوشش کی تھی۔

بلین پر ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں مجھے کراچی کی یادوں اور وہاں کے ابو ننگ پیپر زسے بار بار نکال لینے والی ایک خاتون ہم سفر مسز قریشی کی دلچسپ باتیں اور اس کی حیرت ناک

www.taemeernews.com

حد تک دل کش شخصیت تھی۔ اُسے اتفاق سے پرواز کے آخری لمحوں میں میرے ساتھ پڑی ہوئی خالی سیٹ مل گئی تھی۔ وہ لندن کی تعلیم یافتہ تھی اور لاہور میں ایک تاجر کے ساتھ شادی کر کے رہ رہی تھی۔ میرون کلر کی شلوار، قمیص اور دوپٹہ، ترشے ہوئے سنہرے بال جو بار بار اس کے چہرے پر پھسل پھسل پڑتے، جنھیں وہ ایک حسین بے نیازی سے سر جھٹک کر پیچھے گرا دیتی تھی۔ شاید میری ملاقات پاکستان کی سب سے خوب صورت لڑکی سے اب ہو رہی تھی جو نئے پاکستان کی ہیر جیسی کشش اپنے اندر یقیناً رکھتی تھی۔ وہ ہندستان کے آرٹ، کلچر، مذہب اور سیاست کا مطالعہ کتابوں کے ذریعے کر چکی تھی، لیکن اب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی بھی آرزو مند تھی۔ ایسا کر کے وہ اپنے بہت سے تعصبات تو دور کر ہی لے گی، لیکن خود ہندستان کے لوگ بھی ایسی ہی لڑکیوں کے یونی ورسٹی اور علمی سمیناروں کی خبروں کے ساتھ چھپے ہوئے فوٹو دیکھ کر پاکستان کی خواتین کے بارے میں اپنے پرانے تصورات کو کہ وہ بے حد دقیانوسی ہوتی ہیں بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لاہور ایرپورٹ پر آغا سہیل، اُن کا بیٹا محسن اور اُس کے دوست خرم وغیرہ کے علاوہ میانوالی کے اقبال نیازی اور فاروق نیازی بھی موجود تھے۔ دونوں لاہور میں رہتے تھے فاروق نیازی آغا سہیل کے شاگرد رہ چکے تھے۔ انھوں نے اخبارات میں میانوالی کے حوالے سے میرے بارے میں کالم پڑھ کر آغا سہیل کی وساطت سے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ کراچی سے لاہور لوٹنا مجھے اپنے گھر میں لوٹنے کی طرح لگا۔

www.taemeernews.com

بیگم سہیل اور اُن کے چھوٹے بڑے سارے بچے میرے منتظر تھے۔ آغا سہیل اور میں کافی رات گئے تک باتیں کرتے رہ گئے۔ کراچی کے ایک ایک دوست کا ذکر اور وہاں کی ہر ایک تقریب کا تفصیلی بیان ہم دونوں کو ہی اچھا لگ رہا تھا۔

اگلے روز یعنی چار مارچ کو بہت مصروف رہا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے فارن آفس میں خرّم کے ساتھ جاکر اپنی آمد اور اگلے روز کی روانگی درج کرائی۔ وہاں سے نکلا تو گیٹ پر ہی ایک سفید ریش بزرگ مل گئے جنھوں نے مجھ سے انڈین ہونے اور انڈیا لوٹنے کی تصدیق کرکے اپنا ایک خط سہارن پور کے لئے دیا اور بہ منّت کہا کہ اسے میں امرت سر پہنچتے ہی پوسٹ کردوں۔ اس کے عوض انھوں نے مجھے کئی درجن ترنی، خوش حالی اور اچھی صحت کے لئے دعائیں دیں۔ جب تک ہماری موٹر سائیکل روانہ نہ ہوگئی وہ دعائیں دیتا ہی رہا۔ کتابیں پیک کرنے کے لئے انارکلی سے سوٹ کیس خریدے۔ دوپہر میں کیانہ میں اقبال نیازی اور فاروق نیازی کے ساتھ لنچ کیا۔ ساتھ ساتھ اُن کی زبان سے سابق جنرل نیازی کی بے گناہی، انڈین آرمی کی برتری، جنگوں کی مخالفت اور ہندو پاک دوستی پہ باتیں بھی سنتا رہا۔ اقبال نیازی تقسیم ہند کے وقت دہرہ دون میں تھے۔ وہاں سے جان بچاتے ہوئے وہ اپنی کار سے جموں اور پونچھ کے راستے سے سیالکوٹ پہنچے تھے۔ اُن کی یہ داستان بھی بے حد جرأت آمیز واقعات سے لبریز تھی۔ کیوں کہ وہ خود کو انگریز ظاہر کرکے ہی کئی جان لیوا

www.taemeernews.com

لمحات سے نکل سکے تھے۔ اُن کا رنگ خوب گورا تھا اور مُنہ بگاڑ کر انگریزی بھی بول سکتے تھے ــــ

شام کو چار بجے اقبال نیازی، فاروق نیازی اور میں نے ریڈیو اسٹیشن سے ہی آغا سہیل کو پک کیا جہاں ان کی دوپہر سے ایک ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ وہاں سے ہم سب میلہ ہاشمی کے گھر گئے۔ وہ گاؤں سے لوٹ کر آچکی تھیں۔ وہاں اُن کے شوہر کے انتقال پر تعزیت پیش کی۔ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے دو ناولٹ آتشِ رفتہ اور چہرہ چہرہ روبرو عنایت کئے۔ جمیلہ کا نام ہندوستان کے ادبی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ ان کے ناولوں میں مشرقی پنجاب کے ماحول کی جملہ تفصیلات بلونت سنگھ اور دوسرے ملھاریوں کی طرح سچی اور دل میں اُتر جانے والی ہوتی ہیں۔ وہ چوں کہ اپنے شوہر کے ساتھ برسوں بھاول پور میں رہی ہیں اس لئے سرائیکی بھی بڑی روانی سے بول لیتی ہیں۔ میرے ساتھ وہ سرائیکی میں ہی گفتگو کرتی رہیں۔ ہم سب کچھ دیر کے لئے سائرہ ہاشمی کے یہاں بھی گئے۔ وہاں اُن کے بڑے بھائی ایس اے ہاشمی سے ملاقات ہو گئی جو کراچی میں محکمہ ریلوے کی چیکنگ برانچ میں ہیں۔ اُنھوں نے مجھے لکھنؤ میں نخاس میں رہنے والے احمد سعید عبقاتی صاحب کے لئے کتابوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل دیا۔ اُن دونوں کی ملاقات کئی مہینے پہلے اتفاقاً کراچی اور لاہور کے درمیان ایر کنڈیشنڈ گاڑی میں ہو گئی تھی ــــ

رات کو محسن سہیل کے دوستوں نے ایک چائنا ریستوراں میں ڈنر دیا۔ اس میں آغا سہیل بھی ساتھ تھے۔ لیکن

www.taemeernews.com

اب مجھے زندگی سے بھرپور شہر ہر لمحہ بچھڑنے کا احساس دینے لگا تھا۔ وہیں مجھے ایڈمنسٹریٹو کالج کے ڈپٹی ڈائریکٹر اختر نیازی کا فون ملا۔ جنھوں نے کھانے کے بعد اپنے یہاں کافی پر مدعو کر لیا تھا۔ اُن کا تعلق بھی میانوالی سے تھا۔ اُن کے پاس میں اور آغا سہیل آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہاں اقبال نیازی، فاروق نیازی اور اُن کے والد بھی موجود تھے جو بہت ہی خوش باش اور دل چسپ شخصیت کے مالک تھے۔ رات کو ہماری عدم موجودگی میں ڈاکٹر وزیر آغا کے سرگودھا سے اور محمد علی صدیقی کے کراچی سے دو دو فون آئے تھے۔

۵ر مارچ کی صبح۔ صحیح معنوں میں ایک الوداعی صبح تھی۔ صبح دس بجے کے قریب انور سجاد آئے اور یہ احساس بڑھا گئے کہ میں اب دوسری بار ترکِ وطن کر کے ہندوستان جا رہا ہوں۔ تقریباً ایک ماہ کے قیامِ پاکستان نے میرے دل میں وہیں کی سکونت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس کی حقیقی وجہ وہاں کے لوگوں کا بے پناہ خلوص تھا۔ وہ دل جیتنے کا آرٹ بہ خوبی جانتے ہیں۔ میں یہ سوچنے پر بار بار مجبور ہو رہا تھا کہ اب ہمیں بھی دل ہارنے کا فن سیکھنا ہوگا۔ ایک بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچا تو میرے ساتھ دوستوں کا ویسا ہی ہجوم تھا، بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی جو وہاں ایک ماہ پہلے میری آمد پر جمع ہو گیا تھا۔ آغا سہیل، محسن سہیل اور اس کے سارے دوست، ابصار عبدالعلی، ستار سید، عبدالمالک، خرم، اقبال نیازی اور فاروق نیازی جو میرے لئے خاص طور پر پٹھان خان کے گائے ہوئے بابا فرید کے

www.taemeernews.com

دوہوں کے کیسٹ لے کر آئے تھے۔ اور سائرہ وجمیلہ ہاشمی کے بھائی سعید احمد ہاشمی اور سعادت احمد ہاشمی جو مجھے امرت سر تک بڑے آرام سے پہنچا دینے کی ذمہ داری نبھاتے پھرتے تھے۔ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور بشیر میرے سامان کے علاوہ پاسپورٹ اور ویزے کے کاغذات کا بھی پاسبان بنا ہوا تھا۔ ہندوستان جانے والوں کی بھیڑ کا کوئی انت نہیں تھا۔ کسٹم کی بے شمار میزوں پر اُن کی بھیڑ لگی تھی جو لوگ اُن کی چیکنگ سے چھٹی پا چکے تھے وہ گاڑی کے ہر ڈبے میں بھرتے جا رہے تھے۔ میرے کچھ دوست جنگلے کے اُس پار کھڑے رہ گئے تھے اور کچھ جنگلے کے اندر بھی چلے آئے تھے۔ سرحد کی پابندیاں وہیں سے شروع ہو گئی تھیں۔ ابصار عبدالعلی جلدی جلدی کچھ لوگوں کے نام سلام بھجوا رہا تھا۔ والی آسی، عندلیب، عثمان غنی، سبط رضی اور انجمن ادب اطفال کے اراکین کے نام۔ محسن اور خرم بار بار کہہ رہے تھے۔ "انکل پھر جلدی آنا، ہم بھی آئیں گے ــــ" آغا سہیل صرف مسکرا رہا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جب قلیوں نے میرے کتابوں سے بھرے ہوئے بکس اور بنڈل گاڑی کے اندر لے جاکر رکھے تو میں نے آغا سہیل سے کہا:۔

"یار، محمود غزنوی کو تو سومنات کا خزانہ لوٹنے کے لئے سترہ حملے کرنے پڑے تھے۔ لیکن میں ایک ہی بار محبت اور خلوص کا اتنا بڑا خزانہ لے کر جا رہا ہوں جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

آغا سہیل نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کہا:۔

"تمھیں ابھی سولہ حملے اور کرنے ہوں گے اور ہم ہر بار خوش آمدید ہی کہیں گے ــــ"

ڈائری میں کچھ پتے اور نام نوٹ کرتے وقت اچانک میری

www.taemeernews.com

نگاہ زاہدہ حنا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس تحریر پر پڑ گئی ــــ

"تو لیجئے رام لعل جی، آپ آئے اور جا بھی رہے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کے ساتھ ساری رونقیں جا رہی ہیں۔ بہت محبت کے ساتھ ہم آپ کو رخصت کر رہے ہیں۔ اس دُعا کے ساتھ کہ اگلے برس آپ سے پھر ملاقات ہو ــــ"

میں نے آغا سہیل سے گلے ملتے ہوئے کہا:-

محمد علی صدیقی اور وزیر آغا کو فون پر میری طرف سے معذرت کر دینا کہ اُن کے ساتھ بات نہ ہو سکی۔ اور لاہور کے سارے دوستوں کو سلام کہہ دینا جن سے پھر ملاقات نہ کر سکا۔ انھیں کہنا کہ میں بہت خوش خوش لوٹ رہا ہوں۔ مجھے میرا سابق وطن پہلے سے زیادہ خوب صورت لگا۔ سارے ہی لوگ بے حد خوب صورت لگے۔ خدا کرے یہ سارا کچھ ہمیشہ اسی طرح خوب صورت بنا رہے۔ اور آباد رہے۔ اسے کسی کی نظر نہ لگے، اور ــــ"

اور پھر گاڑی حرکت میں آ گئی۔ میں نے بے خیالی میں اپنا پاسپورٹ ایک جیب میں سے نکال کر دوسری جیب میں رکھتے ہوئے اس آسمان کی طرف دیکھا جو اب پیچھے چھوٹ رہا تھا۔ اور اس میں بے شمار پرندے بڑی آزادی سے اُڑتے پھرتے تھے۔ میری نگاہ اپنے ڈبے کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص، اُس کی برقع پوش بیوی اور اُن کے نوعمر بچے پر پڑی۔ اُس نے مجھے بتایا وہ آزادی کے بعد پہلی بار پٹیالہ ضلع کے ایک گاؤں کا لہے ماجرا کو لوٹ رہا تھا جہاں سے وہ تقسیم ملک کے فسادات میں بچپن میں آیا تھا۔ اپنی بیوی اور بچے کو وہ اپنا گھر اور ماحول دکھانے کے لئے ساتھ لے جا رہا تھا، جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور اُس کے آباؤ اجداد رہتے تھے اور

www.taemeernews.com

جہاں اُس کی جڑیں پیوست تھیں ــــــ

مختلف لائنوں پر کانٹے بدلتے ہوئے پہیوں کے شور نے مجھے جیسے ایک خواب سے جگا دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ ایک کیبن جس پر لاہور لکھا ہوا تھا بہت تیزی سے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے بہت سی مال گاڑیاں آگئیں۔ پھر وہ بھی پیچھے رہ گئیں اور پھر میں نے مغل پورہ ورک شاپ کے شیڈوں کو بھی پیچھے چھوٹتے ہوئے دیکھا، اور میں نے محسوس کیا میرا بھی بہت کچھ پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اُسی لمحے سخت تیز و تُند ہوا کے جھونکے نے میرے بدن کو بالکل ٹھٹھرا دیا۔ یہ ٹھنڈے جھونکے اُس روز امرت سر اور اُس کے آگے بھی ہر جگہ موجود تھے۔ الوداع پاکستان! ؎

بستی نہ ملی پھر اپنی جیسی
جانے کو نگر نگر گئے ہم

(سرور بارہ بنکوی)